اسلام میں شیعہ



مفسرِ قرآن (تفسیر المیزان) آیت اللہ
علامہ سید محمد حسین طباطبائی رحمتہ اللہ علیہ

اسلام میں شیعہ

تالیف

آیت اللہ مفسر تفسیر المیزان حضرت علامہ محمد حسین طباطبائی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ

ڈاکٹر شاہد چودھری

ناشر

موسسہ مطالعات و تحقیات فرہنگی

اسلامی جمہوریہ ایران

نام کتاب : اسلام میں شیعہ

تالیف : علامہ محمد حسین طباطبائی

مترجم : ڈاکٹر شاہد چودھری

طبع اول : ۱۹۸۴ء

مطبع : چاپ پرچم، تہران

نگران طباعت : علی اصغر کریمی

طبع دوم : مارچ 2012ء

ہدیہ : 200 روپے

ناشر

موسسہ مطالعات و تحقیقات فرہنگی

وزارت فرہنگ و آموزش عالی، خیابان سید جمال الدین اسد آبادی

تہران، جمہوری اسلامی ایران

ترتیب

تیسرا حصہ

★★★

مقدمہ

بقلم ڈاکٹر سید حسین نصر

یہ کتاب جو قارئین کرام کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے، اس منصوبے کی ایک کڑی ہے، جو مغرب میں شیعہ مذہب کا تعارف کرانے کے لیے بنایا گیا ہے۔ اگرچہ بعض مغربی (یورپی) دانش وروں نے گزشتہ چند صدیوں کے دوران اسلام کے مختلف پہلوؤں اور اسلامی تمدن کے بارے میں تحقیقات کی ہیں لیکن یہ تحقیقات تعصب اور خودغرضی سے خالی نہیں ہیں کیونکہ ان میں اسلام کو منحرف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ یورپی محققین کے تمام منابع اور مآخذ وحوالہ جات یا دستاویزات جو اسلام کے بارے میں تحقیقات کے لیے استعمال میں لائے گئے ہیں، وہ سب کے سب اہلِ سنت والجماعت کے ہیں۔ اور جب بھی قرآن مجید، حدیث، سیرت النبیؐ، فقہ اور کلام کے بارے میں کوئی بات ہوتی ہے تو عام طور پر اس کا مقصد اہلِ سنت والجماعت کا نظریہ ہی مدنظر ہوتا ہے۔ اگرچہ اس نظریئے میں کمی بیشی آچکی ہو یا خود غرضی اور تعصب کی بنا پر بیان کیا گیا ہو۔

یورپی زبانوں کی موجودہ کتابوں میں مذہب شیعہ کو ایک فرعی اسلامی فرقہ کہہ کر تعارف کرایا گیا ہے اور اس مذہب کے تمام نظریات اور اسباب پیدائش کو صرف اور صرف سیاسی اور سماجی بیان کیا گیا ہے اور اُن دینی اسباب وعلل کی طرف بہت کم توجہ

دی گئی ہے، جو مذہب شیعہ کی پیدائش کا باعث ہوئے ہیں اور حتیٰ کہ مذہب شیعہ کے متعلق تحقیقات میں کلی طور پر زیادہ حصہ اسماعیلیہ کے بارے میں ہے اور اثنا عشری (بارہ امامی) شیعہ مذہب پر حتیٰ کہ اسماعیلیہ کے برابر بھی توجہ نہیں دی گئی ہے۔

شاید اس امر کا اصلی سبب وہ محدودیت ہو، جو مغرب (یورپ) کے تاریخی ریکارڈ میں موجود ہے۔ مغرب نے اب تک دو بار اسلام سے براہِ راست رابطہ پیدا کیا ہے۔ ایک بار اندلس اور صقلیہ (سسلی) میں عربوں کے ساتھ اور دوسری بار مشرقی یورپ میں ترکوں کے ساتھ، اسلام اور اہلِ اسلام کے ساتھ دونوں بار رابطہ اہلِ سنت طریقے پر ہوا تھا اور شیعہ مذہب کے ساتھ بہت ہی محدود بلکہ تقریباً پوشیدہ رہا ہے، وہ بھی بعض اسماعیلیہ مکاتب کے ساتھ یعنی صلیبی جنگوں کے دوران میں اور شاید بعض دوسرے مکاتب کے ساتھ اندلس میں۔

یورپ نے کبھی بھی موجودہ زمانے کے علاوہ دنیائے تشیع اور خصوصاً ایران (جس کا مذہب تشیع ہے) کے ساتھ مستقیم اور براہِ راست تعلق و رابطہ نہیں رکھا اور اسی طرح اسلامی ایران کے تہذیب و تمدن اور ثقافت کے ساتھ بھی پہلی مرتبہ ہندوستان میں آشنائی پیدا کی تھی۔

بہرحال ان وجوہات کی بنا پر اور شاید یورپی لوگوں کی کوشش سے جو انھوں نے اسلام کے ان عقلی پہلوؤں کی تحقیر کے بارے میں روا رکھی ہیں، جن کا عقلی پہلو بہت ہی مضبوط ہے۔ مذہب شیعہ جیسا کہ حقیقی طور پر تاریخ اسلام میں موجود تھا اور آج بھی ہے۔ ایرانی، عرب، پاکستانی اور ہندی کروڑوں مسلمانوں کا مذہب ہے۔ اس مذہب کے پیروکاروں کے علاوہ اور کہیں بھی پہچانا نہیں گیا ہے اور یورپ میں مشرق شناسوں کے نظریات کو قبول کرلیا گیا ہے، جن میں کہا گیا تھا کہ مذہب شیعہ دین اسلام میں ایک بدعت ہے اور یہی بات یورپی ممالک میں عام ہے اور حتیٰ کہ بعض لوگ مذہب

شیعہ کو اسلام کے دشمنوں کی ایجاد سمجھتے ہیں، جو اسلام کے سیکڑوں سال بعد رُونما ہوا ہے۔ اگر ان چند کتابوں پر ایک نظر ڈالیں جو مشہور ہونے کے علاوہ یا تو مذہب شیعہ سے مربوط و منسلک ہیں اور یا ان میں تشیع کے بارے میں اشارہ کیا گیا ہے، تو ہمارے دعوے کے ثبوت کے لیے کافی ہیں۔

ان نظریات و عقائد کے پیش نظر اور جدید طریقہ فکر جو آہستہ آہستہ یورپی دنیا اور خصوصاً اینگلو سیکسن ممالک کے متعلق تحقیقات کے لیے حکم فرما ہے، مذہب شیعہ کے بارے میں تحقیقات کی ضرورت کا احساس روز بروز زیادہ ہوجاتا ہے۔

جنگ عظیم کے بعد بتدریج امریکہ میں اور پھر انگلستان میں یہ نظریہ وجود میں آیا کہ ایک دین کا بہترین تعارف کرانے والا وہ شخص ہے، جو اس دین کے اندر سے اس پر غور کرے، یعنی س دین کا پیروکار ہوتے ہوئے اس پر غور وخوض اور تحقیق کرے اور صرف عینی یا ظاہری طور پر دین کی تعریف وتوصیف اسی شخص کا خاصا ہے کہ یا تو بالکل دین پر ایمان ہی نہیں رکھتا اور یا اس خاص دین کو جس کا مطالعہ کر رہا ہے، شروع ہی سے بے بنیاد اور مطرود سمجھتا ہے، لہٰذا یہ کسی وجہ سے بھی کافی نہیں ہے۔

اس حقیقت کی دریافت یورپ کے دانش وروں، مفکروں اور خاص کر جوانوں کی روز افزوں ضروریات تھیں کیونکہ عیسائیت کے ضعف کے باعث امریکا اور یورپ میں مادیت کے عجیب غلبے کی وجہ سے ایک خلا پیدا ہو چکا تھا اور اس خلا کو مشرقی ادیان (مذاہب) سے استفادہ کر کے پُر کرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امریکا میں بتدریج مذاہب اور ادیان کے بارے میں تحقیقات کے لیے مراکز کھولے گئے اور حتی المقدور انھی ادیان کے مآخذ اور دانش وروں اور محققوں سے مطالب سمجھنے کے لیے استفادہ کیا گیا۔ البتہ ظاہر ہے کہ کلی طور پر اسلام اور خاص طور پر مذہب شیعہ اس تحقیق سے مستثنیٰ نہیں ہوسکتے تھے۔

اس تحریک کے بانیوں اور چلانے والوں میں سے ایک پروفیسر کنتھ مورگن (Kenneth Morgan) امریکی دانش ور اور کالگیٹ (Colgate) یونیورسٹی کے استاد ہیں، جنھوں نے اپنی عمر کا ایک حصہ مشرق (ایشیا) میں گزارا تھا اور تمام مذاہب کے اکثر بڑے بڑے علمائے دین، اساتذہ اور معنوی و روحانی بزرگوں کے ساتھ براہِ راست رابطہ رکھے ہوئے تھے۔

پروفیسر کنتھ مورگن نے جن کی شہرت زیادہ تر کتاب "اسلام صراطِ مستقیم" کے ذریعے ہوئی ہے، جو مسلمانوں کے ایک گروہ نے لکھی تھی اور استاد محمود شہابی نے اس کتاب کا "باب تشیع" لکھا تھا، چند سال پہلے کالگیٹ یونیورسٹی میں ایک مرکز یا شعبہ کھولا تھا تاکہ اس میں دنیا کے تمام مذاہب و ادیان کے حقیقی نمائندے جمع ہوں اور اب پروفیسر کنتھ مورگن خود اس شعبے کے چیئرمین ہیں اور ذہین طلبہ کے ایک گروہ کی رہنمائی بھی کر رہے ہیں۔

پروفیسر مورگن نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ مشرقی مذاہب کے منابع اور مآخذ کو شائع کر کے ان مذاہب کے حقیقی پیروکاروں کے عقائد و نظریات کے مطابق یورپی اور مغربی لوگوں کو ان کا تعارف کرائیں۔

آٹھ سال پہلے جب راقم نے پہلی بار اس مرکز کو دیکھا تو اس وقت مذہب شیعہ کے بارے میں کتابوں کی کمی کی بات چلی تھی۔ سوربن یونی ورسٹی کے پروفیسر ہنری کوربن نے شیعہ فکر کے تعارف کرانے میں بہت ہی اہم اور شایانِ شان خدمات انجام دی ہیں، لیکن سب سے پہلے تو ان کی کتابیں فرانسیسی زبان میں ہیں اور اس کے ساتھ بہت اُونچے معیار کی ہیں اور پھر ان کا سروکار عرفان وحکمت سے ہے اور دین کے عام پہلوؤں کو سامنے نہیں لاتے۔ دو یا تین کتابیں جو انگریزی زبان میں موجود ہیں، ان میں سے اکثر عیسائی مبلغوں کے ذہن کی اختراع ہیں جنھوں نے اپنی ساری

عمر شیعہ مذہب کو رد اور ختم کرنے میں گزاری ہے۔

اتفاق سے ایک دو سال بعد ۱۹۶۴ء کے موسم گرما میں پروفیسر مورگن ایران تشریف لائے۔ ان دنوں میں استادِ ارجمند حضرت علامہ محمد حسین طباطبائی کے شاگردوں میں سے تھا اور ہفتہ میں چند بار ''درکہ'' میں حاضر ہوتا تھا، جو ان کا موسم گرما کا ٹھکانا تھا اور ان کے بیکراں علم و فضل سے اپنی محدود استعداد اور صلاحیت کے مطابق خوشہ چینی کیا کرتا تھا۔ ایک دن جناب مورگن کے ہمراہ حضرت علامہ طباطبائی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پروفیسر مورگن پہلی ہی نظر میں علامہ طباطبائی کی معنویت و روحانیت کے شیفتہ ہو گئے اور امریکی پروفیسر نے احساس کیا کہ وہ ایک ایسے استاد کے رُوبرو ہیں، جن کا علم و فضل 'فکر' کے مرحلے سے آگے نکل کر 'عمل' کے مرحلے تک پہنچ چکا ہے اور جو کچھ وہ زبان سے فرماتے ہیں، اس کو محسوس کرتے ہیں اور اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔ درکہ کی تنگ اور خاکی گلیاں پُرلطف اور دلکش تھیں۔ وہاں سے واپسی پر میں نے فوراً یورپی لوگوں کے لیے حضرت علامہ طباطبائی کی زیرِ نگرانی اور تعاون سے کتابیں لکھنے کا منصوبہ تیار کیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس پر عمل درآمد شروع ہوا اور استاد بزرگوار نے تین سال کے عرصہ میں بہت ہی اہم دو کتابیں تحریر کیں جن میں سے ایک کتاب یہی ''شیعہ اور اسلام'' اور دوسری ''قرآن در اسلام'' تھیں۔[1] اس طرح انھوں نے اپنے علم و دانش کے ذریعے اسلام اور علم کی بہت زیادہ خدمت کی ہے۔

اس کتاب کا ترجمہ میں نے آج سے دو سال پہلے انگریزی زبان میں کیا تھا، جو ایک مدت تک امریکہ کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی رہی ہے۔ اس تجربے کے بعد اور ایسی کتاب کو سمجھنے میں طلبہ کا ردِ عمل دیکھنے کے بعد جو براہ راست ایک مشہور

---

① مترجم نے ''قرآن در اسلام'' کا ترجمہ ''قرآن میں اسلام'' کے نام سے موسسہ مطالعات و تحقیقات وفرہنگی سے ۱۹۸۳ء میں شائع کیا۔

اسلامی عالمِ دین کے قلم سے لکھی گئی تھی۔ یہ کتاب اپنی موجودہ شکل میں شائع ہو کر سامنے آ رہی ہے۔

دوسری کتاب قرآن مجید کے بارے میں ہے، جو ترجمہ کی جا رہی ہے اور اسی سلسلے کی تیسری کتاب جو مذہب شیعہ کا تعارف کرانے کے لیے ہے، وہ شیعہ آئمہ کے منتخب اقوال و گفتار کا ترجمہ ہے، جو ابھی تک یورپ میں خفیہ خزانے یا مخفی کتاب کی شکل میں موجود ہے۔

بنابرایں کتاب "اسلام میں شیعہ" ایک ایسی کتاب ہے، جو جدید تحقیق اور ایک نئے نظریئے یا مقصد کے تحت لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ مذہب شیعہ اور اس کے گوناگوں پہلوؤں کا تعارف ایسے لوگوں سے کرایا جائے، جو شیعہ مذہب کے فکری، اسلامی اور شیعی نظریات سے واقفیت نہیں رکھتے۔

فاضل اور محترم مصنف نے بغیر اس کے کہ اہلِ سنت والجماعت کی توہین ہو، لیکن مذہب شیعہ کی حقیقت کے دفاع میں اور اس مذہب کی پیدائش کے بارے میں تحقیق کی ہے اور کوشش کی ہے کہ یہ بات واضح کی جائے کہ مذہب شیعہ بالکل اسلام کے اصلی پہلوؤں میں سے ہے۔ مگر انھوں نے اس کے ساتھ ساتھ شیعہ اور اہلِ سنت میں کسی قسم کا تفرقہ یا شگاف پیدا کرنے سے بھی بالکل گریز کیا ہے بلکہ اس کے بالکل برعکس شیعہ مذہب کا دفاع کر کے انھوں نے اسلام کے ان دو اصلی اور اہم فرقوں میں بحث و گفتگو کو آسان بنا دیا ہے کیونکہ تقرب صرف طرفین کی اصالت کی حفاظت کرنے سے ہی امکان پذیر ہو سکتا ہے۔

ہمارے زمانے کے عجائبات میں سے ایک یہ ہے کہ اس کتاب کی ضرورت اور اہمیت شاید فارسی زبان میں بھی انگریزی زبان سے کم نہیں ہے۔ نہ صرف بیسیوں یا سیکڑوں بلکہ ہزارہا ایرانی نوجوان آج اپنے دین کے بارے میں وقوف اور آشنائی

نہیں رکھتے بلکہ بالکل جاہل اور نادان ہیں، اس کے باوجود وہ اپنے دین اور مذہب سے آشنائی کی ضرورت کا احساس بھی کرتے ہیں مگر ان کا علم اور ان کی دانش عام علمی اور دینی کتابوں سے استفادہ کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔

گزشتہ برسوں کے دوران معاشرے کے ایک طبقے میں دینی تعلیمات کے مسئلے نے ایک بہت ہی عجیب صورتِ حال پیدا کرلی ہے کہ شاید کسی اور معاشرے میں یہ صورتِ حال بہت ہی کم نظر آتی ہے۔ حالانکہ مذہبی اقلیتیں اور ایران میں مقیم غیرملکی افراد اپنے گھروں اور مدرسوں میں یہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنی ثقافت اور اپنا دین اپنے بچوں کو سکھائیں۔ مسلمانوں کے درمیان جو ایرانی معاشرے میں مکمل اکثریت سے ہیں، بعض طبقات میں دینی تعلیم بالکل فراموش کی جاچکی ہے۔ والدین نے اس ذمہ داری کو اپنے کندھوں سے اُتار دیا ہے اور ان کو یہ توقع ہے کہ مدارس معجزانہ طور پر اس اہم کام سے عہدہ برآ ہوسکیں گے اور دوسری طرف مدرسے، استادوں اور معلموں کی کمی کی وجہ سے ان مضامین کو پڑھانے سے قاصر ہیں لہٰذا فطری طور پر یہ معجزہ پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

اس طرح بتدریج ایک ایسی جماعت پیدا ہوگئی ہے، جس کو ہر قسم کا مادی سامان میسر ہے اور سوائے معنی و مقصد کے اس دنیا میں جو کچھ بھی چاہیں، ان کے لیے فراہم ہوجاتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ کیسے حرکت کریں لیکن یہ نہیں جانتے کہ کہاں جائیں اور چونکہ انسان ایک ایسی مخلوق ہے، جو ہمیشہ مقصد کے پیچھے ہے اور مقصد کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی اور اپنی تمام زندگی کو سراسر بیہودہ و بے معنی سرگرمیوں اور مشغولیات یا مادی وشہوانی کاموں میں نہیں گزار سکتی، اس لیے ایک ایسی جماعت بھی ہے، جو اس بے مقصدیت سے سخت تنگ ہے۔ ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں، جو چاہتے ہیں کہ دینی، معنوی اور روحانی تعلیم حاصل کریں لیکن رہنما، استاد اور معلم کا ملنا اور حتیٰ کہ

ایسی کتابیں حاصل کرنا، جو ان کی اپنی زبان میں لکھی ہوئی ہوں اور ایسے ہی دینی حقائق، غور و فکر اور شیعہ تاریخ کو ان کے لیے واضح کریں، بہت ہی مشکل ہے۔ ان حالات میں ایسی کتاب چھاپنا اور شائع کرنا، جو سب سے پہلے مغربی محققین اور دانش وروں کے لیے لکھی گئی ہو لیکن ایرانیوں کے لیے بھی اسی طرح قابلِ اہمیت ہو، بہت اہم کام ہے اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ تصنیف اپنی قسم میں بے مثال ہے۔

علامہ طباطبائی نے بہت ہی سادہ زبان میں مذہب شیعہ کے تمام پہلوؤں پر گہری نظر ڈالتے ہوئے تاریخ سے لے کر حکمت و عرفان تک وضاحت کی ہے اور ان محدود اور گنتی کے چند صفحوں میں انھوں نے بہت ہی اہم اسلامی معارف کے حقائق کو بیان فرمایا ہے۔

اس کتاب کے شائع ہونے سے فارسی زبان کے ساتھ دلچسپی رکھنے والا ہر انسان پہلی بار اس کے مطالعے سے شیعہ طرزِ فکر کی شہ سرخیاں پڑھ کر تقریباً بعد کی تحقیقات کے لیے راستہ کھولنے کے لیے چابیاں حاصل کرسکتا ہے۔ حقیقت میں یہ نفیس کتاب ایک ایسی رہنمائی کا کام دیتی ہے کہ اس کی مدد سے وہ انسان جو اب تک دنیائے تشیع سے نامانوس اور ناآشنا ہے، اس وسیع دنیا میں قدم رکھ سکتا ہے اور ایسے شخص کو یقین و اطمینان رکھنا چاہیے کہ وہ اس رہنما (کتاب) کے ہوتے ہوئے ہرگز گم راہ نہیں ہوگا بلکہ اس حبلِ متین کے ذریعے اِن شاء اللہ تعالیٰ حقیقی اور آخری مقصد تک پہنچ جائے گا۔

علامہ طباطبائی ایک بہت بڑے علمی گھرانے میں پیدا ہوئے اور چودہ پشتوں سے ان کا گھرانا تبریز میں مشہور علما کا مرکز رہا ہے۔ ان کی ولادت ۱۹۰۳ء کو تبریز میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے اپنے آبائی گاؤں میں ہی حاصل کی۔

ابتدائی تعلیمی مراحل طے کرنے کے بعد آپ ۱۹۳۲ء میں نجف اشرف تشریف لے گئے اور دس سال تک اس اہم شیعہ مرکز میں تعلیم کی تکمیل میں مصروف رہے اور

مختلف اسلامی علوم سیکھتے رہے۔ فقہ اور اصول مشہور زمان اساتذہ آیت اللہ نائینی مرحوم اور آیت اللہ کمپانی مرحوم سے پڑھے اور فلسفہ کی تعلیم سید حسین بادکوبی سے حاصل کی جو خود آیت اللہ جلوہ اور آقا علی مدرس کے شاگردوں میں سے تھے۔ ریاضیات کی تعلیم آقا سید ابوالقاسم خوانساری سے حاصل کی اور اخلاق حاج میرزا علی قاضی سے سیکھا اور پڑھا جو حکمت عملی اور عرفان میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ اس کے بعد ۱۹۳۵ء میں اپنے آبائی وطن واپس آگئے۔ علامہ طباطبائی کی تعلیم صرف فقہ کی عام سطح کی تعلیم نہ تھی بلکہ آپ نے قدیم ریاضیات اقلیدس کے اصول سے لے کر مجسطی، بطلیوس اور فلسفہ، کلام، عرفان اور تفسیر میں گہرا مطالعہ کیا اور ان تمام علوم میں اجتہاد کے مرحلے تک پہنچ گئے۔

علامہ طباطبائی کی شہرت تبریز سے نکل کر تہران اور ایران کے دوسرے دینی مدارس میں اس وقت پہنچی، جب آپ دوسری جنگ عظیم کے واقعات اور بعد میں رونما ہونے والے حادثات و اتفاقات سے مجبور ہو کر اپنے آبائی وطن کو خیر باد کہہ کر قم چلے آئے اور ۱۹۴۶ء میں وہیں سکونت اختیار کر لی اور بغیر کسی شور و غوغا اور صدا و آواز کے تفسیر اور حکمت میں محفل علمی کا آغاز کیا۔ آپ اکثر تہران آتے رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ تہران میں حکمت و فلسفہ اور اسلامی معارف کے شائقین اور دلچسپی رکھنے والوں سے رابطہ قائم ہو گیا تھا اور حتیٰ کہ آپ دین و حکمت کے مخالفوں سے بحث و مناظرہ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے، لہٰذا آپ نے ان افراد و اشخاص کو عقل و منطق کے ذریعہ فلسفی اور دینی حقائق کا گرویدہ بنا لیا تھا، جو صراط مستقیم سے منحرف ہو چکے تھے۔ آپ نے آخری پچیس برسوں کے دوران نہ صرف دینی اور روحانی طبقے میں بلکہ تجدد مآب یورپی طرز فکر اور تعلیم یافتہ افراد پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ ہر موسم خزاں میں کئی برسوں تک پروفیسر ہنری کوربن اور علامہ طباطبائی کے درمیان دانش وروں اور علما و فضلا

کی مجالس میں دین، فلسفہ اور ان مشکلات و مسائل کے بارے میں جن سے آج دنیا دوچار ہے، بحث و گفتگو جاری رہتی تھی اور ایسے ہی وہ مسائل جو آج ایک سالکِ معنوی اور حقیقت کے متلاشی کو درپیش ہیں۔ ان مجالس میں ان پر بحث و مباحثہ ہوا کرتا تھا۔ ان بحثوں اور جلسوں کے نہایت ہی اہم نتائج برآمد ہوتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ معیاری جلسے اور وہ بھی ان وسیع نظریات کے ساتھ آج اسلامی دنیا میں بے نظیر اور بے مثال تھے اور حتیٰ کہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرونِ وسطیٰ کے زمانے سے لے کر جب اسلام اور عیسائیت کے درمیان فکری اور معنوی رابطہ ختم ہو چکا تھا اس کے بعد اسلامی دنیائے شرق اور مغرب کے درمیان ایسا رابطہ کبھی قائم نہیں ہوا تھا۔

حوزۂ علمیہ (قم کے دینی مدرسے) میں علامہ طباطبائی کی اہم خدمات میں سے علومِ عقلی کو دوبارہ زندہ کرنا اور علمِ تفسیر قرآنِ مجید سے آہستہ آہستہ آپ نے بنیادی سطحوں پر حکمت و فلسفہ کی تدریس بھی شروع کی، جن میں کتاب شفاء اور اسفار مشہور ہیں۔ ان کی اعلیٰ شخصیت، بہترین اخلاق، صفاتِ حمیدہ اور خاص شاگردوں کے ساتھ حُسنِ سلوک نے روز بروز زیادہ سے زیادہ دینی طلبہ کو اپنے جلسۂ درس کا گرویدہ اور شیفتہ بنا لیا تھا اور طالبِ علم جوق در جوق ان کی محفلِ درس میں کھنچے چلے آتے تھے۔ یہاں تک کہ آخری برسوں میں آپ کے درسِ حکمت میں سیکڑوں طلبہ موجود رہتے تھے اور تقریباً بیس سال کے عرصے میں بہت زیادہ دانشور اس عالمِ اسلامی، علامہ طباطبائی کی رہنمائی میں اجتہاد کے درجے تک پہنچ گئے ہیں کہ جن میں سے بعض خود بھی حکمت و فلسفہ کے اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔

شاید حکمت و فلسفہ کے میدان میں خدمت سے بھی زیادہ اہم طلبہ کی بڑی جماعت کی تربیت کا کام تھا، جو آپ نے کتابوں کے ذریعہ انجام دیا۔ علامہ طباطبائی کی توجہ زیادہ تر اپنے شاگردوں کی اخلاقی تربیت اور تزکیۂ نفس پر تھی۔ درحقیقت انھوں

نے اکیلے ہی ان اشخاص کے لیے تربیت کا ایک جدید مرکز اور مکتب کھول دیا تھا جنھوں نے علم اور اخلاق کو یکجا وسعت بخشی اور اس طرح انھوں نے لائق اور باصلاحیت افراد معاشرے کو دیے ہیں۔ آپ نے ہمیشہ آموزش و پرورش (تعلیم اور اخلاق) کی یکجائی کی تاکید کی، جو ہمیشہ سے اسلامی ثقافت کے اوّلین اصولوں میں سے ہے۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ آج جدید تعلیمی نظام میں اور حتیٰ کہ قدیم دینی و علمی مدارس میں بھی یہ اصول تقریباً فراموش ہو چکا ہے۔

علامہ طباطبائی کے علمی کارنامے (کتب) مندرجہ ذیل ہیں:

① تفسیر المیزان

② اصولِ فلسفہ ریالزم: جو شہید آیت اللہ مرتضیٰ مطہری کے اہتمام اور اضافات کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔ پانچ جلدوں میں سے تین جلدیں چھپ چکی ہیں اور بقیہ خطی نسخے کے طور پر باقی ہیں۔ اس کی ایک عربی جلد بھی چھپ چکی ہے۔

③ صدرالدین شیرازی کی کتاب "اسفار" پر حاشیہ، "اسفار" کی جدید اشاعت کو جو علامہ طباطبائی کی زیر نگرانی ہو رہی ہے، لکھا جا چکا ہے اور اس کتاب کی چھے جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

④ پروفیسر ہنری کوربن کے ساتھ مصاحبے اور بحثیں: دو جلدوں میں۔ ان میں سے ایک جلد "مکتب تشیع" کے سالنامے ۱۳۳۹ ہجری شمسی بمطابق ۱۹۶۰ عیسوی کو شائع ہو چکی تھی اور دوسری جلد بھی عنقریب شائع ہو رہی ہے۔

⑤ رسالہ در حکومت اسلامی (اسلامی حکومت کے بارے میں ایک رسالہ) جو فارسی، عربی اور جرمن زبانوں میں چھپ چکا ہے۔

⑥ حاشیہ کفایہ

⑦ رسالہ در قوہ و فعل

⑧ رسالہ در اثبات ذات

⑨ رسالہ در صفات

۱۰ رسالہ در افعال
۱۱ رسالہ در وسائط (وسیلہ)
۱۲ الانسان قبل الدین
۱۳ الانسان بعد الدین
۱۴ رسالہ در نبوت
۱۵ رسالہ در ولایت
۱۶ الانسان فی الدین
۱۷ رسالہ در مشتقات
۱۸ رسالہ در برہان
۱۹ رسالہ در مغالطہ
۲۰ رسالہ در تحلیل
۲۱ رسالہ در ترکیب
۲۲ رسالہ در اعتبارات
۲۳ رسالہ در نبوت و مقامات
۲۴ منظوم در رسم الخط نستعلیق
۲۵ علی والفلسفۃ الالٰہیہ
۲۶ قرآن در اسلام
۲۷ شیعہ در اسلام (موجودہ کتاب)

اس کے علاوہ علامہ طباطبائی کے متعدد مقالات اور مضامین مختلف رسالوں مثلاً مکتب تشیع، درسہائے از مکتب اسلام اور راہنمائے کتاب میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

علامہ طباطبائی کی اہم ترین کتاب ''تفسیر المیزان'' ہے کہ اس کی بیس جلدیں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں۔ یہ کتاب زمانہ حال کی سب سے بڑی تفسیروں میں سے ہے اور جیسا کہ قدیم تفاسیر اپنے اپنے زمانے میں علوم و فلسفہ کے پیش نظر قرآنی مطالب کو سمجھنے کے لیے خدمات انجام دیتی رہی ہیں۔ یہ تفسیر موجودہ زمانے میں موجودہ نسل کے لیے وہی خدمات انجام دیتی ہے۔ اس کے علاوہ موصوف نے اس تفسیر میں جدید روش استعمال کی ہے کہ نص حدیث پر مبنی ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآنی آیات کی تفسیر قرآنی آیات سے کی گئی ہے۔ آج علامہ طباطبائی کا تمام وقت اسی تفسیر کو مکمل کرنے پر صرف ہو رہا ہے اور اُمید ہے کہ آپ جلد ہی اس کو مکمل کر لیں گے۔

علامہ صاحب بڑی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ بغیر کسی جنگ و جدال اور شور و غوغا اور ظاہری زرق و برق کے اپنی سادہ زندگی کو علم و دین اور شاگردوں کی تربیت کے

لیے وقف کیے ہوئے ہیں اور اسی حالت میں بہت مفید اور اہم کتابیں لکھ رہے ہیں۔

موجودہ کتاب بے شک علامہ صاحب کو پہلی بار ایرانیوں کے ایک طبقے کے طور پر اور مغرب میں اسلام شناس اور ایران شناس کے عنوان سے تعارف کراتی ہے۔ البتہ آپ ایران کے علمی معاشرے میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں اور اگر اس کتاب کے قارئین بھی اس محدود گروہ میں سے ہوتے تو میں اپنے ناچیز اور نارسا الفاظ کے ساتھ اپنے آپ کو اس بات کی بھی اجازت نہ دیتا کہ آپ کی اہم شخصیت کے بارے میں کچھ لکھتا لیکن چونکہ ایک بہت بڑی تعداد اس کتاب کے ذریعہ پہلی بار اس استاد بزرگوار کی تصنیفات سے آشنائی پیدا کرے گی، اس لیے راقم جو سالہا سال آپ کی شاگردی کی سعادت رکھے ہوئے ہے اور اس اہم کتاب کے انگریزی ترجمے کی بھی ذمہ داری لیے ہوئے ہے، اپنا فرض سمجھتا ہے کہ علامہ طباطبائی کے بارے میں چند الفاظ لکھے اور اس طرح اپنے نارسا الفاظ میں زمانۂ حال کے اس علم و حکمت کے عظیم ستون کا تعارف کرائے۔

البتہ اس عظیم اور بزرگ شخصیت کا تعارف کرانے میں قلم قاصر اور عاجز ہے اور کلام و الفاظ آپ کے علم و فضل اور روحانی کمال و درجات کی تعریف نہیں کر سکتے۔ یہ چند صفحات اس علم و فضل کے سمندر میں ایک قطرے کی حیثیت رکھتے ہیں، جس نے آرام و سکون اور خاموشی کے ساتھ اسلامی و ایرانی معاشرے کی بہت زیادہ خدمت کی ہے اور چونکہ آپ خود حال و حقیقت کے درجے تک پہنچ چکے ہیں، اس لیے ایک نورانی مشعل کی طرح اپنے عقیدت مندوں، شاگردوں اور آپ کی تصنیفات کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے دُور دُور تک راستے کو پُر نور بنا دیا ہے اور ان کی فکری اور معنوی زندگی کو ایک نئی روح اور نیا مقصد عطا کر دیا ہے۔

سید حسین نصر

مقدمہ

یہ کتاب جس کا نام "اسلام میں شیعہ" رکھا گیا ہے، مذہب شیعہ کی حقیقت اور واقعیت کو بیان کرتی ہے جو دو بڑے اسلامی مذاہب تشیع اور تسنن میں سے ایک ہے۔ شیعہ مذہب کی پیدائش اور نشوونما، مذہبی طرز فکر اور شیعہ مذہب کے نقطۂ نظر سے اسلامی معارف جیسے موضوعات کے بارے میں ہے۔

دین

اس میں شک نہیں کہ دنیا کے تمام انسان فطری طور پر اپنے ہم جنسوں کی طرف مائل ہیں، اسی طرح معاشرے اور زندگی میں باہمی اور مجموعی طور پر کام کرتے ہیں۔ ان کے یہ کام ایک دوسرے سے بے ربط اور لاتعلق نہیں ہیں اور ہر انسان کے گوناگوں اعمال مثلاً کھانا، پینا، سونا جاگنا، بولنا سننا، اٹھنا بیٹھنا اور چلنا وغیرہ اور اسی طرح ان کے میل جول کے طریقے اگرچہ ظاہری طور پر مختلف اور جدا نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت آپس میں مکمل رابطہ رکھتے ہیں۔ ہر کام کو ہر جگہ اور ہر دوسرے کام کے بعد انجام نہیں دیا جاسکتا بلکہ ہر کام کے لیے موقع ومحل اور حساب وکتاب الگ ہوتا ہے۔

پس وہ اعمال وافعال جو انسان اپنی زندگی میں انجام دیتا ہے وہ ایک خاص نظام کے تحت انجام پاتے ہیں کہ انسان ان میں خلاف ورزی نہیں کرتا اور یہ کام دراصل ایک خاص نقطے سے شروع ہوتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ انسان چاہتا ہے کہ ایک سعادت مندانہ زندگی کا مالک بنے تاکہ اپنی زندگی میں جہاں تک ممکن ہوسکے کامیاب

ہو اور تمام نعمتوں سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنی آرزوؤں اور اُمیدوں کو پورا کر سکے۔ دوسرے الفاظ میں جہاں تک ممکن ہو، اپنی بقائے حیات کی خاطر زندگی میں تمام ضروریات اور احتیاجات کو مکمل طور پر پورا کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ انسان ہمیشہ اپنے اعمال و افعال کو ان قوانین سے مطابقت دیتا ہے جو یا تو اس نے اپنی مرضی سے بنائے ہوئے ہیں اور یا دوسروں سے حاصل اور قبول کیے ہیں اور اس طرح زندگی میں ایک معینہ طریقہ اپناتا ہے۔ زندگی کی سہولتیں اور دوسرے لوازمات کے لیے کام کرتا ہے، کیونکہ زندگی کی ضروریات کو حاصل کرنا بھی قوانین میں سے سمجھتا ہے۔ لذت حاصل کرنے اور بھوک پیاس کو مٹانے کے لیے کھانا کھاتا اور پانی پیتا ہے کیونکہ کھانے اور پینے کو اپنی جان بچانے کے لیے ضروری خیال کرتا ہے اور اسی طرح کے دوسرے کام۔

مندرجہ بالا قوانین وضوابط جو ایک انسان کی زندگی میں جاری اور حاکم ہیں، سب کے سب ایک بنیادی عقیدے پر قائم اور استوار ہیں اور انسان اپنی زندگی میں انہی پر تکیہ کرتا ہے۔ یہ تکیہ اور بھروسہ ایک ایسا خیال یا گمان ہے کہ انسان اس دنیا میں سے حاصل کرتا ہے کہ خود بھی اسی کا ہی ایک جزو ہے۔ یہ ایک ایسا فیصلہ ہے، جو اس (دنیا) کی حقیقت کے بارے میں وہ کرتا ہے اور یہ مسئلہ ان افراد کے مختلف افکار کا مطالعہ کرنے سے واضح ہوجاتا ہے، جو دنیا کی حقیقت کے بارے میں مختلف خیالات رکھتے ہیں۔ جو لوگ دنیا کو یہی مادی دنیا تصور کرتے ہیں اور انسان کو بھی ایک سو فیصدی مادی مظہر سمجھتے ہیں (یعنی وہ بدن میں روح پیدا ہونے اور پھونکے جانے سے پیدا ہوا ہے اور موت سے مرجائے گا) ان کی زندگی کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی مادی خواہشات اور چند روزہ دنیاوی لذتوں کو پورا کرسکیں اور ان کی ساری کوششیں اسی راہ میں مصروف رہتی ہیں کہ فطرت کی شرائط اور عناصر کو اپنے لیے مطیع اور فرماں بردار بنالیں۔

اور وہ لوگ جو عام بت پرستوں کی طرح دنیائے فطرت کو ایک خدائے برتر کی مخلوق تصور کرتے ہیں جو فطرت سے بالا و برتر ہے اور جس نے اس دنیا کو خصوصاً انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کو اپنی گونا گوں نعمتوں سے نوازا ہے تاکہ اس کی نعمتوں کی خوبیوں اور لذتوں سے فائدہ اُٹھا سکے۔ یہ لوگ اپنی زندگی کے منصوبے اور پروگرام کو اس طرح بناتے ہیں کہ خدا کی خوشنودی حاصل کر سکیں اور اس کو ناراض نہ کریں کیونکہ اگر وہ خدا کو راضی کرلیں گے تو یہ نعمتیں ان پر زیادہ ہو جائیں گی اور ہمیشہ کے لیے قائم اور موجود رہیں گی اور اگر خدا کو ناراض کریں گے تو یہ نعمتیں ان سے چھین لی جائیں گی۔

اور وہ لوگ جو خدا پر ایمان رکھنے کے علاوہ انسان کے لیے ہمیشہ کی زندگی پر ایمان اور اعتقاد رکھتے ہیں اور اسی کو اچھے اور بُرے اعمال کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں اور آخرکار قیامت کے دن پر بھی ایمان رکھتے ہیں مثلاً مجوسی، یہودی، عیسائی اور مسلمان وغیرہ، جو اپنی زندگی میں ایک ایسے راستے پر چلنا چاہتے ہیں، جس میں اعتقاد اور ایمان شامل ہو اور ایسے ہی اس دنیا اور آخرت میں سعادت کی ضمانت بھی اس میں موجود ہو۔

یہ اعتقاد اور ایمان (یعنی انسان اور دنیا کی حقیقت پر اعتقاد) اور اس کے متناسب قوانین جن پر انسان اپنی زندگی میں عمل پیرا رہتا ہے، اس کو 'دین' کہا جاتا ہے۔ اگر کسی دین میں کئی فرقے پیدا ہو جائیں تو ہر فرقے کو 'مذہب' کہتے ہیں۔ مثلاً اسلام میں مذہب اہلِ سنت یا مذہب شیعہ اور عیسائیت میں مذہب ملکانی اور مذہب نسطوری وغیرہ۔

لہٰذا جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا ہے، انسان ہرگز (اگرچہ وہ خدا پر ایمان بھی نہ رکھے یا خدا کو بالکل ہی نہ مانے تو بھی) دین سے (زندگی کے پروگرام اور منصوبے جو اس کے اعتقادی اصولوں پر قائم ہیں) بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ پس دین کا مطلب ہے، روشِ حیات یا زندگی گزارنے کا طریقہ اور انسان ہرگز اس سے جدا اور الگ نہیں ہو سکتا ہے۔

قرآن کریم فرماتا ہے کہ انسان دین سے نہیں بچ سکتا (دور نہیں رہ سکتا) اور وہ (دین) ایک ایسا راستہ ہے، جس کو انسان کے لیے خدا نے کھول رکھا ہے تاکہ اس راستے پر چل کر اس تک پہنچ جائے۔ البتہ جن لوگوں نے دین حق (اسلام) کو قبول کرلیا ہے، وہ یقیناً خدا کے راستے کو طے کر رہے ہیں اور جن لوگوں نے دین حق (اسلام) کو قبول نہیں کیا ہے، وہ خدا کے راستے سے منحرف اور گم راہ ہوگئے ہیں اور غلط راستے پر چل رہے ہیں۔[1]

اسلام

لغت میں اسلام کے معنی قبول کرنے، ہتھیار ڈالنے اور گردن جھکانے کے ہیں اور قرآن مجید جس دین کی دعوت دیتا ہے، اس کو 'اسلام' کہا جاتا ہے کیونکہ اس کا کلی منصوبہ اور پروگرام انسان کا دنیا اور مخلوق کے خدا کے سامنے گردن جھکاتا ہے، تاکہ اس گردن جھکانے کی وجہ سے خدائے یکتا اور وحدہٗ لاشریک کے علاوہ کسی اور کی پرستش[2] یا عبادت نہ کرے اور اس کے فرمان کے علاوہ کسی کی اطاعت نہ کرے۔ جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے: "جس کسی نے سب سے پہلے اس دین کو اسلام اور اس کے پیروکاروں کو مسلمانوں کہا ہے، وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے"۔[3]

---

① لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ○ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا (سورۂ اعراف: ۴۴-۴۵) "(ہوشیار رہو) خدا کی لعنت ہو ان ظالموں اور ستم گاروں پر، جو خدا کے راستے (دین) سے لوگوں کو دور اور منحرف کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ دین (راستہ) بھی ٹیڑھا ہو جائے (یعنی ان کی مرضی کے مطابق ہو جائے) تاکہ وہ اسے قبول کرسکیں۔

② وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا (سورۂ نساء: ۱۲۵) "کون سا دین اس سے بہتر ہے کہ انسان اپنے آپ کو خدا کے حکم کے سامنے تسلیم کردے (اس کا فرمان مانے) اور نیکوکار ہو جائے اور ابراہیمؑ کے پاک اور معتدل دین و آئین کی پیروی کرے"۔

شیعہ

لفظ شیعہ جس کے معنی پیروکار کے ہیں، ان لوگوں پر اطلاق ہوتا ہے، جو پیغمبر اکرم ﷺ کی جانشینی کو آپؐ کے خاندانِ مطہر کا حق سمجھتے ہیں اور اسلامی معارف میں مکتب اہلِ بیتؑ کے پیروکاروں میں سے ہیں۔④

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْــًٔا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (سورہ آل عمران: ۶۴) ''اہلِ کتاب سے کہہ دو کہ آؤ تا کہ ایک مشترکہ کام (امر) میں تعاون کریں اور وہ یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ ہی اس کا شریک ٹھیرائیں اور ہم میں سے بعض لوگ دوسروں کو اپنا آقا اور سرور (خدا) نہ بنائیں اور اگر انھوں نے یہ بات نہ مانی تو پھر انھیں کہو: پس تم گواہ رہنا کہ ہم صرف حق کے آگے گردن جھکاتے ہیں''۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً (سورۂ بقرہ: ۲۰۸) ''اے ایمان والو! خدا کے مقامِ تسلیم (گردن جھکانے کے مقام میں) داخل ہو جاؤ''۔

③ رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ (سورۂ بقرہ: ۱۲۸) ''(ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ نے کہا) خداوندا! ہمیں اپنے حکم کے سامنے گردن جھکانے کی توفیق عطا فرما اور ہماری اولاد کو بھی مسلمان اُمت میں رکھ''۔

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ (سورۂ حج: ۷۸) ''یہ تمھارے باپ ابراہیمؑ کا دین ہے، وہی کہ جس نے تمھیں مسلمان کہا ہے''۔

④ زیدیہ فرقے کے اس گروہ کو بھی شیعہ کہا جاتا ہے جو حضرت علی علیہ السلام سے پہلے خلیفۂ اوّل و دوم کو بھی مانتے ہیں اور فقہ میں امام ابوحنیفہ کی پیروی کرتے ہیں کیونکہ وہ خلفائے بنواُمیہ اور خلفائے بنوعباس کے مقابلے میں حضرت علی علیہ السلام اور آپ کی اولاد کی خلافت پر ایمان رکھتے ہیں۔

پہلا حصہ

مذہب شیعہ کی پیدائش اور اس کی ترقی

(الف) کیفیت پیدائش

- مذہب شیعہ کی پیدائش، آغاز اور اس کی کیفیت۔
- اقلیت (شیعہ) کا اکثریت (سُنّی) سے جدا ہونے کی وجہ اور اختلافات کا پیدا ہونا۔
- جانشینی اور علمی مرجعیت کے دو مسئلے۔
- انتخابی خلافت کا سیاسی طریقہ اور شیعہ عقیدہ کے ساتھ اس کا اختلاف۔
- امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی خلافت اور آپ کا طریقہ کار۔
- حضرت علی علیہ السلام کی پانچ سالہ خلافت کے دوران شیعوں نے جو استفادہ کیا۔
- خلافت کا معاویہ کی طرف چلے جانا اور اس کو موروثی سلطنت میں تبدیل کرنا۔
- شیعوں کے لیے سب سے مشکل زمانہ۔
- بنو امیہ کی سلطنت کا قیام۔
- دوسری صدی ہجری کے دوران شیعوں کی حالت۔
- تیسری صدی ہجری کے دوران شیعوں کی حالت۔

- چوتھی صدی ہجری کے دوران شیعوں کی حالت۔
- پانچویں صدی ہجری سے نویں صدی ہجری تک کے دوران شیعوں کی حالت۔
- دسویں اور گیارہویں صدی ہجری کے دوران شیعوں کی حالت۔
- بارہویں سے چودھویں صدی ہجری کے دوران شیعوں کی حالت۔

مذہب شیعہ کی پیدائش، آغاز اور اس کی کیفیت

مذہب شیعہ کے ماننے والوں کو سب سے پہلے حضرت علی علیہ السلام کے شیعہ یا پیروکار کہا گیا۔[1] مذہب شیعہ کی پیدائش یا آغاز کا زمانہ وہ زمانہ ہے، جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دنیا میں موجود تھے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت سے لے کر تیس سالہ زمانہ بعثت تک اور تحریکِ اسلام کی ترقی کے دَوران بہت سے ایسے اسباب وواقعات رُونما ہوئے جن کے نتیجے میں خود رسولؐ خدا کے اصحاب میں ایک ایسی جماعت کا پیدا ہونا ناگزیر اور لازمی ہو گیا تھا۔

(۱) رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی بعثت کے اوائل میں ہی قرآنِ مجید کی آیت کے مطابق حکم ملا کہ اپنے خویش واقارب کو اپنے دین کی طرف بلائیں۔[2] لہٰذا آپؐ نے واضح طور پر ان لوگوں کو فرمایا: جو شخص تم میں سب سے پہلے میری دعوت کو قبول کرے گا، وہی میرا وصی، وزیر اور جانشین ہوگا"۔ حضرت علی علیہ السلام نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ان کے ایمان کو تسلیم کر لیا اور اپنے وعدوں کو پورا کیا۔[3]

---

(۱) سب سے پہلا نام جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں مشہور ہوا "شیعہ" تھا کہ حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت مقدادؓ اور حضرت عمار بن یاسرؓ اس نام سے مشہور ہوئے۔
(حاضر العالم الاسلامی، جلد اول، ص ۱۸۸)

(۲) (سورۂ شعراء: ۲۱۳-۲۱۵) "اے نبیؐ! اپنے خاندان اور نزدیکی افراد کو (اپنی طرف اور خدا کے دین کی طرف بلاؤ) خدا سے ڈرو، اس وقت جو لوگ تم پر ایمان لے آئیں اور مسلمان ہو جائیں یعنی (بازوؤں) کا سا کر اور ان کو اپنی حفاظت میں لے لے"

فطری طور پر یہ بات محال ہے کہ ایک تحریک کا قائد اور رہبر اپنی تحریک کے آغاز میں اپنے یاروں، دوستوں میں سے ایک شخص کو اپنے وزیر، جانشین یا نائب کے طور پر دوسروں کے سامنے پیش کرے لیکن اپنے فداکار اور جاں نثار اصحاب اور دوستوں کو اس کا تعارف نہ کرائے یا اس کی صرف وزارت اور جانشینی کو خود بھی قبول کرے اور دوسروں سے بھی قبول کرائے لیکن اپنی دعوت اور تحریک کے پورے عرصے میں اس کو وزارت اور جانشینی کے فرائض سے معزول رکھے اور اس کی جانشینی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے اور دوسروں کے درمیان کوئی فرق روا نہ رکھے۔

۲ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کئی مستفیض اور متواتر احادیث و روایات کے ذریعے جو شیعہ اور سنی دونوں ذرائع سے ہم تک پہنچی ہیں واضح طور پر فرمایا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام اپنے قول و فعل میں خطا اور گناہ سے پاک ہیں، وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں یا جو کام بھی انجام دیتے ہیں وہ دین اسلام کی دعوت و تبلیغ کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں اور وہ اسلامی معارف کے بارے میں سب سے زیادہ جانتے ہیں۔[۹]

۳ حضرت علی علیہ السلام نے بہت ہی گراں بہا خدمات انجام دیں اور بے اندازہ فداکاریاں کیں مثلاً ہجرت کی رات حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر مبارک پر

---

۸ اس حدیث کے ضمن میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: (دعوت اسلام کے وقت) میں سب سے چھوٹا تھا۔ میں نے عرض کیا: میں آپ کا وزیر بنتا ہوں۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک میری گردن میں ڈال دیے اور فرمایا کہ یہ شخص میرا بھائی، وصی اور جانشین ہے، اس کی اطاعت کرو۔ لوگ ہنستے تھے اور مذاق کرتے تھے اور ساتھ ہی جناب ابوطالبؑ سے کہتے تھے: تجھے حکم دیا گیا ہے کہ اپنے بیٹے کی اطاعت کرو"۔ (تاریخ طبری، جلد۲، ص ۶۳۔ تاریخ ابوالفداء، جلد اول، ص ۱۱۶۔ البدایہ والنہایہ، جلد سوم، ص ۳۹۔ غایۃ المرام، ص ۳۲۰)

۹ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "حکمت (دانائی کے دس حصے ہیں، جن میں سے نو حصے حضرت علی علیہ السلام کو ملے ہیں اور ایک حصہ پوری دنیا کے لوگوں کو نصیب ہوا ہے"۔ (البدایہ والنہایہ، جلد ہفتم، ص ۳۵۹)

سوئے؛[1] اور وہ فتوحات جو انھوں نے جنگِ بدر، جنگِ اُحد اور جنگِ خندق اور جنگِ خیبر میں حاصل کی تھیں کہ اگر ان میں سے ایک معرکے میں بھی علی علیہ السلام موجود نہ ہوتے تو دشمنانِ حق کے ہاتھوں اسلام اور اہلِ اسلام کی بیخ کنی ہو جاتی۔ (مختلف تواریخ اور جامع کتب احادیث)

﴿۳﴾ غدیرِ خم کا واقعہ جس میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو اپنے جانشین کے طور پر لوگوں کے سامنے پیش کیا اور ان کو اپنا وصی بنایا۔[2]

ظاہر ہے کہ ایسے خصوصی امتیازات اور فضائل جو سب افراد کے لیے قابلِ قبول[3] تھے اور حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بے اندازہ محبت[4] نے فطری طور پر

---

① جس وقت کفارِ مکہ نے فیصلہ کرلیا کہ آج رات پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کر دیں گے تو آپ کے مکان کا محاصرہ کرلیا تھا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فیصلہ کیا کہ آپ ہجرت کر کے مدینہ چلے جائیں تو حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا: "کیا تم آج رات میرے بستر پر سونے کے لیے تیار ہو تاکہ دشمن یہ خیال کریں کہ میں سویا ہوا ہوں اور وہ میرا پیچھا نہ کریں تو حضرت علی علیہ السلام نے اس خطرناک صورتِ حال میں آپؐ کے فرمان کو خندہ پیشانی سے قبول کرلیا۔

② حدیث غدیرِ خم شیعہ اور اہلِ سنت کے درمیان مسلّمہ احادیث میں سے ہے اور ایک سو سے زیادہ اصحاب نے اور مختلف عبارات کے ساتھ اس کو نقل کیا ہے اور عام و خاص کتابوں میں لکھی ہوئی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے کتاب غایۃ المرام، ص ۷۹ اور طبقات، جلد غدیر والغدیر۔

اُم سلمہؓ سے روایت ہے، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "علیؑ ہمیشہ حق اور قرآن کے ساتھ اور حق و قرآن ہمیشہ علیؑ کے ساتھ ہیں اور قیامت تک ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے"۔ یہ حدیث پندرہ مرتبہ عام طریقے سے اور گیارہ مرتبہ خاص طریقے سے نقل ہوئی اور اس کے راوی اُم سلمہؓ، ابن عباس، ابوبکر، عائشہ، علی، ابوسعید خدری، ابولیلیٰ، اور ابوایوب انصاری ہیں۔ (غایۃ المرام بحرانی، ص ۵۳۹-۵۴۰)

③ تاریخ یعقوبی، طبع نجف، جلد ۲، ص ۱۳۷ و ۱۴۰۔ تاریخ ابوالفداء، جلد اول، ص ۱۵۶۔ صحیح بخاری، جلد ۳، ص ۱۰۷۔ مروج الذہب، جلد ۲، ص ۴۳۷۔ تاریخ ابی الحدید، جلد اول، ص ۱۲۷، ۱۶۱۔

④ صحیح مسلم، جلد ۱۵، ص ۱۷۶۔ صحیح بخاری، جلد ۴، ص ۲۰۷۔ مروج الذہب، جلد ۲، ص ۲۳، ۴۳۷۔ تاریخ ابوالفداء، جلد اول، ص ۱۲۷-۱۸۱۔

رسول خدا ﷺ کے اصحاب میں سے ایک بڑی تعداد کو ان کی فضیلت اور حقیقت کا شیفتہ بنا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے حضرت علی علیہ السلام کو پسند کیا اور ان کے گرد جمع ہو گئے اور ان کی پیروی اور اطاعت شروع کر دی یہاں تک کہ بعض لوگوں نے اس پسندیدگی کی وجہ سے آپؑ سے حسد کرنا شروع کر دیا اور آپؑ کے دشمن بن گئے۔

ان سب کے علاوہ شیعۂ علیؑ اور شیعۂ اہل بیت کا نام پیغمبر اکرم ﷺ کی احادیث میں بہت زیادہ نظر آتا ہے۔①

اقلیت شیعہ کے، اکثریت سُنّی سے جدا ہونے کی وجہ اور اختلافات کا پیدا ہونا

رسول پاک ﷺ، صحابہ کرام اور تمام مسلمانوں کی نظر میں حضرت علی علیہ السلام کی قدر و منزلت کے باعث آپ کے پیروکاروں کو یقین تھا کہ آنحضرت ﷺ کی رحلت کے بعد خلافت اور رہبری حضرت علیؑ کا مسلّم حق ہے۔ اس کے علاوہ تمام شواہد و حالات بھی اس عقیدے کی تصدیق کرتے تھے، سوائے ان کے جو پیغمبر اکرم ﷺ کی بیماری کے زمانے میں رُونما ہوئے۔②

---

① حضرت جابر کہتے ہیں: ایک دن میں پیغمبر اکرم ﷺ کے پاس بیٹھا تھا کہ دُور سے علیؑ دکھائی دیئے۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، یہ شخص، اس کے پیروکار اور دوست قیامت کے دن بخشے جائیں گے۔ ابن عباس کہتے ہیں: جب آیۂ کریمہ: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ (سورۂ بینہ: ۷) نازل ہوئی تو پیغمبر اکرم ﷺ نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا: یہ آیت تم پر اور تمھارے شیعوں پر صادق آتی ہے کہ قیامت کے دن خوش اور راضی ہوں گے اور خدا بھی تم پر راضی ہوگا۔ یہ دو حدیثیں اور ایسی ہی دوسری کئی حدیثیں کتاب درمنثور، جلد اوّل، ص ۳۷۹ اور غایۃ المرام، ص ۳۲۶ پر موجود ہیں۔

② آنحضرت ﷺ نے مرض الموت کی حالت میں اسامہ بن زید کی سرکردگی میں ایک لشکر تیار کیا اور تاکید کی کہ سب لوگ اس جنگ میں شرکت کریں اور مدینہ سے باہر نکل جائیں۔ ایک جماعت نے آپؐ کے حکم کی خلاف ورزی کی۔ اس میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر بھی تھے۔ اس واقعہ نے پیغمبر اکرم کو بہت زیادہ صدمہ پہنچایا۔ (شرح ابن ابی الحدید، طبع مصر، جلد اوّل، ص ۵۳)

لیکن ان لوگوں کی توقعات کے بالکل برخلاف ٹھیک اس وقت جب کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے رحلت فرمائی اور ابھی آپؐ کی تجہیز و تکفین بھی نہیں ہوئی تھی اور اہل بیتؑ اور بعض اصحاب سوگواری اور کفن دفن کے انتظامات کر رہے تھے، خبر ملی کہ ایک جماعت نے جو بعد میں اکثریت کی حامل ہوئی، بہت ہی جلد بازی سے پیغمبر ﷺ کے اہل وعیال، رشتہ داروں اور پیروکاروں سے مشورہ کیے بغیر اور حتیٰ کہ ان کو اطلاع دیے بغیر، ظاہری خیر خواہی اور مسلمانوں کی بہبودی کی خاطر مسلمانوں کے لیے خلیفہ کا انتخاب کر لیا اور اس کی خبر حضرت علی علیہ السلام اور آپ کے پیروکاروں کو کام انجام پا جانے کے بعد دی گئی تھی۔ (شرح ابن ابی الحدید، جلد اوّل، ص ۵۸ اور ص ۱۲۳ تا ۱۳۵۔ تاریخ یعقوبی، جلد ۲، ص ۱۰۲۔ تاریخ طبری، جلد ۲، ص ۴۴۵ تا ۴۶۰)

حضرت رسول اکرم ﷺ کے کفن و دفن کے بعد جب حضرت علی علیہ السلام اور آپ کے پیروکاروں عباس، زبیر، سلمان، ابوذر، مقداد اور عمار کو اس واقعے کی اطلاع ملی تو انھوں نے انتخابی خلافت اور خلیفہ کو انتخاب کرنے والوں پر سخت اعتراضات کیے اور اسی ضمن میں (احتجاجی) جلسے بھی ہوئے مگر جواب دیا گیا کہ مسلمانوں کی اسی میں بہتری

پیغمبر اکرم ﷺ نے رحلت کے وقت فرمایا کہ قلم اور دوات لاؤ تا کہ میں تمھارے لیے ایک چٹھی لکھوں کہ تمھاری ہدایت اور رہنمائی کا باعث بنے اور تم گمراہ ہونے سے بچ جاؤ۔ حضرت عمر نے اس کام سے منع کر دیا اور کہا کہ آپؐ کا مرض بہت زیادہ بڑھ گیا ہے اور شدید بخار کی حالت میں آپ کو ہذیان ہے۔ (تاریخ طبری، جلد ۲، ص ۴۳۶۔ صحیح بخاری، جلد ۳۔ صحیح مسلم، جلد ۵۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۵، ص ۲۲۷۔ تاریخ ابن ابی الحدید، جلد ۱، ص ۱۳۳)

یہی واقعہ خلیفۂ اوّل (حضرت ابوبکر) کی مرض موت کے وقت تکرار ہوا تھا کہ خلیفۂ اوّل نے حضرت عمر کی خلافت کے لیے وصیت کی تھی اور وصیت کرتے وقت بیہوش ہو گئے تھے، مگر حضرت عمر نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا اور اس کو خلیفۂ اوّل کا ہذیان نہیں کہا تھا، حالانکہ خلیفۂ وقت وصیت لکھتے ہوئے بیہوش ہو گئے تھے لیکن پیغمبر اکرم ﷺ تو معصوم تھے اور آپ کا فرمانا بھی بجا تھا۔ (روضۃ الصفا، جلد ۲، ص ۲۶۰)

تھی۔(تاریخ یعقوبی جلد۲، ص ۱۰۳-۱۰۶، تاریخ ابوالفداء، جلد اوّل، ص ۱۵۶ اور ۱۶۶۔ مروج الذہب، جلد۲، ص ۳۰۷ و ۳۵۲۔ تاریخ ابن ابی الحدید، جلد اوّل، ص ۱۷ و ۱۳۴)

یہی اعتراض تھا، جس نے اقلیت کو اکثریت سے جدا کر دیا تھا اور حضرت علی علیہ السلام کے پیروکاروں کو معاشرے میں "شیعہ علیؑ" کے نام سے پہچنوایا تھا۔ البتہ حکومت اور خلافت کے ماسور بھی سیاسی لحاظ سے کڑی نظر رکھے ہوئے تھے کہ مذکورہ اقلیت اس نام سے مشہور نہ ہو اور اسلامی معاشرہ اکثریتی اور اقلیتی گروہوں میں تقسیم نہ ہونے پائے بلکہ وہ خلافت کو "اجماعِ اُمت" جانتے تھے اور اعتراض کرنے والوں کو بیعت اور مسلمانوں کے مخالفوں کے طور پر تعارف کراتے تھے اور کبھی دوسرے بُرے ناموں سے بھی یاد کرتے تھے۔①

البتہ شیعہ لوگ شروع سے ہی وقتی سیاست کے محکوم ہو گئے تھے لیکن صرف اعتراضات کے ذریعے کوئی کام انجام نہیں دے سکتے تھے۔ ادھر حضرت علی علیہ السلام بھی مسلمانوں اور اسلام کی خاطر اور کافی طاقت و قوت نہ رکھنے کی وجہ سے ایک خونی انقلاب برپا نہ کر سکے، لیکن اعتراض کرنے والے لوگ اپنے عقیدے اور نظریے کے لحاظ سے اکثریت کے تابع نہ ہوئے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی اور علمی رہبری کو حضرت علی علیہ السلام کا حق جانتے تھے،② اور علمی و معنوی مرکز صرف علی علیہ السلام کو ہی سمجھتے تھے

---

① عمرو بن حریث نے سعید بن زید سے کہا: آیا کسی نے حضرت ابوبکر کی بیعت کرنے کی مخالفت کی ہے، تو اس نے جواب دیا: کسی نے مخالفت نہیں کی سوائے ان لوگوں کے جو مرتد ہو گئے ہیں یا مرتد ہو رہے ہیں۔(تاریخ طبری، جلد۲، ص ۴۴۷)

② مشہور حدیث ثقلین میں آیا ہے: "میں تمہارے درمیان دو بہت ہی اہم چیزیں چھوڑ رہا ہوں کہ اگر تم نے ان کو مضبوطی سے پکڑے رکھا تو ہرگز گمراہ نہیں ہو گے۔ وہ دو چیزیں "قرآن مجید" اور "اہل بیت" ہیں، جو قیامت تک ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گی۔ یہ حدیث ایک سو سے زیادہ بار اور تقریباً ۳۵ اصحاب پیغمبرؐ سے نقل ہوئی ہے۔(طبقات، جلد حدیث ثقلین۔ غایۃ المرام، ص ۲۱۱) پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ، پس جو شخص علم کا طالب ہے اس دروازے سے داخل ہو جائے"۔(البدایہ والنہایہ، جلد۷، ص ۳۵۹)

تھے اور اسی طرح دوسروں کو حضرت علی علیہ السلام کی طرف دعوت دیتے تھے۔(تاریخ یعقوبی، جلد۲، ص ۱۰۵ و ۱۵۰ میں بار بار اس کا ذکر ہوا ہے)

جانشینی اور علمی رہبری کے مسائل

اسلامی تعلیمات کے مطابق شیعوں نے جو کچھ سیکھا تھا، اس پر معتقد تھے۔ جو چیز معاشرے کے لیے سب سے زیادہ اہمیت کی حامل تھی، وہ یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات اور دینی ثقافت کو واضح کیا جائے اور دوسرے درجے پر ان کو معاشرے میں مکمل طور پر نافذ اور جاری کرنا ہے۔[1]

دوسرے الفاظ میں معاشرے کے افراد دنیا اور انسانوں کو حقیقت بین نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اپنے انسانی فرائض کو پورا کریں (جیسا کہ انسانوں کی حقیقی مصلحت ہے) اور ان کو سمجھیں اور ان پر عمل کریں، اگرچہ وہ فرائض ان کی اپنی مرضی اور خواہش کے مخالف ہی کیوں نہ ہوں۔

دوسرے یہ کہ ایک دینی حکومت، حقیقی اسلامی انتظام اور نظم و نسق کو معاشرے میں مضبوط اور محفوظ رکھے اور اسے نافذ کرے، اس طرح کہ لوگ خدا کے سوا کسی اور کی پرستش نہ کریں اور وہ مکمل آزادی سے انفرادی اور اجتماعی انصاف سے بہرہ ور ہوں۔ یہ دونوں کام اس شخص کے ہاتھوں انجام پائیں، جس کی عصمت اور حفاظت خداوند تعالیٰ کی طرف سے ہو، ورنہ ممکن ہے ایسے اشخاص اقتدار و حکومت اور علمی رہبری کو اپنے ہاتھ میں لے لیں، جو اپنے فرائض کی ذمہ داری میں فکری انحراف یا خیانت سے محفوظ نہ ہوں اور اس طرح اسلام کی آزادی بخش عادلانہ حکومت اور ولایت آہستہ آہستہ

---

[1] کتاب خدا، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث اور آئمہ اہل بیتؑ کے بیانات سے علم حاصل کرنے کی ترغیب ہوتی ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: طلب العلم فریضة علی کل مسلم، یعنی علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔ (بحار الانوار، جلد ۱، ص ۵۵)

استبدادی سلطنت اور قیصر و کسریٰ جیسی حکومت میں تبدیل ہو کر رہ جائے۔ پاک دینی علوم اور دوسرے مذاہب کے معارف میں تبدیلیاں پیدا ہو جائیں اور بوالہوس و خود غرض دانش وریا افراد ان میں اپنی مرضی سے کمی بیشی کر دیں اور صرف وہ شخص جس کی تصدیق پیغمبر اکرم ﷺ نے کی ہو، اور وہ شخص اپنے قول و فعل میں پاک اور پختہ ہو اور اس کے طور طریقے کتاب خدا اور سنت رسولؐ کے ساتھ مکمل مطابقت رکھتے ہوں اور ایسے شخص صرف حضرت علی علیہ السلام تھے۔ (البدایہ والنہایہ، جلد ۷، ص ۳۶۰)

اگرچہ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ قریش حضرت علی علیہ السلام کی خلافت حقہ کے مخالف تھے، تو اس صورت میں ضروری تھا کہ مخالفوں کو حق کی اطاعت پر مجبور کیا جاتا اور سرکش لوگوں کو سر اُٹھانے کی اجازت نہ دی جاتی، نہ کہ قریش کی مخالفت کے ڈر سے حق کو پامال کیا جاتا، جیسا کہ خلیفۂ اول نے ان لوگوں کے ساتھ جنگ کی تھی، جنھوں نے زکوٰۃ دینا بند کر دی تھی، لیکن زکوٰۃ لینے سے چشم پوشی نہ کی گئی۔

جس چیز نے شیعوں کو انتخابی خلافت کے قبول اور تسلیم نہ کرنے پر اُبھارا وہ یہ تھی کہ ان کو بعد میں رونما ہونے والے ناگوار اتفاقات و حوادث کا خوف تھا، یعنی اسلامی حکومت کے نظام اور طریقوں میں بدعنوانی اور فساد کے پیش خیمے کے نتیجے میں دین مبین اسلام کی بنیادی تعلیمات کی خرابی لازمی نظر آتی تھی۔ اتفاق سے بعد میں رونما ہونے والے حوادث بھی اس عقیدے یا پیش گوئی کو تقویت دے رہے تھے، جس کے نتیجے میں شیعہ جماعت اپنے عقیدے پر زیادہ سے زیادہ مضبوط ہوتی جا رہی تھی یا یوں کہیے کہ ظاہری طور پر ایک چھوٹی سی جماعت ایک بڑی اکثریت کو اپنے اندر ہضم کرنے چلی تھی لیکن باطنی طور پر اہل بیتؑ سے اسلامی تعلیمات حاصل کرنے اور اپنے طریقے کی طرف لوگوں کو دعوت دے رہی تھی اور اپنے عقائد پر مُصر تھی، مگر اس کے ساتھ ہی اسلامی طاقت کی ترقی اور حفاظت کے پیش نظر (حکومت کے ساتھ) اعلانیہ

مخالفت بھی نہیں کرتی تھی، حتیٰ کہ شیعہ اکثریت کے دوش بدوش جہاد پر جاتے اور رفاہِ عامہ کے کاموں میں حصّہ لیتے تھے اور خود حضرت علی علیہ السلام اسلام کے فائدے کی خاطر لوگوں کی رہنمائی کیا کرتے تھے۔ (تاریخ یعقوبی، ص ۱۱۱، ۱۲۶، اور ص ۱۲۹)

انتخابی خلافت کا سیاسی طریقہ اور شیعہ عقیدے کے ساتھ اختلاف

شیعہ جماعت کا عقیدہ تھا کہ اسلام کی آسمانی اور خدائی شریعت جس کا سارا مواد خدا کی کتاب اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت میں واضح کیا جا چکا ہے، قیامت تک اپنی جگہ پر قائم و دائم ہے اور ہرگز قابلِ تغیر نہیں ہے۔[۱] لہٰذا اسلامی حکومت کے پاس اس قانونِ شریعت کو مکمل طور پر نافذ نہ کرنے کے لیے کوئی عذر یا بہانہ نہیں ہے کہ اس شریعت کی خلاف ورزی کرے۔ اسلامی حکومت کا اوّلین فرض یہ ہے کہ شریعتِ اسلامی کی حدود میں مشورے اور مصلحتِ وقت کے پیشِ نظر فیصلے کرے اور قدم اُٹھائے، لیکن شیعوں کی سیاسی و مصلحتی بیعت اور اسی طرح "کاغذ، قلم اور دوات" کا واقعہ جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے آخری ایام میں پیش آیا تھا، ان سے ظاہر تھا کہ انتخابی خلافت کے طرفداروں اور اس کے چلانے والوں کا اعتقاد ہے کہ خدا کی کتاب (قرآنِ مجید) بنیادی قانون کی طرح محفوظ رہے لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

---

۱ اللہ تعالیٰ اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے: وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ○ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ (سورۂ حم سجدہ: ۴۲) "قرآن کریم ایسی محترم کتاب ہے، جو ہرگز پہلے یا بعد باطل اور (کسی زمانے میں) منسوخ نہیں ہوگی، اور باطل کسی طرح بھی اس میں داخل نہیں ہوگا۔ اور پھر فرماتا ہے: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (سورۂ یوسف: ۴۰ و ۶۷) خدا کے سوا کسی کو حکم نہیں کرنا چاہیے، یعنی شریعت صرف خدا کا قانون ہے، جو نبوت کے ذریعے لوگوں تک پہنچتا ہے۔ اور پھر فرماتا ہے: وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (سورۂ احزاب: ۴۰) اس آیت کے ذریعے ختم نبوت اور ختم شریعت کو پیغمبر اسلامؐ کے لیے بیان فرمایا ہے، اور پھر فرماتا ہے: وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (سورۂ مائدہ: ۴۴) "جو شخص خدا کے حکم کے مطابق حکم اور فیصلہ نہ کرے وہ کافر ہے"۔

احادیث اور سنت کو اپنی جگہ پر ثابت نہیں سمجھتے بلکہ ان کا عقیدہ ہے کہ اسلامی حکومت، زمانے کی ضروریات اور مصلحتِ وقت کے سبب ان کے نفاذ کو نظر انداز کر سکتی ہے اور یہ عقیدہ ان بہت زیادہ احادیث و روایات کے ذریعے جو بعد میں نقل ہوئیں، صحابہ کے حق میں ثابت ہو گیا تھا کہ وہ مجتہد ہیں اور اگر اجتہاد یا مصلحت اندیشی میں اختلاف کریں تو مجبور ہیں اور خطا کریں تو معذور، اس کا اہم ترین نمونہ وہ ہے، جب کہ خلیفہ کا جرنیل خالد بن ولید رات کے وقت ایک مشہور مسلمان (مالک بن نویرہ) کے گھر مہمان ہوا اور پھر موقع پا کر اس کو قتل کر دیا، اس کا سر کاٹ کر بھٹی میں جلا دیا اور پھر اسی رات مالک بن نویرہ کی بیوی کے ساتھ اس نے زنا کیا۔ اس شرم ناک واقعے کے بعد چونکہ خلیفۂ وقت کو ایسے جرنیل کی ضرورت تھی لہٰذا شریعت کی حد کو خالد بن ولید کے حق میں جاری نہ کیا گیا تھا (تاریخ یعقوبی، جلد۲، ص ۱۱۰۔ تاریخ ابی الفداء، جلد اوّل، ص ۱۵۸)۔ اسی طرح اہلِ بیتؑ کو خمس کا حصّہ نہ دیا گیا۔[1] اور پیغمبر اکرم ﷺ کی احادیث کا لکھنا بالکل ممنوع کر دیا گیا۔ اگر کوئی حدیث کسی جگہ لکھی ہوئی نظر آتی یا کسی سے ملتی تو اس کو فوراً ضبط کر کے جلا دیا جاتا،[2] اور یہ ممنوعیت تمام خلفائے راشدین کے

---

① در المنثور، جلد۳، ص ۱۸۶۔ تاریخ یعقوبی، جلد۳، ص ۴۸۔ اس کے علاوہ قرآن مجید میں خمس کے بارے میں آیت نازل ہوئی ہے: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰہِ خُمُسَہٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی (سورۂ انفال: ۴۱)

② حضرت ابوبکر نے اپنے عہدِ خلافت میں پانچ سو احادیث جمع کی تھیں۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ایک رات صبح تک میں نے اپنے باپ کو بہت سخت پریشان دیکھا۔ صبح کے وقت اس نے مجھے کہا کہ ساری حدیثوں کو میرے پاس لاؤ، پھر سب کو جلا دیا (کنز العمال، جلد۵، ص ۲۳۷)۔ حضرت عمر نے تمام شہروں میں پیغامات بھجوائے کہ جس شخص کے پاس کوئی لکھی ہوئی حدیث موجود ہو تو اسے نابود کر دے (کنز العمال، جلد۵، ص ۲۳۷)۔ محمد بن ابی بکر کہتے ہیں: حضرت عمر کے زمانے میں بہت زیادہ احادیث جمع ہو گئی تھیں، جب لوگ ان احادیث کو آپ کے پاس لائے تو آپ کے حکم سے سب کو جلا دیا گیا۔ (طبقات ابن سعد، جلد۵، ص ۱۴۰)

زمانے سے لے کر حضرت عمر بن عبدالعزیز اُموی خلیفہ (۹۹ تا ۱۰۲ ہجری) کے عہد تک جاری رہی۔ (تاریخ ابوالفداء، جلد اوّل، ص ۱۵۱ وغیرہ)

خلیفہ دوم کے زمانے میں یہ سیاست واضح تر ہو گئی تھی۔ خلیفۂ وقت نے بعض شرعی احکام مثلاً حج تمتع، نکاحِ متعہ اور اذان میں حَيَّ عَلٰى خَيْرِ الْعَمَل کہنا ممنوع قرار دے دیا۔① تین طلاق دینے کی رسم نافذ کی گئی اور ایسے ہی کئی دوسرے احکام وغیرہ (تاریخ یعقوبی، جلد ۲، ص ۱۳۱۔ تاریخ ابی الفداء، جلد اوّل، ص ۱۶۰)۔ ان کی خلافت کے دوران بیت المال کا حصہ عوام کے درمیان فرق اور اختلاف سے تقسیم ہوا (اسد الغابہ، جلد ۴، ص ۳۸۶۔ الاصابہ، جلد ۳) جس کے نتیجے میں عجیب طبقاتی اختلاف اور خطرناک خونی مناظر سامنے آئے۔ ان کے زمانے میں امیر معاویہ ملک شام میں قیصر و کسریٰ جیسے شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ اور رسم و رواج کے ساتھ حکومت کرتا تھا اور یہاں تک کہ خلیفۂ وقت بھی اسے کسریٰ عرب (عرب کا بادشاہ) کہہ کر خطاب کیا کرتا تھا اور کبھی اس کے اس حال پر اعتراض نہ کیا۔

---

① پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر مکہ کے اردگرد یا دُور دراز سے آنے والے حاجیوں کے لیے عملِ حج کو (آیۂ کریمہ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ...... الخ (سورۂ بقرہ آیت ۱۹۶ کے مطابق) خاص شکل میں انجام دینے کے لیے معین کر دیا تھا اور حضرت عمر نے اپنی خلافت کے دوران اسے ممنوع قرار دے دیا تھا اور اسی طرح رسولِ خدا کے زمانے میں متعہ (وقتی نکاح) جاری تھا لیکن حضرت عمر نے اپنے عہد خلافت میں اس کو ممنوع کر دیا اور خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے سزا مقرر کر دی تھی کہ ایسے لوگوں کو سنگسار کر دیا جائے اور اسی طرح رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں اذان میں حَيَّ عَلٰى خَيْرِ الْعَمَلْ (یعنی بہترین عمل کے لیے تیار ہو جاؤ جو نماز ہے) کہا جاتا تھا لیکن حضرت عمر نے کہا کہ یہ فقرہ مسلمانوں کو جہاد سے روکتا ہے، اس لیے ممنوع کر دیا۔ اور ایسے ہی پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں طلاق صرف ایک بار سے زیادہ نہیں ہوا کرتی تھی لیکن خلیفۂ دوم نے حکم دیا کہ ایک مجلس میں تین طلاقیں دی جائیں۔ یہ تمام واقعات شیعہ اور اہلِ سنت کی کتب فقہ میں موجود اور معروف ہیں۔

خلیفہ دوم ۲۳ ہجری میں ایک ایرانی غلام کے ہاتھوں قتل ہوئے اور چھ رکنی کمیٹی کی اکثریت رائے سے جو خلیفہ دوم کے حکم سے منعقد ہوئی تھی۔ خلیفہ سوم نے زمام اُمور سنبھالی۔ انھوں نے اپنے عہد خلافت میں اپنے اُموی خویش و اقارب کو لوگوں پر مسلط کر دیا تھا اور اس طرح حجاز و عراق، مصر اور تمام اسلامی ممالک میں عنانِ حکومت ان کے ہاتھ میں سونپ دی (تاریخ یعقوبی، جلد۲، ص ۱۵۰۔ تاریخ ابی الفداء، جلد اوّل، ص ۱۶۸۔ تاریخ طبری، جلد۳، ص ۳۷۷ وغیرہ)۔ انھوں نے لاقانونیت کی بنیاد رکھی اور آشکارا طور پر ظلم و ستم اور فسق و فجور کی خلاف ورزی اسلامی حکومت میں شروع ہو گئی۔ دارالخلافہ میں ہر طرف سے شکایتوں کے طومار آنے لگے، لیکن خلیفہ اپنی اُموی کنیزوں اور لونڈیوں اور خاص کر مروان بن الحکم کے زیر اثر ان شکووں اور شکایتوں پر توجہ ہی نہ کرتے۔ (تاریخ یعقوبی، جلد۲، ص ۱۵۰۔ تاریخ طبری، جلد۳، ص ۳۹۷)

اس طرح ظلم و ستم کا انسداد کرنے کی نوبت ہی نہ آتی تھی بلکہ کبھی کبھی حکم دیتے کہ شکایت کرنے والوں پر مقدمہ چلایا جائے۔[1] آخر کار ۳۵ ہجری میں لوگوں

---

(1) مصر کی ایک جماعت نے خلیفہ کے خلاف مظاہرے شروع کر دیے۔ حضرت عثمان کو خطرہ لاحق ہو گیا، انھوں نے حضرت علی ابن ابی طالبؑ سے مدد کی درخواست کی اور اپنے کیے پر نادم ہوئے۔ حضرت علیؑ نے مصریوں سے فرمایا: تم حق کو زندہ کرنے کے لیے اُٹھے ہو اور عثمان نے توبہ کر لی ہے، اور کہتا ہے: میں گزشتہ روش چھوڑ دیتا ہوں اور تین ماہ کے اندر اندر تمھارے مطالبے پورے کر دوں گا اور ظالم حکمرانوں کو معزول کر دوں گا۔ پس حضرت علیؑ نے حضرت عثمان کی طرف سے مظاہرہ کرنے والوں کے ساتھ معاہدہ پر دستخط کر دیے اور وہ واپس چلے گئے۔

راستے میں انھوں نے حضرت عثمان کے غلام کو دیکھا جو عثمان کے اُونٹ پر سوار مصر جا رہا تھا، لوگوں نے اس پر شک کیا اور پکڑ کر اس کی تلاشی لی۔ اس کے پاس سے ایک خط نکلا جو حاکم مصر کے نام لکھا گیا تھا اور اس خط کا مضمون یہ تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ جب عبدالرحمٰن بن عدلیس تمھارے پاس پہنچے تو اس کو ایک سو کوڑے لگاؤ، اس کا سر اور اس کی داڑھی مونڈ کر جیل میں ڈال دو اور اسے لمبی قید کی سزا دو اور یہی عمل عمر بن الحمق، سودان بن حمران اور عروہ بن نباع کے بارے میں انجام دو"۔ ←

نے ان کے خلاف مظاہرے کیے اور چند روز تک ان کے مکان کو گھیرے رکھا اور پھر مار دھاڑ کے بعد ان کو قتل کر دیا گیا۔ خلیفہ سوم نے اپنے دورانِ خلافت میں شام کی حکومت معاویہ کو دے رکھی تھی، جو ان کے اموی خویش و اقارب میں بہت ہی اہم شخص تھا۔ وہ معاویہ کو زیادہ سے زیادہ مدد دیتے اور اس کو مضبوط کیا کرتے تھے۔ دراصل شام خلافت کا اصلی مرکز بن چکا تھا اور دارالخلافہ مدینہ میں صرف نام کی حکومت باقی رہ گئی تھی۔ (تاریخ طبری، جلد۳، ص ۳۷۷)

خلیفۂ اوّل کی خلافت اکثریت صحابہ کی رائے اور انتخاب سے معین ہوئی تھی اور خلیفۂ دوم، خلیفۂ اوّل کی وصیت سے منتخب ہوئے اور خلیفۂ سوم چھے رکنی مشاورتی کمیٹی کی رائے کے ساتھ انتخاب کیے گئے تھے اور اس کمیٹی کا دستور العمل اور منشور بھی خود خلیفۂ دوم نے بنایا تھا۔ مجموعی طور پر تین خلفا کا انتظام مملکت داری، جنھوں نے ۲۵ سال حکومت کی تھی، یوں تھا کہ اسلامی قوانین، اجتہاد اور مصلحتِ وقت کے مطابق معاشرے میں نافذ کیے جائیں اور اس مصلحت بینی کو خود خلیفۂ وقت تشخیص دے۔

← ایلچی سے خط لے لیا گیا اور مصری لوگ نہایت غصے کی حالت میں عثمان کی طرف واپس لوٹے اور کہنے لگے: تم نے ہم سے خیانت اور غداری کی ہے۔ عثمان نے خط سے انکار کیا۔ انھوں نے کہا: تمھارا غلام یہ خط لے کر جا رہا تھا۔ جواب ملا کہ وہ میری اجازت کے بغیر اس عمل کا مرتکب ہوا ہے۔ انھوں نے کہا: جس اُونٹ پر وہ سوار تھا، وہ تمھارا تھا۔ جواب دیا کہ اس نے میرے اُونٹ کو چرایا ہے۔ انھوں نے کہا: یہ خط تمھارے منشی نے لکھا ہے۔ عثمان نے جواب دیا: اس نے میری اطلاع کے بغیر یہ کام کیا۔ اس پر وہ کہنے لگے: بہرحال تم خلافت کے لائق نہیں ہو، بہتر ہے کہ مستعفی ہو جاؤ، کیونکہ اگر یہ کام تمھاری اجازت سے ہوا تو تم غدار ہو۔ اور اگر ایسا اہم کام تمھاری اطلاع کے بغیر ہوا ہے تو اس سے تمھاری بے لیاقتی اور کمزوری ثابت ہوتی ہے۔ اب یا استعفیٰ دو یا ابھی اپنے ظالم حاکموں کو معزول کرو۔ عثمان نے جواب میں کہا: اگر میں تمھاری مرضی سے کام کروں تو پھر حکومت تمھاری ہے، میں کون ہوں؟ وہ لوگ غصے میں مجلس سے اُٹھ گئے۔ (تاریخ طبری، جلد۳، ص۴۰۲-۴۰۹۔ تاریخ یعقوبی، جلد۲، ص۱۵۰-۱۵۱)

(اس زمانے میں) اسلامی علوم و معارف کا طریقہ یہ تھا کہ صرف قرآن کو کسی تفسیر اور غور و خوض اور معانی کو سمجھے بغیر پڑھا جائے اور پیغمبر اکرم ﷺ کی احادیث کو لکھے بغیر ہی بیان کیا جائے اور سننے یا بتانے سے تجاوز نہ کیا جائے۔ قرآن کریم کی کتابت پر بھی اجارہ داری تھی۔ حدیث کی کتابت ممنوع تھی۔ (صحیح بخاری جلد ۶، ص ۹۸۔ تاریخ یعقوبی، جلد ۲، ص ۱۱۳)

جنگ یمامہ جو ۱۲ ہجری میں ختم ہوئی تھی اور اس جنگ میں صحابہ اور قرآن کے قاریوں کی ایک بہت بڑی تعداد شہید ہوگئی تھی۔ اس کے بعد حضرت عمر بن الخطاب نے خلیفۂ اول کو تجویز پیش کی کہ قرآنی آیات کو ایک مصحف (جلد) میں جمع کر دیں کیونکہ خدانخواستہ اگر ایسی ہی ایک اور جنگ رونما ہوگئی اور باقی ماندہ قاری بھی شہید ہو گئے تو قرآن مجید ہمارے ہاتھوں سے نکل جائے گا (محو ہو جائے گا) لہٰذا ضروری ہے کہ قرآنی آیات کو ایک مصحف (جلد) میں جمع کر کے اس کی کتابت کی جائے۔ (تاریخ یعقوبی، جلد ۲، ص ۱۱۱۔ تاریخ طبری، جلد ۳، ص ۱۲۹-۱۳۲)

قرآن مجید کے بارے میں تو یہ فیصلہ کر دیا گیا مگر احادیث رسول اکرم ﷺ جو قرآن مجید کے بعد دوسرے درجے پر مقام رکھتی ہیں اور احادیث کو بھی وہی خطر درپیش تھا۔ معانی اور لکھائی میں کمی بیشی، جعل، فراموشی اور دستبرد سے محفوظ نہیں تھیں لیکن احادیث شریف کی حفاظت کے لیے کوشش نہ کی گئی بلکہ احادیث کی کتابت اور لکھائی کو ممنوع قرار دے دیا گیا اور جب بھی کوئی لکھی ہوئی حدیث ہاتھ لگتی تو اس کو جلا دیا جاتا تھا، یہاں تک کہ اسلامی احکام و ضروریات مثلاً نماز کے بارے میں بھی متضاد اور متعدد احادیث و روایات پیدا ہو گئیں۔ اسی طرح دوسرے تمام علمی موضوعات کے متعلق بھی کوئی خاطر خواہ اقدام نہ کیا گیا۔ قرآن مجید اور احادیث نبویؐ میں علوم حاصل کرنے کے بارے میں جو احترام اور تاکید موجود ہے اور علوم کو وسعت و ترقی دینے پر

جس قدر زور دیا گیا ہے، وہ سب کا سب بے اثر ہو کر رہ گیا۔ اکثر لوگ اسلامی فوجوں کی پے در پے فتوحات میں سرگرم اور بے اندازہ مالِ غنیمت سے راضی اور خوش تھے۔ جو ہر طرف سے جزیرۃ العرب میں آ رہا تھا، لہٰذا اب خاندانِ رسالت مآبؐ کے علوم کی طرف کوئی توجہ نہ تھی، جس کے بانی علیؑ تھے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کو سب سے زیادہ عالم اور قرآن و اسلام کا شناسا کہہ کر لوگوں کو تعارف کرایا تھا۔ حتیٰ کہ قرآن شریف کو جمع کرنے کے واقعے میں (باوجودیکہ جانتے تھے کہ آپؑ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رحلت کے بعد ایک مدت تک کنجِ عزلت میں بیٹھ کر قرآن مجید کو ایک مصحف میں جمع کر دیا تھا) بھی آپؑ کو شامل نہ کیا گیا، حتیٰ کہ آپؑ کا نام تک نہ لیا گیا۔[1]

یہ اور ایسے ہی دوسرے اُمور تھے کہ حضرت علی علیہ السلام کے پیروکاروں کو اپنے عقیدے میں زیادہ سے زیادہ راسخ اور مضبوط کر رہے تھے اور ان کو واقعات کے بارے میں زیادہ ہوشیار بنا رہے تھے۔ اس طرح روز بروز اپنی سرگرمیوں میں اضافہ کر رہے تھے۔ ادھر حضرت علی علیہ السلام بھی جو تمام لوگوں کی تربیت کرنے سے قاصر تھے، صرف خاص لوگوں کی تربیت پر توجہ دے رہے تھے۔

---

[1] تاریخ یعقوبی، جلد ۲، ص ۱۱۳۔ تاریخ ابن ابی الحدید، جلد اوّل، ص ۹۔ بہت زیادہ احادیث و روایات میں آیا ہے کہ جب لوگوں نے حضرت ابوبکر کی بیعت کر لی تو انھوں نے ایک آدمی حضرت علیؑ کے پاس بھی بھیجا اور آپ سے بیعت چاہی۔ حضرت علی علیہ السلام نے جواب دیا کہ میں نے عہد کیا ہوا ہے کہ نماز پڑھنے کے سوا گھر سے باہر نہ نکلوں تاکہ قرآن مجید کو ایک مصحف میں جمع کروں۔ یہ بھی آیا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے قرآن مجید کو ایک جلد میں جمع کرنے کے بعد ایک اُونٹ پر لاد کر لوگوں کے سامنے پیش کیا تھا، اور سب کو دکھایا تھا اور تاریخ میں یہ بات بھی مذکور ہے کہ جنگِ یمامہ جس کے بعد قرآن مجید ایک مصحف میں جمع کر کے لکھا گیا تھا، حضرت ابوبکر کی خلافت کے دوسرے سال پیش آئی تھی۔ مذکورہ بالا مطالب احادیث اور تاریخ کی بیشتر کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں، جن میں قرآن مجید کو ایک مصحف میں جمع کرنے اور اس کی کتابت کے واقعے کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

ان پچیس سالوں میں حضرت علی علیہ السلام کے چار خاص اصحاب اور دوستوں میں سے تین وفات پا گئے جو ہر حال میں آپؑ کی پیروی میں ثابت قدم رہے تھے، یعنی سلمان فارسیؓ، ابوذر غفاریؓ اور مقدادؓ۔ لیکن اسی مدت میں اصحاب اور تابعین کی ایک خاصی بڑی جماعت حجاز، یمن، عراق اور دوسرے ممالک میں حضرت علی علیہ السلام کے پیروکاروں میں شامل ہوگئی تھی اور آخرکار خلیفہ سوم کے قتل کے بعد ہر طرف سے عوام نے آپؑ کی طرف رجوع کرنا شروع کر دیا تھا، یہاں تک کہ آپؑ کے ہاتھ پر بیعت کر کے آپ کو خلافت کے لیے انتخاب کرلیا۔

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کی خلافت اور آپؑ کا طریقہ کار

حضرت علی علیہ السلام کی خلافت ۳۵ ہجری قمری کے آخر میں شروع ہوئی اور تقریباً چار سال پانچ مہینے جاری رہی۔ حضرت علی علیہ السلام نے اپنی خلافت کے دوران پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رویہ رائج کیا اور خود بھی اسی طریقے پر کاربند تھے (تاریخ یعقوبی، جلد دوم، ص ۱۵۴)۔ اسلام میں ان اکثر تبدیلیوں کو جو پہلے خلفائے راشدین کے زمانہ میں پیدا ہوگئی تھیں، اپنی اصلی حالت میں لے آئے اور اس کے ساتھ ہی ظالم اور نالائق حاکموں کو جو مدت سے عنانِ حکومت اپنے ہاتھوں میں لیے ہوئے تھے معزول کر دیا۔ (تاریخ یعقوبی، جلد دوم، صفحہ ۱۵۵۔ مروج الذہب، جلد۲، صفحہ ۳۶) یعنی حقیقت میں آپؑ کی حکومت ایک انقلابی تحریک تھی، مگر آپؑ کے سامنے مشکلات و مسائل کا ایک ڈھیر موجود تھا۔

حضرت علی علیہ السلام نے اپنی خلافت کے پہلے دن تقریر کرتے ہوئے یوں خطاب کیا تھا: ”خبردار! آپ لوگ جن مشکلات و مصائب میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے موقع پر گرفتار تھے، آج دوبارہ وہی مشکلات آپ کو درپیش ہیں اور انھی مشکلات نے پھر آپ کو لپیٹ میں لے لیا ہے۔ آپ کو چاہیے کہ اپنے آپ کو ٹھیک کرلیں اور

علم و فضیلت والے لوگوں کو سامنے آنا چاہیے جو پیچھے دھکیل دیے گئے ہیں اور وہ لوگ جو ناجائز اور بے جا طور پر سامنے آگئے ہیں، ان کو پیچھے ہٹا دینا چاہیے (آج حق و باطل کا مقابلہ ہے، جو شخص اہلیت و صلاحیت رکھتا ہے، اسے حق کی پیروی کرنی چاہیے)۔ اگر آج ہر جگہ باطل کا زور ہے تو یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے اور اگر حق کم ہو چکا ہے تو کبھی کبھی یوں ہوتا ہے کہ کم تعداد بھی آگے آجاتی ہے اور کامیابی حاصل کر لیتی ہے۔ ترقی کی اُمید بھی موجود ہے، البتہ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ جو چیز ایک دفعہ ہاتھ سے نکل جائے وہ پھر دوبارہ واپس آجائے۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۱۵)

حضرت علی علیہ السلام نے اپنی انقلابی حکومت جاری رکھی اور جیسا کہ ہر انقلابی تحریک کا خاصہ ہے کہ مخالف عناصر جن کے مفادات خطرے میں پڑ جاتے ہیں وہ ہر طرف سے اس تحریک کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں، بالکل ایسے ہی مخالفین نے خلیفۂ سوم کے قصاص کے نام پر داخلی انتشار اور خونی جنگوں کا ایک طویل سلسلہ شروع کر دیا اور تقریباً حضرت علی علیہ السلام کے تمام عہدِ خلافت کے دوران یہ سلسلہ جاری رہا۔ شیعوں کے مطابق ان جنگوں کے شروع کرنے والوں کے سامنے ذاتی فوائد اور مفادات کے سوا اور کوئی مقصد نہ تھا اور خلیفۂ سوم کا قصاص صرف ایک عوام فریب حربہ تھا اور اس میں حتیٰ کہ کسی قسم کی غلط فہمی بھی موجود نہ تھی۔[1]

---

(1) حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد جن لوگوں نے حضرت علی علیہ السلام کی پیروی میں خلیفۂ اوّل کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا، ان کی تعداد بہت کم تھی اور اس اقلیت میں بعض صحابہ کرام بھی تھے مثلاً حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت مقدادؓ اور حضرت عمار یاسرؓ وغیرہ۔ حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کے آغاز میں بھی ایک چھوٹی سی جماعت نے آپؑ کی بیعت کرنے سے انکار کیا تھا۔ ان انکار کرنے والوں اور مخالفین میں سے سعید بن عاص، ولید بن عقبہ، مروان بن حکم، عمرو بن عاص، بسر بن ارطاۃ، سمرہ بن جندب اور مغیرہ بن شعبہ وغیرہ تھے۔ ان دونوں فریقوں کی زندگی کے مطالعے اور ان کے کارناموں میں غور و خوض کرنے ←

پہلی جنگ کی وجہ جو جنگ جمل کے نام سے یاد کی جاتی ہے، طبقاتی امتیازات کے بارے میں مظاہرے تھے جو خلیفۂ اوّل کے زمانے میں بیت المال کی تقسیم میں اختلاف اور فرق کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔ حضرت علی علیہ السلام نے خلیفہ بننے کے بعد

یا ان داستانوں اور حکایتوں سے جو تاریخ میں ان کے بارے میں درج ہیں، ان کی دینی شخصیت اور مقاصد واضح ہو جاتے ہیں۔

پہلا فریق اور گروہ پیغمبر اکرم ﷺ کے خاص اور برگزیدہ اصحاب، زاہد، عابد، فداکار، جاں نثار اور اسلامی آزادی پسند افراد پر مشتمل تھا، اور یہ پیغمبر اکرم ﷺ کے سب سے زیادہ پسندیدہ لوگ تھے۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا تھا: اللہ تعالیٰ نے مجھے خبر دی ہے کہ خدا چار آدمیوں کو بہت ہی عزیز رکھتا ہے اور مجھے بھی حکم دیا ہے کہ ان کو عزیز رکھوں۔ صحابہ کرام نے ان کا نام پوچھا تو آپ نے تین مرتبہ فرمایا: "علی"، اور پھر ابوذرؓ، سلمانؓ اور مقدادؓ کا نام لیا۔ (سنن ابن ماجہ، جلد اوّل، ص ۶۶)

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: اگر عمار بن یاسرؓ کے سامنے دو کام رکھے جائیں تو وہ لازمی طور پر ان دونوں میں سے حقیقی اور بہتر کام کو انتخاب کریں گے۔ (سنن ابن ماجہ، جلد اوّل، ص ۶۶)

پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: ابوذرؓ سے زیادہ سچا آدمی زمین و آسمان میں موجود نہیں ہے۔ (سنن ابن ماجہ، جلد اوّل، ص ۶۸)

ان افراد سے ان کی زندگی میں ایک بھی ایسا کام سرزد نہیں ہوا، جو خلاف شرع ہو، انھوں نے کسی کا خون ناحق نہیں کیا۔ انھوں نے کسی شخص کے لیے کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کی، انھوں نے نہ کسی کا مال لوٹا نہ چرایا اور انھوں نے کبھی گم راہی اور بدعنوانی سے لوگوں کو گم راہ نہیں کیا۔ لیکن تاریخ دوسرے گروہ اور فریق کی تباہ کاریوں اور ظالمانہ اعمال سے بھری پڑی ہے اور انھوں نے جو ناحق خون کیے ہیں، مسلمانوں کے مال و اموال کو لوٹا ہے، جو شرمناک اعمال انجام دیے ہیں، وہ ان گنت اور بے شمار ہیں اور ان اعمال کی کسی طرح بھی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ سوائے اس کے کہ یوں کہا جائے (جیسا کہ ایک جماعت کہتی ہے) خدا ان سے راضی تھا اور جو کچھ وہ کرتے تھے، اپنے ہر عمل میں آزاد تھے اور اسلامی قوانین نے ان کو معاف کر دیا تھا اور یہ اسلامی قوانین جو قرآن مجید اور سنت پیغمبر اکرم ﷺ میں موجود ہیں، صرف دوسروں کے لیے نازل ہوئے تھے، نہ کہ ان کے لیے۔

بیت المال کو برابر اور مساوی طور پر لوگوں میں تقسیم کیا۔ (مروج الذہب، جلد۲، ص۳۹۲۔ نہج البلاغہ، خطبہ۱۲۲۔ تاریخ یعقوبی، جلد۲، ص۱۶۰۔ تاریخ ابن ابی الحدید، جلد۱، ص۱۸۰)

جیسا کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی سیرت اور روش بھی یہی تھی۔ اس طریقے سے زبیر اور طلحہ بہت ہی برہم ہوئے تھے اور انھوں نے نافرمانی کی بنیاد ڈالی تھی اور خانۂ کعبہ کی زیارت کے بہانے مدینہ سے مکہ چلے گئے۔ انھوں نے حضرت عائشہؓ کو جو اس وقت مکہ میں تھیں اور حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ ان کے اختلافات موجود تھے، اپنے ساتھ ملا لیا اور اس طرح خلیفۂ سوم کے قصاص کے نام پر خونی تحریک اور جنگ کا آغاز کیا جو جنگ جمل کے نام سے مشہور ہے۔ (تاریخ یعقوبی، جلد۲، ص۱۵۲۔ تاریخ ابی الفداء، جلد۱، ص۱۷۲۔ مروج الذہب، جلد۲، ص۳۶۶)

حالانکہ یہی طلحہ اور زبیر خلیفہ سوم کے مکان کے محاصرے اور قتل کے وقت مدینہ میں موجود تھے۔ اس وقت انھوں نے خلیفہ کا ہرگز دفاع نہیں کیا تھا (تاریخ یعقوبی، جلد۲، ص۱۵۲)۔ اور خلیفۂ سوم کے قتل کے فوراً بعد یہی لوگ تھے، جنھوں نے سب سے پہلے اپنی اور مہاجرین کی طرف سے حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کی تھی (تاریخ یعقوبی، جلد۲ ص۱۵۲۔ تاریخ ابی الفداء، جلد۱، ص۱۷۱)۔ اسی طرح حضرت عائشہؓ بھی خود ان لوگوں میں تھیں جنھوں نے خلیفۂ سوم کے قتل پر لوگوں کو اُبھارا تھا (تاریخ یعقوبی، جلد۲، ص۱۵۲)۔ اور جونہی انھوں نے خلیفۂ سوم کے قتل کی خبر سنی تھی تو ان کو گالیاں دی تھیں اور خوشی کا اظہار کیا تھا۔ بنیادی طور پر خلیفۂ سوم کے قتل کا اصلی سبب وہ صحابہ تھے، جنھوں نے مدینہ سے دوسرے شہروں میں خطوط لکھ کر لوگوں کو خلیفہ کے خلاف اُبھارا تھا۔

دوسری جنگ کی وجہ جس کا نام جنگ صفین تھا اور تقریباً ڈیڑھ سال تک جاری رہی، وہ خواہش اور آرزو تھی، جو معاویہ اپنی خلافت کے لیے رکھتا تھا اور خلیفۂ سوم کے

قصاص کے عنوان سے اس نے اس جنگ کو شروع کیا تھا اور اس جنگ میں ایک لاکھ سے زیادہ افراد ناحق ہلاک ہوگئے۔ البتہ اس جنگ میں معاویہ حملہ کرتا تھا، نہ کہ دفاع کیونکہ قصاص ہرگز دفاع کی صورت میں نہیں ہوسکتا۔

اس جنگ کا عنوان اور سبب خلیفۂ سوم کا قصاص تھا حالانکہ خود خلیفۂ سوم نے اپنی زندگی کے آخری ایام اور شورش و بغاوت کے زمانے میں معاویہ سے مدد کی درخواست کی تھی اور اس نے بھی ایک جرار لشکر کے ساتھ مدینہ کی طرف حرکت کی تھی لیکن راستے میں جان بوجھ کر اس قدر دیر کی کہ ادھر خلیفہ کو قتل کردیا گیا۔ پھر اس واقعہ کے بعد وہ راستے سے ہی شام کی طرف واپس لوٹ گیا اور وہاں جاکر خلیفہ کے قصاص کا دعویٰ شروع کردیا تھا۔[1]

اسی طرح جب حضرت علی علیہ السلام شہید ہوگئے اور معاویہ نے خلافت پر قبضہ کرلیا تو اس وقت اس نے خلیفہ کے قصاص کو فراموش کردیا تھا اور خلیفہ کے قاتلوں کو سزا نہیں دی تھی اور نہ ہی ان پر مقدمہ چلایا تھا۔

جنگ صفین کے بعد نہروان شروع ہوگئی اور اس جنگ میں لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد جن میں اصحاب رسول بھی تھے، معاویہ کی تحریص و ترغیب کی وجہ سے حضرت علی علیہ السلام کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے اسلامی ممالک میں ہنگامے اور آشوب برپا کردیے تھے، لہٰذا جب کہیں حضرت علی علیہ السلام کے پیروکاروں یا

---

① جب حضرت عثمان مظاہرین کے نرغے اور محاصرے میں تھے تو انھوں نے ایک خط لکھ کر معاویہ سے مدد کی درخواست کی تھی اور معاویہ بھی بارہ ہزار سپاہیوں کا ایک لشکر لے کر فوراً مدینہ کی طرف چل پڑا لیکن ساتھ ہی اپنی فوج کو حکم دیا کہ شام کی ہی حدود میں ٹھہر جائے اور خود عثمان کے پاس آیا اور لشکر کی تیاری کے متعلق رپورٹ دی۔ عثمان نے کہا: تم نے جان بوجھ کر فوج کو وہاں ٹھہرایا ہے تاکہ میں قتل ہوجاؤں اور پھر میرے قصاص کا بہانہ بنا کر بغاوت کردو۔ (تاریخ یعقوبی، جلد ۲، ص ۱۵۲۔ مروج الذہب، جلد ۳، ص ۲۵۔ تاریخ طبری، ص ۴۰۲)

جانب داروں کو دیکھتے فوراً اُن کو قتل کر دیتے تھے، حتیٰ کہ حاملہ عورتوں کے پیٹ پھاڑ کر بچوں کو نکال کر ان کا سر قلم کر دیتے تھے۔ حضرت علی علیہ السلام نے اس آشوب کا بھی خاتمہ کر دیا تھا، لیکن تھوڑے عرصے کے بعد کوفہ کی مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے ایک خارجی کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ (مروج الذہب، جلد ۲، ص ۴۱۵)

حضرت علی علیہ السلام کی پانچ سالہ خلافت کے دوران شیعوں نے جو استفادہ کیا

اگرچہ حضرت علی علیہ السلام اپنی چار سالہ اور نو مہینے کی خلافت کے دوران اسلامی حکومت کے درہم برہم حالات کو مکمل طور پر سنبھالا نہ دے سکے اور اس کو اپنی پہلی حالت میں لانے میں کامیاب نہ ہو سکے، لیکن تین طرح سے ان کو کامیابی ہوئی:

① آپ نے اپنی منصفانہ سیرت کے ذریعے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پُر کشش اور ہر دلعزیز شخصیت کو عوام اور خاص طور پر جدید نسل کے سامنے پیش کیا اور معاویہ کی شاہانہ شان و شوکت کے مقابلے میں آپ ہمیشہ غریبوں اور فقیروں کی طرح اور بے کس و نادار افراد کی مانند زندگی گزارتے تھے اور ہرگز اپنے دوستوں، خویش و اقارب اور خاندان کے افراد کو دوسروں پر ترجیح نہیں دیتے تھے اور امیر کو غریب پر یا طاقتور کو کمزور پر فوقیت نہیں بخشتے تھے۔

② ان تمام طاقت فرسا اور طولانی مشکلات کے باوجود آپ نے معارف الٰہی اور علوم انسانی کے گراں بہا اور قیمتی ذخائر یادگار چھوڑے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام کے مخالفین کا دعویٰ ہے کہ آپ بڑے بہادر اور شجاع انسان تھے لیکن اچھے سیاست دان نہیں تھے کیونکہ اپنی خلافت کے اوائل میں مخالف عناصر کے ساتھ وقتی طور پر صلح کر کے ان کو راضی رکھ سکتے تھے اور اس طرح اپنی خلافت کو محکم اور مضبوط بنانے کے بعد ان کا قلع قمع کر سکتے تھے۔

لیکن انھوں نے اس نکتے کو نظر انداز اور فراموش کر دیا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام

کی خلافت ایک انقلابی تحریک تھی اور ایک انقلابی تحریک کو بے جا تعریف، چاپلوسی، ظاہرداری اور ریاکاری سے دُور رہنا چاہیے۔ ایسی ہی حالت پیغمبر اکرم ﷺ کے زمانے میں بھی پیش آئی تھی کہ کفار و مشرکین نے کئی بار آنحضرت ﷺ کو تجویز پیش کی تھی کہ اگر آنحضرت ﷺ ان کے خداؤں کی مخالفت اور توہین نہ کریں یا ان کو بُرا بھلا نہ کہیں تو وہ بھی ان کی دعوت اور تحریک کی مخالفت نہیں کریں گے۔ لیکن پیغمبر اکرم ﷺ نے ان کی یہ تجویز مسترد کر دی تھی حالانکہ ان سخت حالات میں ان کی تعریف کر کے یا ان کے ساتھ بنا کر رکھتے ہوئے اپنی حالت اور طاقت کو مضبوط بنا سکتے تھے اور پھر دشمنوں کی مخالفت کر کے ان کے قلع قمع بھی کر سکتے تھے۔ لیکن حقیقت میں ایک اسلامی اور انقلابی تحریک ہرگز یہ اجازت نہیں دے سکتی کہ ایک حقیقت کو زندہ کرنے کے لیے دوسری حقیقت کو مٹایا یا پامال کر دیا جائے اور ایک باطل کو دوسرے باطل کے ذریعے رفع کیا جائے اور قرآن میں بہت سی آیات اس بارے میں موجود ہیں۔[1]

لیکن اس کے برعکس حضرت علی علیہ السلام کے مخالفین اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرنے کی خاطر کسی بھی جرم، غداری اور اسلامی قوانین کی واضح اور علانیہ (بغیر استثناء) کے خلاف ورزی کو نظر انداز نہیں کرتے تھے اور ہر بدنامی کو اپنے صحابی اور مجتہد ہونے کے بہانے سے دھو ڈالتے تھے لیکن حضرت علی علیہ السلام اسلامی قوانین پر سختی سے کاربند تھے۔

حضرت علی علیہ السلام سے متفرقہ عقلی، دینی اور اجتماعی علوم و فنون کے بارے میں

---

① آیہ کریمہ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ (سورۂ ص:۶) اور آیہ کریمہ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا (سورۂ اسراء:۷۴) اور آیہ کریمہ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (سورۂ قلم:۹) ان آیات کریمہ کی شانِ نزول کے بارے میں حدیثی تفسیر کی طرف رجوع کریں۔

گیارہ ہزار چھوٹے لیکن پُرمعنی فقرے موجود ہیں (کتاب الغزر والدرر آمدی و متفرقات جوامع الحدیث)۔ انھوں نے اپنی تقریروں کے دوران اسلامی علوم وفنون کو بہت ہی فصیح و بلیغ اور سلیس و رواں زبان میں بیان کیا ہے۔ (مروج الذہب، جلد۲، ص ۴۳۱۔ تاریخ ابن ابی الحدید، جلد اوّل، ص ۱۸۱۔ اشباہ و نظائر سیوطی، درنحو، جلد۲۔ تاریخ ابی الحدید، جلد اوّل، ص ۶)

انھوں نے عربی زبان کی گرامر بھی لکھی تھی اور اس طرح عربی زبان و ادبیات کی بنیاد ڈالی تھی۔ آپؑ اسلام میں سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے خدائی اور دینی فلسفے پر غور وخوض کیا تھا۔ (نہج البلاغہ سے رجوع کریں)

آپ ہمیشہ آزاد استدلال اور منطقی دلائل کے ساتھ بات کیا کرتے تھے اور وہ مسائل جن پر دنیا کے فلاسفروں نے اس وقت تک توجہ نہ دی تھی، آپؑ نے ان کو پیش کیا اور اس بارے میں اس قدر توجہ اور انہماک مبذول فرماتے تھے کہ حتیٰ عین جنگ کے دوران بھی آپؑ علمی بحث ومباحثہ میں مشغول رہتے تھے۔[1]

(۳) آپؑ نے اسلامی، مذہبی اور دینی دانشوروں کی ایک بہت بڑی جماعت کی تربیت کی تھی کہ ان افراد کے درمیان بہت ہی پارسا، زاہد اور اہلِ علم ومعرفت لوگ مثلاً اویس قرنی، کمیل بن زیاد، میثم تمار اور رشید ہجری وغیرہ موجود تھے، جو اسلامی عرفا

---

[1] جنگ جمل کے دوران ایک عربی شخص نے حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: یاامیرالمومنین! آپ کہتے ہیں کہ خدا ایک ہے؟ لوگوں نے ہر طرف سے اس پر اعتراضات کیے اور کہنے لگے: "اے عربی، کیا تو حضرت علی علیہ السلام کی پریشانی اور تشویق کو نہیں دیکھ رہا ہے کہ علمی بحث کرنا چاہتا ہے؟ حضرت علی علیہ السلام نے اپنے اصحاب سے فرمایا: اس آدمی کو اپنے حال پر چھوڑ دو، کیونکہ اس قوم کے ساتھ جنگ سے بھی میرا مقصد عقائد اور دینی مقاصد کو واضح کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے"۔ اس کے بعد اس عربی شخص کے سوال کا جواب دینا شروع کر دیا۔ (بحار الانوار، جلد۲، ص ۶۵)

اور علما میں علم و عرفان کے سرچشمے مانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک دوسری جماعت تیار کی جس میں سے بعض لوگ علمِ فقہ، علمِ کلام، علم تفسیر اور علمِ قرأت وغیرہ میں اپنے زمانے کے بہترین علما اور اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ (تاریخ ابن ابی الحدید، ج اوّل، ص ۲۶۴)

خلافت کا معاویہ کی طرف چلے جانا اور پھر موروثی سلطنت میں تبدیل ہونا

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد آپؑ کی وصیت اور عوام کی بیعت کے مطابق حضرت امام حسن بن علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے خلافت سنبھالی جو بارہ امامی شیعوں کے دوسرے امام ہیں۔ لیکن ادھر معاویہ آرام سے نہیں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے عراق پر چڑھائی کردی جو اس زمانے میں خلافت کا مرکز تھا اور حضرت امام حسن ابن علی علیہ السلام کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا۔

معاویہ نے مختلف فریبوں، حیلوں اور بہانوں سے اور بہت زیادہ مال و دولت خرچ کرکے آہستہ آہستہ حضرت امام حسن بن علی علیہ السلام کے طرف داروں اور اصحاب کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور آخرکار امام حسن علیہ السلام کو مجبور کردیا کہ صلح کے عنوان سے خلافت کو معاویہ کے حوالے کردیں اور امام حسن بن علی علیہ السلام نے بھی اس شرط پر کہ معاویہ کی وفات کے بعد خلافت دوبارہ انھیں واپس لوٹا دی جائے اور ساتھ ہی ان کے دوستوں اور پیروکاروں پر بھی کسی قسم کا جبر و تشدد یا ظلم نہ ہو، خلافت معاویہ کے سپرد کردی تھی۔ (تاریخ یعقوبی، جلد۲، ص ۱۹۱ اور دوسری تمام کتب تواریخ)

۴۰ ہجری میں معاویہ نے خلافت پر قبضہ کرلیا اور فوراً عراق آیا۔ اس نے اپنی تقریر میں لوگوں کو متنبہ کیا اور کہا: ''میں تمھارے ساتھ نماز، روزہ کے لیے جنگ نہیں کرتا تھا بلکہ میں چاہتا تھا کہ تم پر حکومت کروں اور اب میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا ہوں''۔ اور پھر کہا: میں نے (امام) حسنؑ کے ساتھ جو معاہدہ کیا تھا، وہ اب

باطل اور منسوخ ہو چکا ہے۔ (تاریخ ابن ابی الحدید، جلد۴، ص ۱۶۰۔ تاریخ طبری، جلد۴، ص ۱۲۴۔ تاریخ ابن اثیر، جلد۳، ص ۲۰۳)

معاویہ نے اپنی تقریر میں اشارہ کیا کہ وہ سیاست کو دین سے الگ اور جدا کردے گا اور اس طرح دینی قوانین کے بارے میں بھی کوئی ضمانت نہیں دے گا، البتہ یہ واضح ہے کہ ایسی حکومت، سلطنت اور بادشاہت ہے، نہ کہ خلافت یا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ جو معاویہ کے پاس پہنچے تھے اور اس کے دربار میں رسائی حاصل کر سکے تھے، انھوں نے بادشاہ کی طرح اس کو سلام کیا تھا (تاریخ یعقوبی، جلد۲، ص ۱۹۳) اور وہ خود بھی بعض خصوصی مجالس میں اپنی حکومت کو خصوصی ملکیت اور بادشاہی سے تعبیر کیا کرتا تھا۔ (تاریخ یعقوبی، جلد۲، ص ۲۰۲)

اگرچہ عام اور ظاہری طور پر لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو خلیفہ ہی کہا کرتا تھا لیکن وہ بادشاہی یا سلطنت جو زور اور طاقت کے بل بوتے پر قائم ہو، اس میں وراثت خود بخود آجاتی ہے اور آخرکار اس نے اپنی نیت اور خواہش کو جامۂ عمل پہنایا اور اپنے بیٹے یزید کو جو ایک بہت ہی لاابالی، آوارہ اور عیاش شخص تھا، اسے ذرہ برابر بھی دینی شعور نہ تھا اور نہ ہی کوئی مذہبی شخصیت رکھتا تھا، اپنا جانشین اور ولی عہد بنایا۔[1] جس نے اپنی حکومت اور سلطنت کے دوران اس قدر شرمناک حوادث و واقعات کو جنم دیا کہ قیامت تک تاریخ اس سے شرمندہ رہے گی۔

---

[1] یزید ایک عیاش اور شہوت پرست انسان تھا جو ہمیشہ شراب کے نشے میں چور رہتا تھا۔ وہ بڑے قیمتی اور عریاں لباس پہنا کرتا تھا۔ وہ کتوں اور بندروں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ اس کی راتوں کی محفلیں، ساز و آواز اور رقص و سرود کے ساتھ شروع ہوتی تھیں۔ اس کے ایک بندر کا نام ابوقیس تھا، اسے وہ قیمتی لباس پہنایا کرتا تھا اور شراب کی محفل میں اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا کرتا تھا۔ کبھی کبھی اسے گھوڑے پر سوار کر کے گھوڑدوڑ کے مقابلے کے لیے بھیجا کرتا تھا۔ (تاریخ یعقوبی، جلد۲، ص ۱۹۶۔ مروج الذہب، جلد۳، ص ۷۷)

معاویہ اپنے بیانات میں ہمیشہ اشارہ کیا کرتا تھا کہ وہ کبھی حسنؑ کو دوبارہ خلیفہ نہیں بننے دے گا اور خلافت کے بارے میں اپنے مرنے سے پہلے اس کے دماغ میں کچھ اور ہی خیال ہے اور یہ وہی خیال تھا، جس کے ذریعے اس نے امام حسنؑ کو زہر دے کر شہید کرا دیا تھا۔ (مروج الذہب، جلد۳، ص ۵۔ تاریخ ابوالفدا ء، جلد اوّل، ص ۱۸۳)

اس طرح اپنے بیٹے یزید کے لیے راستہ ہموار کر دیا تھا۔ معاویہ نے اپنے معاہدے کو توڑ کر عوام کو سمجھا دیا تھا کہ وہ کبھی بھی اہلِ بیتؑ کے شیعوں کو امن و امان کے ماحول میں زندگی گزارنے کی اجازت نہیں دے گا تاکہ پہلے کی طرح اپنی دینی سرگرمیاں جاری رکھ سکیں اور آخرکار اس نے اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنایا۔ (النصائح الکافیہ ص ۷۲۔ کتاب الاحداث سے نقل کیا گیا ہے)

اس نے اعلان کیا کہ جو شخص بھی اہلِ بیتؑ کی تعریف اور شان میں کوئی حدیث بیان کرے گا، اس کے جان و مال کی حفاظت کی کوئی ضمانت نہیں دی جائے گی۔① اس طرح اس نے حکم دیا کہ جو شخص تمام اصحابِ رسولؐ اور خلفا کی تعریف میں کوئی حدیث بیان کرے گا، اس کو بہت زیادہ انعام و اکرام دیا جائے گا۔ اس حکم کے نتیجے میں صحابہ کی شان میں بہت زیادہ احادیث گھڑلی گئیں۔ (النصائح الکافیہ، ص ۷۲-۷۳)

اس نے حکم دیا کہ تمام اسلامی ممالک میں منبروں پر خطبوں کے دوران حضرت علی علیہ السلام کو گالیاں دی جائیں (اور یہ حکم اُموی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز ۹۹-۱۰۱ ہجری قمری کے زمانے تک جاری رہا) اس نے اپنے مددگاروں اور پیروکاروں کی مدد اور کوشش کے ذریعے جن میں بعض اصحابِ رسول بھی تھے، حضرت علی علیہ السلام کے شیعوں

---

① ابوالحسن مدائنی اپنی کتاب "الاحداث" میں فرماتے ہیں: کتب معاویة نسخة واحدة الی عماله بعد عام الجماعة انی برءت الذمه ممن روی شیئًا من فضل ابی تراب واهل بیته کتاب النصائح الکافیۃ تالیف محمد بن عقیل، طبع نجف، ۱۳۸۶ھ، ص ۸۷ اور پھر النصائح الکافیہ، ص ۱۹۴۔

اور خاص پیروکاروں کو ہلاک کروا دیا تھا اور ان میں سے بعض کے سروں کو نیزوں پر چڑھا کر شہروں میں پھرایا تھا۔ وہ عام شیعوں کو جہاں کہیں بھی دیکھتا تکلیفیں، آزار اور شکنجے دیا کرتا تھا اور ان کو تلقین وتاکید کی جاتی تھی کہ وہ حضرت علی علیہ السلام کی پیروی کرنے سے باز رہیں اور جو شخص اس حکم کو قبول نہ کرتا اسے قتل کر دیا جاتا۔ (النصائح الکافیہ، ص ۵۸، ۶۴، ۷۷، ۷۸)

شیعوں کے لیے سب سے مشکل زمانہ

شیعہ افراد اور شیعہ مذہب کے لیے تاریخ میں سب سے مشکل حالات معاویہ کی بیس سالہ حکومت کے دوران تھے، جس وقت شیعوں کے لیے کسی قسم کا امن وچین موجود نہ تھا۔ اسی دوران میں اکثر شیعہ حضرات معروف اور مشہور ہو چکے تھے۔ ادھر شیعوں کے دو امام (امام دوم اور امام سوم) معاویہ کے زمانے میں حالات کو بہتر بنانے اور خلافت کو لوٹانے میں بے بس اور بے اختیار تھے۔ حتیٰ کہ شیعوں کے تیسرے امام (امام حسینؑ) یزید کی سلطنت کے پہلے چھ مہینوں کے دوران ہی اس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ آپؑ اپنے دوستوں اور اصحاب واولاد کے ساتھ یزید کی مخالفت کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ امیر معاویہ کی آخری دس سالہ خلافت کے دوران اس کام کا امکان بھی نہ تھا کہ خلافت پھر دوبارہ اہل بیتؑ کو واپس مل جائے۔

اہل سنت کے اکثر افراد اس قسم کی خلاف ورزیوں اور ناحق قتل وغارت کو جو بعض اصحاب رسولؐ اور خصوصاً معاویہ کے ہاتھوں ہوئیں اس طرح توجیہ کرتے ہیں کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب تھے اور اصحاب رسولؐ مجتہد ہوتے ہیں اور پیغمبر اکرمؐ کی احادیث کے مطابق ہر کام میں مجتہد معذور ہوتے ہیں، لہٰذا خدا ان سے راضی ہے اور ہر قسم کا جرم اور قتل جو ان سے سرزد ہوتا ہے، خداوند تعالیٰ اس کا حساب نہیں لیتا اور وہ بخش دیے جاتے ہیں، لیکن شیعہ اس عذر کو تسلیم نہیں کرتے۔

سب سے پہلے تو یہ بات معقول اور پسندیدہ نظر نہیں آتی کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسا ایک عوامی اور معاشرتی رہبر ایک جماعت یا گروہ کو عدل و آزادی کی خاطر اپنا ہم عقیدہ بنائے اور ان کو ظلم و ستم کے خلاف اُبھارے اور ساتھ ہی اپنی تمام زندگی اسی مقدس اور پاک مقصد کی خاطر وقف کر دے اور اپنے خدائی نظریے کو عملی جامہ پہنائے لیکن جب اپنے مقصد اور مطلب کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو اپنے دوستوں اور اصحاب کو عوام اور مقدس قوانین کے بارے میں مکمل آزادی دے دے تاکہ ہر قسم کی حق کشی، خلاف ورزی، تخریب کاری اور لاقانونیت وغیرہ ان کے لیے معاف ہی ہو۔ اس کا مطلب یوں ہوگا کہ اس رہبر نے جن ہاتھوں سے اور جن ذرائع سے ایک عظیم الشان عمارت کی بنیاد رکھی تھی، انھی ہاتھوں سے اس کو تباہ اور خراب کر دے۔

دوسرے یہ کہ وہ روایات اور احادیث جن سے صحابہ کرام کو مقدس، پاک اور ان کے ہر ناجائز اعمال کو صحیح اور جائز کہا جاتا ہے اور ایسے ہی ان کو قابلِ بخشش سمجھا جاتا ہے، وہ خود صحابہ ہی سے ہم تک پہنچی ہیں یا ان سے منسوب کری گئی ہیں۔ تاریخی شہادت کے مطابق خود صحابہ آپس میں ایک دوسرے کے بارے میں اس قسم کی معذوریت اور بخشش کے قائل نہیں تھے، کیونکہ یہ اصحاب ہی تھے، جنھوں نے سب سے پہلے ایک دوسرے کو بدنام کرنے اور ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہنے کے لیے زبان کھولی تھی اور ایک دوسرے کے عیوب اور اشتباہات کو بالکل نظرانداز نہیں کرتے تھے۔

مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں خود صحابہ کی گواہی کے مطابق بھی یہ روایات و احادیث صحیح نہیں ہیں اور اگر ٹھیک، درست اور صحیح ہوں بھی تو ان کے معنی بھی دوسرے ہوں گے اور ان سے صحابہ کی تقدیس (مقدس اور پاک ہونے) یا قابلِ بخشش ہونے کا مقصد ہرگز نہیں ہوگا۔

اور اگر فرض کریں کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کے بارے میں کسی وقت اپنے کلام

پاک میں ان کی خدمت دین کے صلے میں یا کوئی خدائی فرمان جاری اور نافذ کرنے کی خاطر ان سے راضی ہو جانے کا اعلان فرمایا ہے۔[1] تو اس کا مطلب ان اصحاب کی گزشتہ فرماں برداری اور اطاعت کی قدردانی ہوگا نہ کہ آئندہ اور مستقبل میں ہر قسم کی نافرمانی اور خلاف ورزی یا اپنی مرضی سے کام کرنے کی اجازت کے متعلق تصدیق۔

بنو اُمیہ کی سلطنت کا قیام

۶۰ ہجری قمری میں معاویہ فوت ہو گیا اور اس کے بیٹے یزید نے اس بیعت کے مطابق جو اس کے باپ نے اس کے لیے عوام سے حاصل کی تھی، اسلامی حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔

تاریخی شہادت کے مطابق یزید کوئی دینی شخصیت نہ رکھتا تھا، وہ ایک ایسا جوان تھا جو حتیٰ کہ اپنے باپ کی زندگی میں بھی اسلامی قوانین و اصول کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتا تھا بلکہ عیاشی، لاقانونیت اور شہوت رانی کے سوا اسے کوئی کام ہی نہ تھا۔ اس نے اپنی تین سالہ حکومت کے دوران ایسی تباہی اور بربادی مچائی اور ایسے جرائم کا مرتکب ہوا جن کی مثال تاریخ اسلام میں ہرگز نہیں ملتی۔ اگرچہ اسلامی تاریخ میں اس سے پہلے بہت سے فتنے منظر عام پر آچکے تھے مگر یزید ان سب پر بازی لے گیا تھا۔

اس نے اپنی حکومت کے پہلے سال میں حضرت امام حسین بن علی علیہ السلام کو جو

---

[1] وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (سورۂ توبہ:۱۰۰) "اور مہاجرین اور انصار میں سے (ایمان کی طرف) سبقت کرنے والے اور وہ لوگ جنھوں نے نیک نیتی سے (قبولِ ایمان میں) ان کا ساتھ دیا، خدا ان سے راضی اور وہ خدا سے خوش اور ان کے واسطے خدا نے وہ (ہرے بھرے) باغ جن کے نیچے نہریں جاری ہیں تیار کر رکھے ہیں وہ ہمیشہ ابدالآباد تک ان میں رہیں گے، یہی تو بڑی کامیابی ہے۔"

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسے تھے، ان کے اصحاب و اولاد، بچوں اور عورتوں سمیت بڑی بے دردی اور بے رحمی سے شہید کر دیا تھا اور اہلِ بیتؑ کی عورتوں کو شہیدوں کے سروں کے ساتھ شہر بہ شہر پھرایا تھا۔ (تاریخ یعقوبی، جلد۲، ص ۲۱۶۔ تاریخ ابوالفدا، جلد اول، ص ۱۹۰۔ مروج الذہب، جلد۳، ص ۶۴، اور دوسری تواریخ)

پھر دوسرے سال اس نے مدینہ منورہ میں قتلِ عام کیا اور عوام کے مال و جان کو تین دن تک کے لیے اپنی افواج پر حلال کر دیا تھا (تاریخ یعقوبی، جلد۲، ص ۲۴۳۔ تاریخ ابوالفدا، جلد اول، ص ۱۹۲۔ مروج الذہب، جلد۳، ص ۷۸) اور تیسرے سال خانہ کعبہ کو گرا کر آگ لگا دی تھی۔ (تاریخ یعقوب، جلد۲، ص ۲۲۴۔ تاریخ ابوالفدا، جلد اول، ص ۱۹۲۔ مروج الذہب، جلد۳، ص ۸۱)

یزید کے بعد بنواُمیہ کے خاندان آلِ مروان نے حکومت اپنے ہاتھ میں لی جیسا کہ تاریخ میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ اس خاندان کے گیارہ حکمرانوں نے تقریباً ۷۰ سال تک حکومت کی۔ انھوں نے مسلمانوں اور اسلام کے لیے بدترین اور مشکل ترین حالات پیدا کر دیئے تھے، لہٰذا اس زمانے میں اسلامی ممالک میں ایک استبدادی اور ظالمانہ بادشاہی وجود میں آ گئی تھی جس کو اسلامی خلافت کا نام دیا گیا تھا اور ان کی حکومت کے دوران حالات یہاں تک پہنچ گئے تھے کہ خلیفۂ وقت جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جانشین اور دینِ مبین کا حامی سمجھا جاتا تھا، اس نے فوراً فیصلہ کیا کہ خانہ کعبہ کے اُوپر ایک بارہ دری بنائے تاکہ زمانۂ حج میں وہاں بیٹھ کر خاص طور پر عیاشی کر سکے۔ (ولید بن یزید، تاریخ یعقوبی، جلد۳، ص ۷۳۔ اِذَا مَا جِئۡتَ رَبَّکَ یَوۡمِ بَعۡثٍ فَقُلۡ یَا رَبِّ مَزَّقَنِیۡ الوَلِیۡد)

خلیفۂ وقت نے قرآنِ مجید کو تیر کا نشانہ بنایا اور قرآنِ مجید کے متعلق ایک نظم لکھی جس میں کہا گیا تھا:

"اے قرآن! قیامت کے دن جب تو اپنے خدا کے حضور حاضر ہوگا تو اس وقت خدا سے کہنا کہ خلیفہ نے مجھے پھاڑ دیا تھا"۔
(ولید بن یزید، مروج الذہب، جلد۳، ص ۲۲۸)

البتہ شیعہ جو اہلِ سنت سے بنیادی طور پر خلافت اور دینی رہبری کے دو مسائل میں اختلافِ نظر رکھتے تھے، اس تاریک دور میں سخت مشکل حالات میں زندگی گزارتے تھے لیکن اس زمانے کی حکومتوں کے ظلم و ستم اور لاقانونیت کے طریقوں اور دوسری طرف اہلِ بیتؑ کے اماموں کی مظلومیت، طہارت، تقویٰ و پاکی وغیرہ، ان کو اپنے عقائد میں مضبوط اور محکم کر رہے تھے اور خصوصاً شیعوں کے تیسرے امام حضرت امام حسین علیہ السلام کی دل خراش شہادت شیعوں کی افزائش کا باعث بنی اور خاص کر مرکزِ خلافت (دارالخلافہ) سے دُور دراز علاقوں مثلاً عراق، یمن اور ایران میں۔

اس دعویٰ کا ثبوت یہ ہے کہ شیعوں کے پانچویں امامؑ کے زمانۂ امامت میں جب کہ پہلی صدی ہجری ابھی ختم نہیں ہوئی تھی اور تیسرے امامؑ کی شہادت کو چالیس سال بھی نہیں ہوئے تھے۔ اُموی حکومت میں کمزوری اور ضعف کے باعث شیعہ اسلامی ممالک کے کونے کونے سے پانچویں امامؑ کے اردگرد جمع ہونا شروع ہو گئے تھے تاکہ علمِ حدیث اور علمِ دین حاصل کر سکیں۔ (بحث امام شناسی، مروج الذہب، جلد۳، ص ۲۲۸)

ابھی پہلی صدی ہجری اختتام کو نہیں پہنچی تھی کہ حکومت کے چند ایک اعلیٰ عہدیداروں نے ایران میں شہر قم کی بنیاد رکھی اور اس شہر میں شیعوں کو لا کر آباد کیا۔ (معجم البلدان، مادۂ قم) لیکن اس کے باوجود شیعہ چھپ چھپا کر اور اپنے مذہب کا اعلان کیے بغیر زندگی گزارتے رہے۔ اس دَوران کئی بار علوی سادات نے اپنے اپنے زمانے کی حکومتوں کے ظلم و ستم اور دباؤ کے خلاف تحریکیں شروع کیں لیکن ان کو ہر بار شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور آخرکار اس راہ میں اپنی جان کی بازی لگاتے رہے مگر اس

وقت کی حکومتوں نے ان کے جان و مال کو پامال کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ حضرت زید بن علیؑ جو شیعہ زیدیہ کے امام تھے، ان کی نعش کو قبر سے نکال کر سولی چڑھایا گیا اور یہ لاش تین سال تک سولی پر لٹکتی رہی۔ اس کے بعد لاش کو سولی سے اُتار کر آگ میں جلا دیا گیا اور راکھ کو ہوا میں اُڑا دیا گیا (مروج الذہب، جلد۳، ص ۲۰۷-۲۱۹۔ تاریخ یعقوبی، جلد۳، ص ۶۶)۔ یہاں تک کہ اکثر شیعہ جو چوتھے اور پانچویں امام کے معتقد اور پیروکار تھے بنواُمیہ کے ہاتھوں زہر دے کر شہید کر دیئے گئے اور اسی طرح امام دومؑ اور امام سومؑ کی شہادت بھی انہی کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ (بحار الانوار، جلد۱۲، اور دوسری تمام شیعہ دستاویزات)

اموییوں کے ظلم و ستم اس قدر واضح اور زیادہ تھے کہ اکثر اہلِ سنت کے افراد اگرچہ عام طور پر خلفا کی اطاعت کو اپنا فرض سمجھتے تھے لیکن ان کے ظلم و ستم کی وجہ سے مجبور ہو گئے کہ خلفا کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیں یعنی خلفائے راشدین جو پہلے چار خلفا تھے اور پیغمبر اکرم ﷺ کی وفات کے بعد آپؐ کے جانشین بنے (ابوبکر، عمر، عثمان، علیؑ) اور خلفائے راشدین کے علاوہ دوسرے خلفا جو معاویہ سے شروع ہوتے ہیں۔

اُموی خاندان اپنی حکومت میں ظلم و ستم اور بیداوگری و لاقانونیت کی وجہ سے لوگوں کے لیے باعثِ نفرت بن چکا تھا۔ اُمویوں کی شکست اور اس خاندان کے آخری خلیفہ کے قتل کے بعد خلیفہ کے دو بیٹے اپنے خاندان کے ہمراہ دارالخلافہ سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتے ان کو پناہ نہیں ملتی تھی۔ آخرکار پریشانی اور سرگردانی کی حالت میں نوبہ، حبشہ اور بجاوہ کے میدانوں اور صحراؤں میں اس خاندان کے اکثر افراد بھوک اور پیاس سے ہلاک ہو گئے، لیکن جو افراد بچے وہ یمن کے جنوبی حصے میں پہنچ گئے اور لوگوں سے راستے کا خرچ حاصل کرنے کے لیے گداگری کیا کرتے تھے۔ ذی حمالان شہر سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے اور وہاں جا کر

لوگوں کے درمیان روپوش ہو گئے۔ (تاریخ یعقوبی، جلد۳،ص۸۴)

دوسری صدی ہجری کے دوران شیعوں کی حالت

دوسری صدی ہجری کی پہلی تہائی کے آخر میں تمام اسلامی ممالک میں بنوامیہ حکومت کے ظلم وستم اور بدسلوکی کی وجہ سے جو انقلابات اور خونی جنگیں ہوئیں، ان میں پیغمبر اکرم ﷺ کے اہلِ بیتؑ کے نام پر ایران کے مشرقی صوبے خراسان میں بھی ایک تحریک نے جنم لیا۔ اس تحریک کا رہنما ایک ایرانی سپہ سالار اور جرنیل ابو مسلم مروزی تھا، جس نے اُموی خلافت کے خاتمے کے لیے تحریک شروع کی تھی اور اپنی اس انقلابی تحریک میں کافی ترقی اور کامیابی حاصل کرلی تھی، یہاں تک کہ اُموی خلافت یا سلطنت کا خاتمہ کردیا۔ (تاریخ یعقوبی، جلد۳،ص ۷۹۔ تاریخ ابوالفداء، جلداوّل،ص۲۰۸اور دوسری تواریخ)

یہ تحریک اور انقلاب اگرچہ زیادہ تر شیعہ مذہب کے پروپیگنڈوں پر منحصر تھا اور تقریباً اہلِ بیتؑ کے شہیدوں کے انتقام کے عنوان سے اہلِ بیتؑ کے ایک پسندیدہ شخص کے لیے بیعت لیا کرتے تھے (مگر اس شخص کا نام نہیں لیا جاتا تھا) لیکن اس کے باوجود شیعہ اماموں کا نہ تو اس کام کے لیے حکم تھا اور نہ ہی انھوں نے اس کے لیے کوئی اشارہ کیا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب ابومسلم نے امام ششم کا نام مدینہ میں بیعت کے لیے پیش کیا تو انھوں نے سختی سے اس تجویز کو رد کردیا تھا اور فرمایا تھا: ''تو میرے آدمیوں (پیروکاروں) میں سے نہیں ہے اور یہ زمانہ بھی میرا زمانہ نہیں ہے''۔ (تاریخ یعقوبی، جلد۳،ص ۸۶۔ مروج الذہب، جلد۳،ص ۲۶۸)

آخرکار بنوعباس خاندان نے اہلِ بیتؑ کے نام پر خلافت پر قبضہ کرلیا۔ شروع شروع میں اس خاندان کے خلفاء عوام، شیعہ اور ایسے ہی علوی خاندان کے ساتھ مہربانی سے پیش آئے حتیٰ کہ علوی شہداء کے انتقام کے نام سے انھوں نے بنی اُمیہ کا قتلِ عام

بھی کیا اور خلفائے بنواُمیہ کی قبروں کو کھود کر ان کی ہڈیاں بھی جلا دیں۔ لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ انھوں نے بھی بنواُمیہ کا سا ظالمانہ طریقہ اختیار کرلیا اور اس طرح ظلم وستم اور لاقانونیت میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔

امام ابوحنیفہ جو اہلِ سنت کے چار اماموں میں سے ایک ہیں، خلیفہ عباسی (منصور) نے ان کو قید میں ڈال دیا (تاریخ ابوالفداء، جلد۲، ص ۶) اور ان کو سخت اذیتیں اور تکلیفیں دی گئیں۔ امام احمد حنبل جو اہلِ سنت کے دوسرے امام تھے ان کو سرعام کوڑے لگائے گئے (تاریخ یعقوبی، جلد۳، ص ۱۹۸) اور اسی طرح شیعوں کے چھٹے امام جعفر صادق علیہ السلام کو سخت ترین شکنجوں، اذیتوں اور تکلیفوں کے بعد زہر دے کر شہید کردیا گیا۔ (کتاب بحارالانوار، جلد۱۲، حالات امام جعفر صادقؑ)

اس حکومت کے دوران علوی خاندان کے افراد کو اکٹھا کر کے ان کی گردنیں اُڑا دی جاتی تھیں یا ان کو زندہ درگور کردیا جاتا تھا اور کبھی کبھی بعض افراد کو دیواروں میں چنوا دیا جاتا تھا یا سرکاری عمارتوں کے نیچے دفن کردیا جاتا تھا۔

عباسی خلیفہ ہارون الرشید جس کے زمانے میں اسلامی سلطنت اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی اور بہت زیادہ وسعت اختیار کرگئی تھی، یہاں تک کہ کبھی کبھی خلیفہ سورج کو دیکھ کر کہا کرتا تھا: "(اے سورج) جہاں بھی تیرا دل چاہے، اپنی شعاعیں زمین پر پھینک (چمک) لیکن میرے ملک سے باہر ہرگز نہیں چمکے گا (یعنی جہاں تک سورج چمکتا ہے، وہاں تک میرا ملک ہے)"۔

ایک طرف تو اس کی فوجیں مشرق و مغرب کی طرف آگے ہی بڑھتی چلی جارہی تھیں اور دوسری طرف بغداد کے پُل جو خلیفہ کے محل سے چند قدم کے فاصلے پر واقع تھا خلیفہ کی اجازت کے بغیر اس کے گماشتے پُل پر سے گزرنے والوں سے ٹیکس وصول کیا کرتے تھے، حتیٰ کہ ایک دن جب خود خلیفہ اس پُل پر سے گزرنا چاہتا تھا تو

انھوں نے اس کا راستہ روک کر اس سے ٹیکس ادا کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔(قصہ جسر بغداد، بغداد کے پُل کا قصہ)

ایک گانے والے شخص نے چند شہوت انگیز شعر پڑھ کر عباسی خلیفہ امین کی شہوت کو اُبھارا تو امین نے اسے تیس لاکھ چاندی کے درہم انعام میں دیے۔ وہ گانے والا اس قدر خوش ہوا کہ خلیفہ کے قدموں میں گر پڑا اور کہنے لگا: ''اے امیر المومنین! کیا آپ نے یہ ساری رقم مجھے عطا فرما دی ہے؟'' خلیفہ نے جواب دیا: ''اس رقم کی کوئی اہمیت نہیں ہے کیونکہ یہ ساری رقم ہمیں ملک کے ایک ایسے حصّے سے ملی ہے، جس کو ہم جانتے بھی نہیں''۔ (کتاب آغانی ابی الفرج، قصہ امین، خلیفہ عباسی)

وہ بے اندازہ اور بے شمار دولت جو اسلامی ممالک سے بیت المال کے عنوان سے ہر سال دارالخلافہ میں پہنچتی تھی وہ سب کی سب خلیفۂ وقت کی شہوت پرستی، ہوس رانی، عیاشی اور ایسے ہی عوام کی حق تلفی پر خرچ ہوتی تھی۔ ان خوب صورت کنیزوں، لڑکیوں اور لڑکوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی تھی، جو ہر وقت خلیفہ کے دربار میں خدمت پر مامور تھے۔ اُموی حکومت کے خاتمے پر اور بنو عباس کے اقتدار سے شیعوں کی حالت میں ذرا بھر بھی فرق نہ آیا، سوائے اس کے کہ ان کے ظالم اور بیداد گر دشمنوں نے صرف اپنا نام تبدیل کر لیا تھا۔

تیسری صدی ہجری کے دَوران شیعوں کی حالت

تیسری صدی ہجری کے آغاز سے شیعوں نے تازہ سانس لیا۔ اس کا پہلا سبب یہ تھا کہ یونانی، سریانی اور دوسری زبانوں سے بہت زیادہ علمی اور فلسفی کتابیں عربی زبان میں ترجمہ ہو گئی تھیں اور لوگ استدلالی و عقلی علوم کو حاصل کرنے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ عباسی خلیفہ مامون الرشید (۱۹۵ تا ۲۱۸ ہجری قمری) معتزلہ مذہب کا پیرو تھا اور مذہب میں عقلی استدلال کی طرف مائل تھا، لہٰذا اس نے مختلف

ادیان اور مذاہب میں لفظی استدلال کے رواج کی عام آزادی دے رکھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ علما اور شیعہ متکلمین (علم کلام کے ماہرین) نے اس آزادی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور انھوں نے علمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اہلِ بیتؑ کے مذہب کی تبلیغ میں بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ (مختلف التواریخ)

دوسرے یہ کہ خلیفہ مامون الرشید نے سیاسی حالات کے پیشِ نظر شیعوں کے آٹھویں امام حضرت علی رضاؑ کو اپنا ولی عہد اور جانشین بھی بنایا ہوا تھا جس کے نتیجے میں علوی خاندان اور اہلِ بیتؑ کے دوست اور طرفدار ایک حد تک سرکاری عہدیداروں کے ظلم وستم سے محفوظ ہو چکے تھے، اور کم وبیش آزاد تھے لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ دوبارہ تلوار کی تیز دھار شیعوں کی طرف پھر گئی اور ان کے اسلاف کے طریقے اور حالات ان کے لیے بھی پیدا ہو گئے، خصوصاً عباسی خلیفہ متوکل باللہ (۲۳۲ تا ۲۴۷ ہجری قمری) کے زمانے میں جو حضرت علیؑ اور آپؑ کے پیروکاروں سے خصوصی دشمنی رکھتا تھا اور اسی کے حکم سے شیعوں کے تیسرے امام (حسینؑ) کا مزارِ مقدس کربلا میں گرا کر خاک کے ساتھ یکساں کر دیا گیا۔ (تاریخ ابوالفداء اور دوسری تاریخی کتابیں)

چوتھی صدی ہجری کے دَوران شیعوں کی حالت

چوتھی صدی ہجری کے دَوران کچھ ایسے عناصر اور حالات پیدا ہو گئے تھے جو خود بخود مذہب شیعہ کی ترقی اور شیعوں کے طاقت ور اور مضبوط بننے میں مدد کر رہے تھے۔ ان حالات میں سے خلافت بنو عباس کی کمزوری اور آلِ بویہ بادشاہوں کا ان کے مقابلے میں سر اٹھانا تھا۔

آلِ بویہ کے بادشاہ جو مذہبی طور پر شیعہ تھے اور خلافت کے مرکز (دارالخلافہ) بغداد میں اور ایسے ہی خلیفہ کے دربار میں ان کا بہت اثر ورسوخ تھا۔ اور یہ شیعوں کے لیے

ایک قابلِ توجہ طاقت تھی، جو دن بہ دن ان کو زیادہ سے زیادہ جرأت مند اور طاقت ور بنا رہی تھی تا کہ وہ اپنے مذہبی مخالفوں کے سامنے جو ہمیشہ خلافت کی طاقت پر بھروسہ اور تکیہ رکھتے ہوئے ان کو نیچا دکھانے کی فکر میں تھے، کھڑے ہو جائیں اور ان کا مقابلہ کریں اور اس کے ساتھ ساتھ پوری آزادی کے ساتھ اپنے (شیعہ) مذہب کی تبلیغ کریں۔

جیسا کہ مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس صدی کے دوران سارے جزیرۃ العرب یا اس کے زیادہ حصے میں، بڑے بڑے شہروں کے علاوہ سب جگہ شیعہ آباد تھے لیکن ان کے علاوہ کچھ بڑے شہر بھی مثلاً ہجر، عمان اور صعدہ وغیرہ شیعوں کے شہر شمار ہوتے تھے۔ شہر بصرہ میں بھی شیعوں کی قابلِ توجہ تعداد موجود تھی حالانکہ وہ شہر ہمیشہ سے اہلِ سنت کا مرکز تھا اور شہر کوفہ کے ساتھ جو شیعوں کا مرکز سمجھا جاتا تھا مذہبی رقابت اور برابری رکھتا تھا اور اسی طرح دوسرے شہروں مثلاً طرابلس، نابلس، طبریہ، حلب اور ہرات میں بھی بہت زیادہ شیعہ زندگی گزارتے تھے۔ اس کے علاوہ اہواز، خلیج فارس کے کنارے (ایرانی ساحل) پر بھی شیعوں کی تعداد قابلِ ملاحظہ تھی۔ (الحضارۃ الاسلامیہ، جلد اوّل، ص ۹۷)

اسی صدی کے آغاز میں ہی ناصر اطروش جو کئی سال تک ایران کے شمالی حصوں میں مذہب شیعہ کی تبلیغ کر رہا تھا، طبرستان کے علاقے پر قابض ہو گیا تھا اور وہاں اس نے سلطنت کی داغ بیل ڈالی تھی، جو کئی پشتوں تک جاری رہی۔ اطروش سے پہلے بھی ایک شخص بنام حسن بن زید علوی نے کئی سال تک طبرستان میں حکومت کی تھی۔ (مروج الذہب، جلد۴، ص ۳۷۳۔ الملل والنحل، جلد اوّل، ص ۲۵۴)

اس صدی کے دوران فاطمیوں نے جو اسماعیلی فرقے سے تعلق رکھتے تھے، مصر میں اقتدارِ حکومت سنبھال لیا اور ۲۹۶ھ سے ۵۲۷ھ تک حکومت کرتے رہے۔ (تاریخ ابوالفداء، جلد۲، ص ۶۳، جلد۳، ص ۵۰)

اسی زمانے میں عام طور پر ایسے حالات پیش آتے رہے کہ بڑے بڑے اسلامی شہروں مثلاً بغداد، بصرہ، اور نیشاپور میں شیعہ سنّی فرقوں کے درمیان کبھی کبھی کشمکش اور جنگ شروع ہو جاتی تھی اور ان جنگوں میں سے بعض میں شیعوں کو کامیابی ہوتی تھی۔

پانچویں صدی سے لے کر نویں صدی ہجری کے دوران شیعوں کی حالت

پانچویں صدی ہجری سے لے کر نویں صدی ہجری تک شیعوں کی تعداد میں مسلسل خاطر خواہ اضافہ ہوتا رہا جیسا کہ چوتھی صدی ہجری کے دوران ان کی افزائش جاری رہی۔ اس دوران میں بعض ایسے بادشاہوں نے بھی حکومت کی جو شیعہ تھے اور مذہب شیعہ کو رواج دیتے رہے۔

پانچویں صدی ہجری کے آخر میں اسماعیلیہ کی تحریک اور دعوت نے ''الموت'' کے علاقوں میں اپنی حکومت کو مضبوط کر لیا تھا اور اس طرح اسماعیلی فرقے کے بادشاہ تقریباً ڈیڑھ صدی تک ایران کے بالکل درمیانی حصے میں مکمل آزادی کے ساتھ اور اپنی مذہبی رسومات کے مطابق زندگی گزارتے رہے۔ (تاریخ کامل، تاریخ روضۃ الصفا، اور تاریخ حبیب السیر کی طرف رجوع کریں)

مرعشی سادات نے بھی کئی برسوں تک مازندران کے علاقوں پر حکومت کی تھی۔ (تاریخ کامل اور تاریخ ابی الفداء، جلد۳)

مغلوں کے ایک بادشاہ خدابندہ نے مذہب شیعہ اختیار کر لیا تھا اور اس کی اولاد میں سے بھی بہت زیادہ بادشاہوں نے ایران میں سلطنت اور حکومت کی تھی اور چونکہ یہ سب لوگ شیعہ تھے اس لیے وہ سب مذہب شیعہ کی ترویج و ترقی کے لیے کوشاں رہے تھے۔ اسی طرح آق قویونلو اور قرہ قویونلو خاندان کے سلاطین جو تبریز میں حکومت کیا کرتے تھے (تاریخ حبیب السیر) اور ان کی حکمرانی اور بادشاہت کی

وسعت فارس (شیراز) اور کرمان تک پہنچ چکی تھی، مذہب شیعہ کے پیروکار تھے۔ مصر میں بھی سالہا سال تک فاطمیوں کی حکومت قائم رہی تھی۔

البتہ مذہبی طاقت مختلف بادشاہوں کے زمانے میں مختلف رہی ہے، جیسا کہ فاطمی حکومت کے خاتمے اور سلاطین آل ایوب کے اقتدار سنبھالنے سے حالات بالکل پھر گئے تھے۔ مصر اور شام کے شیعوں کی آزادی چھن گئی اور بہت سے شیعہ افراد کو قتل کر دیا گیا۔ (تاریخ حبیب السیر اور تاریخ ابی الفدا وغیرہ)

انھی شہید ہونے والوں میں سے شہید اول محمد بن محمد مکی بھی تھے جو شیعہ فقہ کے ذہین ترین افراد میں سے تھے اور ۷۸۶ھ کو دمشق میں مذہب شیعہ رکھنے کے جرم میں شہید کر دیے گئے تھے (روضات الجنات اور ریاض العلماء، نقل از ریحانۃ الادب، جلد ۲، ص ۳۶۵)۔ اسی طرح شیخ اشراق شہاب الدین سہروردی کو حلب میں فلسفہ کے جرم میں شہید کر دیا گیا۔ (روضات الجنات، کتاب المجالس اور وفیات الاعیان)

مجموعی اور کلی طور پر ان پانچ صدیوں میں شیعہ آبادی کے لحاظ سے مسلسل بڑھتے رہے اور طاقت و آزادی کے لحاظ سے اپنے وقت کے بادشاہوں کی مرضی یا مخالفت کے ماتحت رہے اور اس تمام مدت اور عرصے میں اسلامی ممالک میں سے ایک ملک میں بھی مذہب شیعہ کو سرکاری اور ملکی مذہب ہونے کا موقع نہ ملا اور نہ ہی کسی نے اس کا اعلان کیا یا اسے سرکاری مذہب کے طور پر تسلیم کیا۔

دسویں اور گیارہویں صدی کے دوران شیعوں کی حالت

۹۰۶ ہجری قمری میں شیخ صفی الدین اردبیلی (متوفی ۷۳۵ھ) کے خاندان میں سے ایک تیرہ سالہ نوجوان نے جو مذہب کے لحاظ سے شیعہ تھا، اپنے آباؤ اجداد کے تین سو مریدوں اور درویشوں کو ساتھ لے کر حکومت وقت کے خلاف سر اٹھایا تاکہ ایک مستقل، خود مختار اور آزاد شیعہ ریاست کو معرض وجود میں لائے، اس لیے وہ اردبیل

سے اُٹھا اور کشور کشائی کرتے ہوئے طوائف الملوکی کو ایران سے ختم کر دیا۔ اس نے علاقائی بادشاہوں اور خصوصاً آلِ عثمان خاندان کے بادشاہوں کے ساتھ خونریز جنگیں کیں، یہاں تک کہ ایران کو جو اس وقت حصوں بخروں میں تقسیم ہو چکا تھا، ایک متحدہ اور آزاد ملک بنا دیا اور مذہب شیعہ کو اپنی حکومت اور قلمرو میں سرکاری مذہب کا درجہ دے کر رواج دیا۔ شاہ اسماعیل صفوی کی وفات کے بعد صفوی خاندان کے دوسرے بادشاہوں نے بارہویں صدی ہجری تک ایران میں اپنی حکومت جاری رکھی اور سب نے یکے بعد دیگرے شیعہ امامیہ مذہب کو سرکاری مذہب کے طور پر تصدیق اور تسلیم کیا اور اس کو مضبوط بنانے کے لیے کسی کوشش اور جدوجہد یا حتیٰ کہ جنگوں سے بھی دریغ نہ کیا۔ یہاں تک کہ یہ خاندان جب اپنے عروج پر تھا (یعنی شاہ عباس صفوی کے زمانے میں) اس نے ملکی آبادی اور وسعت کو موجودہ ایران (یعنی ۱۳۸۴ھ) سے دوگنا کر دیا تھا۔

شیعہ جماعت اس آخری اڑھائی سو سال کے عرصے میں تقریباً تمام اسلامی ممالک میں اسی طرح ترقی کرتی رہی اور اس کی تعداد میں مسلسل اور روز بروز اضافہ ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے۔

بارہویں سے پندرہویں صدی ہجری کے دوران شیعوں کی حالت

آخری تین صدیوں کے دوران شیعوں کی مذہبی ترقی اپنی سابقہ حالت اور شکل میں جاری رہی ہے اور اب جب کہ چودھویں صدی کا آخری حصّہ گزر رہا ہے۔ مذہب شیعہ ایران میں سرکاری اور عوامی مذہب کے طور پر پہچانا جاتا ہے اور اسی طرح دوسرے بہت سے اسلامی ممالک میں بھی کم و بیش شیعہ افراد زندگی گزار رہے ہیں، لیکن مجموعی طور پر دنیا کے مختلف ممالک اور علاقوں میں شیعہ آبادی تقریباً ایک سو ملین (دس کروڑ) نفوس پر مشتمل ہے۔

شیعوں کے مختلف فرقے

- اصلی فرقے اور بعض فرقوں کا خاتمہ
- زیدیہ فرقہ
- اسماعیلیہ مذہب اور اس کے مختلف فرقے
- نزاریہ، مستعلیہ، دروزیہ اور مقنعہ
- بارہ امامی شیعہ اور ان کا زیدیہ اور اسماعیلیہ سے اختلاف
- بارہ امامی شیعہ کی تاریخ پر ایک نظر

اصلی فرقے

ہر مذہب میں کم و بیش ایسے مسائل موجود ہوتے ہیں، جو اس مذہب کے بنیادی اصول سمجھے اور گنے جاتے ہیں اور اسی طرح ہر مذہب میں بعض دوسرے درجے کے مسائل بھی ہوتے ہیں، لہٰذا اصلی مسائل کی کیفیت اور حقیقت میں اہل مذہب کا اختلاف، فرقوں کے اشتراک کی اصلیت اور اصولوں کی بنیاد پر شمار کیا جاتا ہے۔

دنیا کے تمام ادیان و مذاہب میں بہت سے فرقے موجود ہیں خصوصاً چار آسمانی مذاہب یعنی یہودیت، عیسائیت، مجوسیت اور اسلام میں، بلکہ تمام اور مذاہب کے فرقوں میں بھی چھوٹے چھوٹے فرقے موجود ہیں۔ مذہب شیعہ میں پہلے تین اماموں (یعنی امیرالمومنین حضرت علی ابن ابی طالبؑ، حضرت امام حسن بن علیؑ اور حضرت امام حسین بن علی علیہما السلام) کے زمانوں میں کوئی فرقہ موجود نہ تھا لیکن امام سوم (حضرت امام حسین علیہ السلام) کی شہادت کے بعد شیعوں کی اکثریت حضرت امام علی بن حسین (زین العابدین سجاد علیہ السلام) کی پیروکار اور قائل ہوگئی جب کہ اقلیت نے جس کو "کیسانیہ" کہا جاتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام کے تیسرے بیٹے محمد بن حنفیہ کو اپنا امام بنا لیا تھا۔ ان کے خیال کے مطابق محمد بن حنفیہ چوتھے امام ہیں اور وہی امام مہدی ہیں جو کو رضوی میں غائب ہوگئے تھے اور آخری زمانے میں امام مہدی علیہ السلام کے نام سے ظاہر ہوں گے۔

امام سجاد علیہ السلام (زین العابدین) کی رحلت کے بعد شیعوں کی اکثریت نے آپ کے فرزند حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی بیعت کر لی لیکن ایک اقلیت نے امام سجاد علیہ السلام

کے دوسرے بیٹے زید شہید کو اپنا ہادی، رہنما اور امام بنا لیا، لہٰذا ان کو اسی وجہ سے "زیدیہ" کہا جاتا ہے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی رحلت کے بعد ان کے پیروکاروں اور شیعوں نے ان کے فرزند ارجمند حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی بیعت کر لی اور ان کی امامت پر ایمان لائے۔ آپؑ کی وفات کے بعد اکثریت شیعہ نے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو اپنا امام تسلیم کر لیا۔ لیکن ایک تعداد نے حضرت اسماعیل کو جو کہ چھٹے امامؑ کے بڑے بیٹے تھے اور حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی زندگی میں ہی وفات پا گئے تھے، اپنا امام سمجھا اور یہ جماعت جو اکثریت سے الگ ہو گئی تھی، اس کو "اسماعیلیہ" کہا گیا۔ اس کے بعض افراد نے امام ہفتم کے دوسرے بیٹے حضرت عبداللہ افطح کی پیروی اختیار کر لی اور بعض لوگ ساتویں امام کے فرزند حضرت محمد (امام علی رضاؑ) کے پیروکار ہو گئے، لیکن بعض نے خود امام ہفتم کو ہی اپنا امام، ولی اور پیشوا قرار دیا اور انھی کو آخری امام سمجھا۔

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی شہادت کے بعد اکثریت شیعہ نے حضرت امام علی رضا علیہ السلام کو آٹھواں امام مانا لیکن بعض نے ساتویں امام کو ہی آخری امام سمجھا، لہٰذا ان کو "واقفیہ" کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد آٹھویں امامؑ سے لے کر بارہویں امامؑ تک جو اکثریت شیعہ کے ایمان و اعتقاد کے مطابق مہدی موعود اور امام آخرالزمان ہیں، کوئی قابلِ توجہ فرقہ پیدا نہ ہوا اور اگر فرقوں کی صورت میں بعض واقعات و حالات پیدا ہوئے بھی تو وہ صرف چند روز سے زیادہ دیر تک کے لیے قائم نہ رہ سکے اور وہ خود بخود ہی ختم ہو گئے۔ مثلاً دسویں امامؑ کے بیٹے حضرت جعفر نے اپنے بھائی یعنی گیارہویں امامؑ (حسن عسکری) کے بعد امامت کا دعویٰ کیا تھا اور ایک جماعت نے ان کو اپنا امام تسلیم بھی کر لیا تھا لیکن

یہ گروہ تھوڑے ہی عرصہ میں منتشر ہوگیا تھا اور حضرت جعفر نے بھی اپنے دعوے سے ہاتھ اُٹھا لیا لہٰذا وہ فرقہ جاری نہ رہ سکا۔ اسی طرح شیعہ علما کے درمیان بعض دوسرے اختلافات بھی موجود ہیں لیکن ان اختلافات کو مذہبی فرقوں کے طور پر شمار نہیں کیا جاسکتا۔

مذکورہ بالا فرقے، اکثریت شیعہ کے مقابلے میں پیدا ہوتے رہے لیکن تھوڑے عرصے میں ہی خود بخود ختم اور معطل ہوتے گئے سوائے دو فرقوں ''زیدیہ'' اور ''اسماعیلیہ'' کے، جو ابھی تک موجود ہیں اور ان کے ماننے والے اب بھی مختلف ملکوں مثلاً یمن، پاکستان، ہندوستان، لبنان اور دوسری جگہوں میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اسی لیے اکثریت بارہ امامی شیعوں کے ساتھ ساتھ صرف انھی دو فرقوں کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے کیونکہ یہی دو فرقے دوسرے شیعہ فرقوں کے درمیان اہم ترین فرقے ہیں۔

شیعہ زیدیہ

زیدیہ حضرت امام سجاد علیہ السلام (زین العابدینؑ) کے فرزند زید شہید کے پیروکار ہیں۔ زید نے ۱۲۱ھ میں اُموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے خلاف تحریک چلائی اور ایک بڑی جماعت نے ان کی بیعت کرلی تھی لیکن شہر کوفہ میں ان کے مریدوں اور پیروکاروں اور اُموی خلفیہ کی فوج کے درمیان جنگ ہوئی اور حضرت زید بھی اس جنگ میں شہید ہوگئے۔

زید شہید اپنے ماننے والوں اور پیروکاروں کے لیے اہلِ بیتؑ کے پانچویں امام شمار کیے جاتے ہیں اور ان کے بعد ان کے بیٹے یحییٰ بن زید جنھوں نے اُموی خلیفہ ولید بن یزید کے خلاف تحریک چلائی تھی اور شہید ہوگئے تھے، آپ کے جانشین مقرر ہوئے۔ ان کے بعد محمد بن عبداللہ اور ابراہیم بن عبداللہ جنھوں نے عباسی خلیفہ منصور دوانقی کے خلاف مہم شروع کی تھی اور یکے بعد دیگرے دونوں شہید ہوگئے، فرقہ

زیدیہ کے امام سمجھے جاتے ہیں۔

اس کے بعد کچھ مدت کے لیے زیدیہ فرقہ غیر منظم رہا، یہاں تک کہ ناصر اطروش نے جو حضرت زید کے بھائی کی اولاد میں سے تھا، خراسان میں اپنی امامت کا اعلان کردیا۔ وہاں کی حکومت نے اس کو گرفتار کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بھاگ کر مازندران پہنچ گیا، جہاں کے لوگوں نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ وہاں اس نے تیرہ سال اسلام کی تبلیغ کی اور بہت زیادہ افراد کو مسلمان بنا کر زیدیہ مذہب کا گرویدہ بنا لیا تھا۔ اس کے بعد انھی افراد کی مدد سے طبرستان پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اپنی امامت کا اعلان کردیا۔ اس کے بعد اس کی اولاد میں سے بعض افراد نے کافی عرصے تک اس علاقے میں اپنی حکومت اور امامت جاری رکھی۔

زیدیہ فرقے کے عقیدے کے مطابق ہر وہ شخص جو فاطمی نسل سے ہو اور اس کے ساتھ ساتھ عالم، فاضل، زاہد، پارسا اور سخی بھی ہو اور حق کی خاطر ظلم وستم کے خلاف اُٹھے اور ظلم وستم کو ختم کرنے کی تحریک چلائے، وہ امام ہو سکتا ہے۔

شروع شروع میں زیدی لوگ خود حضرت زید کی طرح پہلے دو خلفا (حضرت ابوبکر وحضرت عمر) کو اپنے آئمہ میں شمار کیا کرتے تھے لیکن کچھ عرصے کے بعد بعض لوگوں نے ان خلفا کے نام اپنے اماموں کی فہرست سے نکال دیئے اور اپنی امامت کو حضرت علی علیہ السلام سے شمار کرنا شروع کیا۔[1]

تاریخی شہادت کے مطابق فرقہ زیدیہ اصول و اسلام میں "معتزلہ" کا ذوق رکھتا ہے اور تقریباً اسی مذہب کا پیروکار ہے، فروعی اور فقہی عقائد میں امام ابوحنیفہ کی

---

[1] پاکستان، ہندوستان اور کئی دوسرے ممالک میں آج بھی زیدیہ فرقہ کے بعض لوگ پہلے دو خلفائے راشدین کو اپنا خلیفہ مانتے ہیں اور ان کا احترام کرتے ہیں کیونکہ ان کا اعتقاد ہے کہ خود حضرت زید بھی خلفائے راشدین کا احترام کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اکثر زیدی لوگ اپنے آپ کو اہل سنت میں بھی شامل کرتے ہیں اور بعض فقہ حنفیہ کے پیروکار ہیں۔ (مترجم)

پیروی کرتا ہے، جو اہل سنت کے چار اماموں میں سے ایک ہیں۔ ان کے درمیان بعض فقہی مسائل کے بارے میں تھوڑا بہت اختلاف موجود ہے۔[1]

اسماعیلیہ شیعہ اور ان کے مختلف فرقے

باطنیہ

امام ششم (حضرت جعفر صادق علیہ السلام) کے ایک بیٹے جن کا نام اسماعیل تھا اور وہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی اولاد میں سب[2] سے بڑے تھے، انھوں نے اپنے والد کی زندگی میں ہی وفات پائی تھی۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اسماعیل کی وفات کی گواہی دی، حتیٰ کہ حاکمِ مدینہ نے بھی اس گواہی کی تصدیق کی تھی کہ اسماعیل فوت ہو چکے ہیں مگر بعض لوگوں کا ایمان اور اعتقاد تھا کہ وہ فوت نہیں ہوئے بلکہ غائب اور روپوش ہو گئے ہیں اور اسی لیے دوبارہ ظاہر ہوں گے اور وہی مہدی موعود بھی ہوں گے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ اسماعیل کی وفات کے بارے میں امام ششم کی گواہی ایک قسم کی پردہ پوشی ہے، جو جان بوجھ کر عباسی خلیفہ منصور کے خوف سے دی گئی تھی۔
اسی طرح بعض لوگوں کا خیال یہ تھا کہ اگرچہ اسماعیل اپنے والد کی زندگی میں ہی فوت ہو گئے ہیں لیکن امامت پھر بھی انہی کا حق ہے اور اسماعیل کی وفات کے بعد یہ امامت خود بخود ان کے بیٹے محمد کو مل جاتی ہے اور پھر ان کی اولاد میں منتقل ہو گئی ہے۔

پہلے دو فرقوں کے لوگ تو تھوڑے عرصے کے بعد خود بخود ختم ہو گئے تھے لیکن تیسرا فرقہ ابھی تک باقی ہے اور اس فرقے کے اندر دوسرے کئی فرقے پیدا ہو چکے ہیں۔

مجموعی طور پر اسماعیلیوں کا فلسفہ ایک ایسا فلسفہ ہے، جو ستارہ پرستوں کے فلسفے

---

[1] یہ مطالب کتاب "ملل والنحل" شہرستانی اور کتاب کامل، ابن اثیر سے ماخوذ کیے گئے ہیں۔

[2] یہ مطالب، کتب کامل ابن اثیر، روضۃ الصفا، حبیب السیر، تاریخ ابی الفداء، ملل والنحل شہرستانی اور اس کے بعض اجزا، یعنی تاریخ آغاخانیہ سے نقل اور ماخوذ ہیں۔

سے مشابہت رکھتا ہے اور یہ فلسفہ درحقیقت ہندی عرفان اور تصوف کے ساتھ گھل مل گیا ہے اور اسی طرح قرآنی معارف اور اسلامی احکام کے بارے میں بھی ان کا ایمان ہے کہ ہر ظاہر کے لیے ایک باطن اور ہر باطن کے لیے ایک ظاہر موجود ہے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ ہر تنزیل کے لیے ایک تاویل پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔

اسماعیلیوں کا ایمان اور اعتقاد یہ ہے کہ یہ دنیا ہرگز حجت خدا (خدا کے نمائندوں، اولیاء اللہ اور اماموں) سے خالی نہیں ہوتی اور خدا کی حجت دو طرح کی ہے: ایک ناطق ہے اور دوسری صامت۔ حجت ناطق تو خود پیغمبر ہوتے ہیں اور حجت صامت (خاموش) ولی یا امام ہوتے ہیں جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین اور وصی ہیں۔ بہر حال حجت، خدائے تعالیٰ کی ربوبیت اور خدائی کا مظہر ہے۔

حجت کی بنیاد ہمیشہ سات (۷) کے عدد کے گرد گھومتی ہے۔ اس طرح کہ ایک نبی یا رسول آتا ہے، جس کو کہ خدا کی طرف سے نبوت (شریعت) اور ولایت ملی ہوتی ہے اور اس کے بعد اس پیغمبر کے سات جانشین ہوتے ہیں، جن کو ولایت ملتی ہے۔ ان سب جانشینوں کو ایک ہی درجہ یا مقام ہوتا ہے، سوائے اس کے کہ ساتواں جانشین نبی بھی ہوتا ہے۔ اس کے تین درجے ہیں: یعنی نبوت، جانشینی اور ولایت، اس کے بعد پھر دوبارہ جانشینی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور پہلے کی طرح سات جانشین ہوتے ہیں۔ ساتوں جانشین ان تینوں مقامات اور درجات کا حامل ہوتا ہے، اور یہ سلسلہ اسی نہج اور طریقے پر چلتا رہتا ہے اور کبھی ختم نہ ہوگا۔

اسماعیلی کہتے ہیں: حضرت آدم علیہ السلام نبوت اور ولایت کے ساتھ دنیا میں تشریف لائے تھے اور ان کے سات جانشین تھے، جن میں سے ساتویں حضرت نوح تھے جن کو نبوت، ولایت اور جانشینی عطا ہوئی تھی۔ پھر حضرت ابراہیمؑ ساتویں جانشین اور حضرت نوحؑ کے وصی تھے اور حضرت ابراہیمؑ کے ساتویں جانشین حضرت موسیٰؑ تھے۔

حضرت موسیٰؑ کے ساتویں جانشین حضرت عیسیٰؑ تھے اور حضرت عیسیٰؑ کے ساتویں جانشین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے اور اسی طرح حضرت محمدؐ کے ساتویں جانشین محمد بن اسماعیل تھے۔ اسی طرح حضرت محمدؐ کے جانشین بالترتیب حضرت علیؑ، حضرت امام حسینؑ، حضرت علیؑ بن حسینؑ (زین العابدینؑ) حضرت امام محمد باقرؑ، حضرت امام جعفر صادقؑ، حضرت اسماعیل اور حضرت محمد بن اسماعیل ہوتے ہیں (یہ لوگ دوسرے امام یعنی حضرت امام محمد باقرؑ، حضرت امام جعفر صادقؑ، حضرت اسماعیل اور حضرت محمد بن اسماعیل ہوتے ہیں (یہ لوگ دوسرے امام یعنی حضرت امام حسنؑ بن علیؑ کو اپنا امام نہیں مانتے) محمد بن اسماعیلؑ کے بعد ان کی اولاد سے سات افراد جانشین ہیں، جن کا نام پوشیدہ ہے۔ اس کے بعد فاطمی بادشاہوں میں سے پہلے سات افراد جن میں سب سے پہلے عبیداللہ مہدی تھے، جو فاطمی سلطنت کے بانی ہوئے، جانشین تھے۔

اسماعیلیوں کا اعتقاد اور ایمان ہے کہ خداوند تعالیٰ کی طرف سے ہمیشہ روئے زمین پر بارہ افراد موجود رہتے ہیں، جن کو "حواری یا خواص یا حجت" کہا جاتا ہے، لیکن اسماعیلیوں کے بعض فرقے (دروزیہ یا باطنیہ) ان کی تعداد چھے بتاتے ہیں اور باقی چھے افراد کو اماموں میں سے لیتے ہیں۔

۲۷۸ھ میں (افریقہ میں عبیداللہ مہدی کے ظہور سے چند سال پہلے)۔ خوزستان کے صوبے میں ایک شخص جس نے اپنا کبھی نام اور پتہ نہیں بتایا تھا، کوفہ کے گردونواح میں ظاہر ہوا۔ یہ شخص دن کو روزہ رکھا کرتا تھا اور رات کو عبادت میں گزار دیا کرتا تھا، اپنے ہاتھ سے روزی کما کر کھاتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ عوام کو مذہب اسماعیلیہ کی دعوت دیا کرتا تھا۔ اس کی تبلیغ کے ذریعے بہت سے لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ اس نے اپنے پیروکاروں میں سے بارہ افراد کو اپنا "نقیب" یعنی مبلغ کے طور پر منتخب کر لیا تھا اور خود کوفہ سے شام کی طرف چلا گیا۔ اس کے بعد اس کے بارے میں

کسی کو کچھ پتہ نہیں چلا۔

اس ناشناس آدمی کے بعد ایک شخص بنام احمد جو قرمط کے نام سے مشہور ہوا، عراق میں اس کا جانشین بنا، اس نے باطنیہ مذہب کی تبلیغ شروع کی، اور جیسا کہ مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس نے پنجگانہ نماز کے مقابلے میں ایک نئی نماز شروع کی تھی۔ اس نے غسلِ جنابت کو باطل اور منسوخ کر دیا تھا اور شراب کو حلال اور جائز قرار دیا تھا۔ اسی دَوران باطنیہ فرقے کے بعض دوسرے افراد نے بھی اس مذہب کی تبلیغ جاری رکھی اور ایک جماعت کو اپنا گرویدہ اور پیروکار بنا لیا۔

یہ لوگ ان افراد اور اشخاص کے جان و مال کا کچھ احترام نہ کرتے تھے، جو باطنیہ فرقے کو نہیں مانتے تھے اور یا اس کے قائل نہیں تھے۔ اس طرح انھوں نے مختلف شہروں یا ملکوں مثلاً عراق، بحرین، یمن اور شامات (آج کل کے شام، لبنان، فلسطین، اسرائیل اور اُردن وغیرہ سب علاقے کو شام کہا جاتا تھا)۔ میں اپنی اس تحریک کو مضبوط اور جاری رکھ کر بے اندازہ لوگوں کا قتلِ عام کیا تھا۔ وہ ان کے مال و متاع کو لوٹ لیا کرتے تھے، انھوں نے بارہا حاجیوں کے قافلوں پر حملے کیے اور ہزاروں انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا اور ان کے مال اور سامانِ سفر کو لوٹا تھا۔

باطنیہ فرقے کے سرداروں اور سرکردہ لوگوں میں سے ایک شخص ابو طاہر قرمطی تھا، جس نے ۳۱۱ھ میں بصرہ پر قبضہ کرلیا اور لوگوں کے مال کو لوٹنے اور ان کو قتل کرنے میں ذرا بھر بھی دریغ نہ کیا تھا۔ وہ شخص ۳۱۷ھ میں باطنیہ فرقے کی ایک بہت بڑی فوج لے کر حج کے زمانے میں مکہ معظمہ گیا اور وہاں کی حکومت کی طرف سے مختصر سی رکاوٹ کو ختم کر کے مکہ شہر میں داخل ہو گیا۔ اس نے مکہ معظمہ کے عوام اور تازہ وارد حاجیوں کا قتلِ عام شروع کر دیا، حتیٰ کہ اس نے مسجد الحرام اور خانہ کعبہ میں خون کی ندیاں بہا دیں۔ اس نے خانہ کعبہ کے پردے کو پھاڑ کر اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دیا۔

پھر اس نے خانہ کعبہ کو اپنی جگہ سے اکھاڑ دیا اور حجر اسود کو خانہ کعبہ کی دیوار سے نکال کر اپنے ساتھ یمن لے گیا جو بائیس سال تک قرمطیوں کے قبضے میں رہا۔

انہی واقعات اور حوادث کی وجہ سے مسلمانوں نے باطنیہ فرقے سے منہ موڑ لیا اور ان کو دین اسلام سے خارج یعنی کافر سمجھنے لگے، یہاں تک کہ عبیداللہ مہدی فاطمی جو افریقہ (مصر) میں ظاہر ہوا اور اپنے آپ کو مہدی موعود اور اسماعیلیوں کا امام کہا کرتا تھا۔اس نے بھی قرمطیوں سے بیزاری کا اعلان کر دیا تھا۔

مؤرخین کے بیانات کے مطابق باطنیہ فرقے کا مذہبی تشخص یہ ہے کہ اس فرقے کے افراد ظاہری قوانین اور دینی احکام کی تفسیر باطنی اور روحانی طریقے سے اور ایسے ہی عرفانی تاویل کرتے ہیں اور ظاہری شریعت کو صرف انہی لوگوں سے مختص جانتے ہیں جو کم عقل اور معنوی کمال سے بے بہرہ ہوتے ہیں اور یہ حکم بعض اوقات ان کے اماموں سے صادر ہوا کرتا ہے۔

نزاریہ، مستعلیہ، دروزیہ اور مقنعہ فرقے

عبیداللہ مہدی ۲۹۶ھ میں افریقہ میں ظاہر ہوا اور اس نے اسماعیلیہ مذہب کے مطابق اپنی امامت کا دعویٰ کیا اور اسی مذہب کی تبلیغ کیا کرتا تھا۔اسی شخص نے ہی فاطمی سلطنت کی داغ بیل ڈالی تھی۔اس کے بعد اس کی اولاد نے مصر کو اپنا دارالخلافہ بنایا اور سات پشتوں تک کسی دوسرے فرقے کے وجود کے بغیر سلطنت اور اسماعیلیہ مذہب کی امامت کی تھی، لیکن اس خاندان کا ساتواں بادشاہ اور امام جس کا نام مستنصر باللہ سعد بن علی تھا، اس کے دو بیٹے نزار اور مستعلی تھے۔ان دونوں کے درمیان خلافت کے لیے جھگڑا شروع ہوگیا۔بہت زیادہ کشمکش اور خونی جنگوں کے بعد مستعلی کو فتح ہوئی اور اس نے اپنے بھائی نزار کو پکڑ کر قید کر دیا، یہاں تک کہ اس نے قید میں ہی وفات پائی۔ان کشمکشوں اور جنگوں کی وجہ سے فاطمیوں کے پیروکار دو فرقوں یا

گروہوں "نزاریہ" اور "مستعلیہ" میں بٹ گئے۔

نزاریہ فرقہ بعد میں حسن بن صباح کا پیروکار بن گیا، جو مستنصر باللہ کا نزدیکی اور مقرب تھا۔ چونکہ حسن بن صباح، مستنصر باللہ کے بعد نزار کا جانب دار تھا، اس لیے مستعلی کے حکم سے اس کو مصر سے نکال دیا گیا تھا۔ وہ ایران چلا گیا اور تھوڑی مدت کے بعد وہ قزوین کے علاقے میں قلعہ "الموت" میں چلا گیا۔ اس نے ایک فوج تیار کر کے قلعہ الموت اور چند دوسرے گرد و نواح کے قلعوں پر قبضہ کرلیا اور ساتھ ہی اپنی سلطنت کا اعلان کردیا۔ اس نے نزار کے حق میں تبلیغ جاری رکھی۔ حسن بن صباح کے مرنے یعنی ۵۱۸ھ کے بعد "بزرگ اُمید رودباری" اور اس کے بعد اس کے بیٹے "کیا محمد" نے حسن بن صباح کے طریقے اور آئین پر ہی حکومت کی تھی۔ پھر اس کا بیٹا حسن علی ذکرہ اسلام" جو الموت کا چوتھا حکمران اور والی تھا، اس نے حسن بن صباح کے نزاری آئین اور طریقے کو منسوخ کردیا اور باطنیہ فرقے کی پیروی شروع کردی تھی۔

یہاں تک کہ ہلاکو خان تاتار نے ایران پر حملہ کردیا اور اس نے اسماعیلیہ کو فتح کر کے تمام اسماعیلیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اس نے قلعوں کی بڑی بڑی فلک بوس عمارتوں کو بھی خاک کے ساتھ یکساں کردیا۔ اس کے بعد ۱۲۵۵ھ میں آغا خان محلاتی نے جو نزاریہ فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ ایران میں محمد شاہ قاچار سے بغاوت کی اور اس نے کرمان کے علاقے میں جو تحریک شروع کی تھی، اس میں اسے شکست ہوئی اور وہ بمبئی کی طرف بھاگ گیا۔ اس نے وہاں باطنیہ نزاری فرقے کی تبلیغ کا کام جاری رکھا اور اپنی امامت کا اعلان کردیا۔ اس فرقے کی تبلیغ ابھی تک باقی اور جاری ہے، اور نزاریہ فرقہ کو اب "آغا خانیہ" کہا جاتا ہے۔

مستعلیہ: اس فرقے کے لوگ فاطمی بادشاہ مستعلی کے مرید یا پیروکار تھے اور ان کی امامت مصر کے فاطمی خلفا میں ہی باقی رہی جو ۵۵۷ھ میں ختم ہوگئی لیکن کچھ

عرصہ بعد ہندوستان اور پاکستان میں "بوہر فرقہ" کی بنیاد اسی مذہب پر دوبارہ قائم ہوئی جو اَب بھی باقی اور جاری ہے۔

دروزیہ: دروزیہ قبیلہ جو دروز (شام) کے پہاڑوں میں سکونت پذیر ہے، اس قبیلے کے لوگ ابتدا میں فاطمی خلفا کے پیروکار تھے لیکن چھٹے فاطمی خلیفہ کے زمانے میں نشکین دروزی کی تبلیغات کے زیراثر باطنیہ فرقے سے ملحق ہوگئے۔ دروزیہ فرقے کی امامت الحاکم باللہ (فاطمی بادشاہ) پر آ کر رُک گئی، جو دوسروں کے اعتقاد کے مطابق قتل ہوگیا تھا لیکن دروزیہ فرقے کا عقیدہ یا خیال ہے کہ وہ غائب ہوگیا ہے اور آسمانوں پر چلا گیا ہے اور پھر دوبارہ لوگوں کے درمیان آئے گا۔ (یعنی وہی امام مہدی کی شکل میں ظہور کرے گا)

مقنعہ: اس فرقے کے لوگ شروع میں "عطا مروی المعروف بہ مقنع" کے پیروکار تھے، جو مؤرخین کے قول کے مطابق: ابومسلم خراسانی کے مریدوں اور پیروکاروں میں سے تھا۔ اس نے ابومسلم کی وفات کے بعد دعویٰ کیا کہ ابومسلم کی روح اس کے اندر حلول کرگئی ہے۔ تھوڑے ہی عرصے بعد اس نے پیغمبری کا دعویٰ بھی کردیا لیکن اس نے اسی پر ہی قناعت نہیں کی اور آخرکار اس نے خدائی کا دعویٰ بھی کردیا مگر آخرالامر ۱۶۲ھ میں عباسی خلیفہ مہدی (۱۵۸ھ تا ۱۶۹ھ) نے ماوراء النہر کے علاقے میں قلعہ کیش کا محاصرہ کرلیا۔ جب مقنع کو اپنی گرفتاری اور موت کا یقین ہوگیا تو اس نے آگ جلائی اور اپنے چند ایک پیروکار کے ساتھ اس میں کود گیا[1] اور جل کر خاکستر

---

① بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ تیزاب سے بھرے ہوئے حوض میں کود پڑا تھا۔ اس طرح اس کا بدن اور ہڈیاں تیزاب میں حل ہوگئی تھیں۔ پھر جب قلعہ فتح ہوگیا تو اس (مقنع) کی تلاش ہوئی تو نہ وہ خود اور نہ ہی اس کی لاش دستیاب ہوسکی، تو اس کے ماننے والوں کو یقین ہوگیا کہ وہی حقیقی خدا تھا اور آسمانوں پر چلا گیا ہے، ورنہ اس کی لاش ضرور مل جاتی۔ اس سے پہلے اس نے اپنے معجزے (ماہِ نخشب) کے ذریعے لوگوں کو اپنے خدائی دعوے کا ثبوت فراہم کیا تھا۔ (مترجم)

ہوگیا۔ عطا مروی (مقنع) کے پیروکاروں نے کچھ عرصے کے بعد اسماعیلیہ مذہب اختیار کرلیا اور پھر باطنیہ فرقہ کے ساتھ ملحق ہوگئے۔

بارہ امامی شیعہ اور ان کا زیدیہ واسماعیلیہ کے ساتھ فرق

شیعوں کی اکثریت جس میں سے تمام مذکورہ فرقے، گروہ اور اقلیتیں نکلی اور جدا ہوئی ہیں، ان کو بارہ امامی یا اثنا عشری یا شیعہ امامیہ کہتے ہیں اور جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ اس مذہب کی پیدائش کی وجہ شروع میں ہی اسلامی مسائل میں سے دو بنیادی اصولوں اور مسئلوں کے بارے میں اختلاف نظر تھا اور یہ مذہب انھی دو اصولوں میں اعتراض کے طور پر پیدا ہوا تھا، لیکن اس فرقے میں حضرت رسول اکرم ﷺ کی تعلیمات کے بارے میں کسی قسم کا اختلاف نہیں تھا اور نہ ہی ان کو اسلامی قانون کے متعلق کوئی اعتراض تھا، وہ دو مسائل یہ ہیں یعنی: ''اسلامی حکومت'' اور علمی رہبری (قیادت) کو شیعہ ان کو اہل بیتؑ کا خصوصی حق سمجھتے ہیں۔

شیعہ کہتے ہیں: ''اسلامی خلافت کہ معنوی اور باطنی ولایت یا دینی رہبری اس کا جزو لاینفک ہے، حضرت علی علیہ السلام اور آپؑ کی اولاد کا حق ہے جو پیغمبر اکرم ﷺ کے واضح اعلان کے مطابق اہل بیتؑ کے امام ہیں، جن کی تعداد بارہ ہے اور پھر کہتے ہیں: قرآن مجید کی ظاہری تعلیمات جن کو احکام، قوانین اور شریعت کہا جاتا ہے، مکمل ضابطۂ حیات بھی ہے اور اپنی معنوی اصلیت کے اعتبار سے بھی مکمل ہے اور قیامت کے دن تک باطل اور منسوخ نہیں ہوگی۔ ان اسلامی قوانین واحکام کو صرف اہل بیتؑ ہی سے حاصل کیا جاسکتا ہے اور بس، لہٰذا یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ:

بارہ امامی شیعہ اور زیدیہ فرقہ کے درمیان کُلی طور پر فرق یہ ہے کہ زیدی شیعہ اغلب امامت کو اہل بیتؑ سے مخصوص نہیں جانتے اور اماموں کی تعداد کو بارہ (۱۲) پر منحصر ومحدود نہیں کرتے اور اہل بیتؑ کی فقہ کی پیروی بھی نہیں کرتے، جو بارہ امامی

شیعوں کے بالکل برعکس اور مخالف ہے۔ اس طرح بارہ امامی شیعہ اور اسماعیلی شیعہ کے درمیان مجموعی طور پر فرق یہ ہے کہ اسماعیلیہ فرقے کا اعتقاد یہ ہے کہ امامت سات کے عدد کے گرد گھومتی ہے اور نبوت حضرت محمد ﷺ پر ختم نہیں ہوئی ہے اور احکامِ شریعت میں تغیر وتبدل بلکہ اصل فرائض کو ختم کر دینا یا چھوڑ دینا، خصوصاً باطنیہ فرقہ کے قول کے مطابق کوئی گناہ نہیں ہے، لیکن اس کے برعکس شیعہ اثنا عشری یا بارہ امامی جو حضرت محمد ﷺ کو خاتم الانبیاء جانتے ہیں اور آپؐ کے بعد بارہ جانشینوں اور اماموں پر ایمان رکھتے ہیں اور اسی طرح ظاہری شریعت کو معتبر اور ناقابلِ منسوخ اور ناقابلِ تبدیل سمجھتے ہیں اور قرآن مجید کے لیے ظاہری اور باطنی معنوں پر مکمل یقین اور ایمان رکھتے ہیں۔

خاتمۂ باب

آخری دو صدیوں کے دوران بارہ امامی شیعہ میں سے دو دوسرے فرقے بنام "شیخیہ اور کریم خانیہ" پیدا ہو گئے ہیں۔ اگرچہ بعض مسائل میں دوسرے فرقوں کے ساتھ ان کا اختلاف ہے لیکن یہ اختلاف صرف فقہی مسائل میں ہے، نہ کہ نفی اور اثبات کے اصلی مسائل ہیں، لہٰذا ہم ان کو اصلی فرقے نہیں سمجھتے۔

اسی طرح ایک فرقہ "علی اللٰہی" کے نام سے بھی موجود ہے جو بارہ امامی شیعہ سے جدا اور الگ ہوا ہے۔ اس فرقے کو "غلاۃ" (غلو کرنے والا، مبالغہ کرنے والا) کہا جاتا ہے اور باطنیہ اور اسماعیلیہ کی طرح یہ فرقہ بھی صرف باطن پر ایمان رکھتا ہے، اور چونکہ اس فرقے کے پاس کوئی منظم اور مرتب منطق موجود نہیں ہے، اس لیے ہم اس فرقے کو شیعہ فرقوں میں شمار ہی نہیں کرتے۔

بارہ امامی شیعہ کی تاریخ کا خلاصہ

جیسا کہ پہلے ابواب میں واضح کیا جا چکا ہے کہ شیعوں کی اکثریت بارہ امامی

شیعہ پر منحصر تھی۔ یہ وہی جماعت تھی، جو حضرت علی علیہ السلام کی پیروکار اور جانب دار تھی اور جس نے حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد اہلِ بیتؑ کے حقوق کی بحالی اور خصوصاً خلافت اور دینی رہبری کے بارے میں اعتراضات کیے تھے، اور اس کے بعد اکثریتی جماعت (اہلِ سنت) سے الگ ہوگئی تھی۔

شیعہ، خلفائے راشدین (۱۱ھ تا ۳۵ھ) کے زمانے میں ہمیشہ سیاسی دباؤ کے زیرِ اثر رہے اور اس کے بعد بنو اُمیہ کی خلافت کے زمانے (۴۰ھ تا ۱۳۲ھ) میں وہ جان و مال کی حفاظت سے بھی محروم ہوگئے تھے لیکن جس قدر بھی ان پر ظلم و ستم اور سیاسی دباؤ زیادہ بڑھتا جاتا تھا، وہ اپنے عقیدے اور ایمان میں زیادہ سے زیادہ پختہ ہوتے جاتے تھے، خصوصاً اپنی مظلومیت اور محرومیت کی وجہ سے اپنے عقیدے اور نظریے کی وسعت اور ترقی میں زیادہ کوشش اور جدوجہد کرتے اور زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھاتے تھے۔ اس کے بعد دوسری صدی ہجری کے وسط میں جب کہ خلفائے عباسی نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو شیعوں نے اس زمانے کی ہرج و مرج اور بگڑتے ہوئے حالات کے پیشِ نظر کچھ امن و آرام کا سانس لیا مگر اس عارضی مدت اور مہلت کے بعد دوبارہ ان پر سختی شروع ہوگئی اور یہ سختی تیسری صدی ہجری کے آخر تک روز بروز بڑھتی ہی رہی۔

چوتھی صدی ہجری کے آغاز میں جب آلِ بویہ کے شیعہ حکمرانوں نے سلطنت شروع کی اور عنانِ اقتدار سنبھالی تو اس وقت شیعوں نے بھی طاقت حاصل کر لی۔ اس کے ساتھ ہی ان کو بہت کافی زیادہ آزادی مل گئی تھی، لہٰذا انھوں نے اعلانیہ طور پر اپنے مخالفوں کا مقابلہ شروع کر دیا تھا۔ پانچویں صدی ہجری تک حالات اسی طرح جاری رہے۔ چھٹی صدی ہجری کے اوائل میں مغلوں (تاتاریوں) کے حملے شروع ہوگئے جن کی وجہ سے ایران میں عام مصیبت پیدا ہوگئی اور دوسری طرف صلیبی جنگوں کے

شروع ہو جانے کے سبب اسلامی حکومتیں شیعوں پر زیادہ دباؤ نہیں ڈالتی تھیں اور خصوصاً بعض مغل سلاطین کے مذہب شیعہ اختیار کر لینے کی وجہ سے، اور اسی طرح مازندران کے علاقے میں مرعشی سلاطین کی حکومت کے سبب شیعوں کی ترقی اور وسعت میں بہت زیادہ مدد ملی۔ اس طرح تمام اسلامی ممالک کے کونے کونے میں اور خاص کر ایران میں شیعوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ محسوس ہونے لگا۔ نویں صدی ہجری تک یہی حالت قائم رہی اور تقریباً دسویں صدی ہجری کے شروع میں ایران میں صفوی حکومت کے ظہور سے مذہب شیعہ نے سرکاری مذہب کی حیثیت اختیار کر لی اور اب چودھویں صدی ہجری (یعنی آج تک) یہ مذہب سرکاری مذہب کے طور پر باقی ہے۔ اس کے علاوہ دنیا کے مختلف اسلامی ملکوں میں بھی کروڑوں کی تعداد میں شیعہ زندگی گزار رہے ہیں۔

دوسرا حصّہ

شیعوں کا علمی تفکّر

- مذہبی تفکّر کے معنی
- اسلام میں مذہبی تفکّر کے بنیادی معنی
- تین طریقے جن کی طرف قرآن کریم مذہبی تفکّر کے لیے رہنمائی کرتا ہے
- تین طریقوں کے درمیان فرق
- پہلا طریقہ: دینی ظواہر، دینی ظواہر کی اقسام، قرآن مجید، پیغمبر اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہلِ بیت علیہم السلام کی احادیث
- صحابہ کی احادیث
- کتاب وسنت کے بارے میں دوبارہ بحث
- قرآن مجید کا ظاہر اور باطن
- قرآن مجید کی تاویل
- حدیث کی بحث کا تتمہ
- حدیث پر عمل کے بارے میں شیعوں کا طریقہ
- اسلام میں عام تعلیم وتعلّم
- شیعہ اور نقلی علوم

مذہبی تفکر کے معنی

مذہبی تفکر اس بحث و جستجو اور تلاش میں غور و خوض کرنے کو کہتے ہیں، جس کے ذریعے مذہب کے اصولوں اور مذہبی مواد میں سے ایک اصل یا مادہ کے بارے میں مذہبی تعلیم سے نتیجہ اخذ کیا جا سکے جیسا کہ علم ریاضی میں تفکر، اس سوچ اور غور کو کہتے ہیں جس کے ذریعے ریاضی کے ایک مسئلے یا نظریے کے متعلق حل تلاش کر کے کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔

اسلام میں مذہبی تفکر کے بنیادی مآخذ

البتہ مذہبی تفکر کے لیے بھی دوسرے تمام تفکرات کی طرح مآخذ کی ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ فکری مواد انھی سے پیدا ہوتا ہے اور انھی پر تکیہ کرتا ہے جیسا کہ ریاضی کا ایک مسئلہ حل کرنے کے لیے تفکر میں معلومات کے تسلسل کو ذہن میں لانا پڑتا ہے جو آخرکار ایک نتیجے پر پہنچ جاتا ہے۔ صرف ایک مآخذ جس پر آسمانی دین اسلام تکیہ کرتا ہے (اس لحاظ سے کہ یہ دین آسمانی وحی تک پہنچتا ہے) قرآنِ مجید ہی ہے اور قرآنِ مجید، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور رسالت کی ہمیشگی، عمومی اور قطعی دستاویز ہے۔ اس آسمانی کتاب میں جو کچھ لکھا ہے، وہ اسلامی دعوت یا دین کہلاتا ہے، البتہ قرآن کریم کے واحد اور اکیلے مآخذ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ تفکر کے دوسرے صحیح منابع و مآخذ اور دلائل کو باطل یا منسوخ سمجھا جائے جیسا کہ ہم اگلے صفحات میں تفصیلاً بیان کریں گے۔

تین طریق جن کی طرف قرآنِ مجید مذہبی تفکر کے لیے رہنمائی کرتا ہے

قرآن کریم اپنی تعلیمات میں معارف اسلامی اور مقاصد دینی کو سمجھنے اور ان تک پہنچنے کے لیے اپنے پیروکاروں کے سامنے تین طریقے رکھتا ہے، اور یہ تین راستے ان کو دکھاتا ہے:

1. ظواہر دینی (شریعت)
2. عقلی حجت، اور
3. معنوی پہچان (شریعت، طریقت اور حقیقت) بندگی اور اخلاص کے ذریعے

اس کی وضاحت یوں ہوتی ہے کہ ہمیں معلوم ہے کہ قرآن کریم اپنے بیانات میں سب انسانوں کو مخاطب کرتا ہے اور کبھی کبھی اپنے قول کے مطابق کسی دلیل، حجت اور برہان کے بغیر صرف خداوند تعالیٰ کی فرمان روائی اور حکومت کو قبول کرنے، اعتقادی اصول مثلاً توحید، نبوت اور معاد کو ماننے اور اسی طرح عملی احکام مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کو تسلیم کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی بعض اعمال اور کاموں سے منع فرماتا ہے۔ قرآنِ مجید اگر ان لفظی بیانات کی دلیل نہ رکھتا تو ہرگز لوگوں کو فرمان برداری اور اس کے قبول کرنے کا حکم کبھی نہ دیتا، پس ناگزیر یوں کہنا چاہیے کہ قرآنِ مجید کے ایسے سادہ بیانات، مقاصد دینی اور معارف اسلامی کو سمجھنے کے لیے ایک مآخذ یا طریقے کا کام دیتے ہیں۔ ہم لفظی بیانات مثلاً امنوا باللّٰہ ورسولہ اور اقیموا الصلوٰۃ کو دینی ظواہر کہتے ہیں۔

اور دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ قرآنِ مجید اپنی بہت زیادہ آیات میں عقلی حجت (دلیل و برہان یا عقلی دلائل) کی طرف رہبری و رہنمائی کرتا ہے اور لوگوں کو انفس و آفاق کی نشانیوں میں غور و خوض کرنے کی دعوت دیتا ہے اور خود بھی حقائق کو واضح کرنے کے لیے عقلی دلائل اور استدلال کو بیان کرتا ہے، حقیقت میں دوری کوئی آسمانی کتاب قرآن کریم کی طرح اس قدر دلائلی علم و معرفت کو انسان کے لیے فراہم نہیں کرتی۔

قرآن مجید اپنے بیانات کے ذریعے عقلی حجت اور آزاد دلائلی استدلال (منطق) کو مسلّم سمجھتا ہے، یعنی یہ نہیں کہتا کہ سب سے پہلے معارف اسلامی کی

حقانیت کو قبول کرو اور پھر عقلی دلائل میں غور کر کے مذکورہ معارف اور علوم کو اس میں سے اخذ کرو، بلکہ اپنی واقعیت اور حقیقت پر کامل اعتماد رکھتے ہوئے فرماتا ہے کہ عقلی دلائل کو سمجھتے ہوئے مذکورہ علوم اور معارف کی حقانیت پر غور کرو اور پھر اسے قبول کرو اور وہ دعوئی اور باتیں جو تم اسلامی تحریک (دین اسلام) سے سنتے ہو، تم ان کی تصدیق آفرینش جہان (دنیا کی حقیقت اور فطرت) سے کرو، جو سچی اور حقیقی گواہی ہے اور پھر سند اور آخرکار صدق و ایمان کو اپنے غور وخوض اور دلائل کے نتیجے کے ذریعے حاصل کرو، نہ یہ کہ پہلے ایمان لے آؤ اور پھر اس کے مطابق دلائل لاؤ۔ پس فلسفی تفکر ایک ایسا طریقہ ہے، جس کی موجودگی کی قرآن کریم تصدیق کرتا ہے۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم بہت ہی دلچسپ اور واضح طور پر بیان کرتا ہے کہ دنیا کے سارے حقیقی علوم و معارف، توحید اور حقیقی خدا شناسی سے سرچشمہ حاصل کرتے ہیں اور خدا شناسی میں کمال صرف وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے ہر طرف سے اکٹھا کر کے صرف اپنے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں، جنھوں نے ہر طرف سے منہ موڑ کر اور ہر چیز کو بھول کر صرف اپنی بندگی اور اخلاص کی وجہ سے فقط عالمِ بالا (خدا تعالیٰ) کی طرف مبذول کر لی ہے اور خداوند عز وجل کے نور سے ان کی آنکھیں منور اور پُرنور ہو چکی ہیں۔ انھوں نے اپنی حقیقت بین آنکھوں سے اشیاء کی حقیقت، آسمانی فرشتوں اور زمین کی واقعیت کو دیکھ لیا ہے، کیونکہ اخلاص اور بندگی کے ذریعے وہ عین الیقین تک پہنچ چکے ہیں اور اسی یقین و ایمان کی وجہ سے ان کے سامنے عالم ملکوت، آسمان، زمین ہمیشہ کی زندگی اور ابدی دنیا کی حقیقت آشکار اور بے پردہ ہو گئی ہے۔

ان آیات کریمہ میں توجہ کرنے سے یہ دعوئی مکمل طور پر واضح ہو جاتا ہے:

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا نُوۡحِيۡۤ اِلَيۡهِ اَنَّهٗ لَاۤ

اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ○ (سورۂ انبیاء:۲۵)[1]

"اور (اے رسولؐ) ہم نے تم سے پہلے جب کبھی کوئی رسول بھیجا تو اس کے پاس ہم یہی وحی بھیجتے رہے کہ بس ہمارے سوا کوئی معبود قابلِ پرستش نہیں تو میری عبادت کیا کرو"۔

اور پھر فرماتا ہے:

سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ○ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِیْنَ ○ (سورۂ صافات:۱۵۹-۱۶۰)[2]

"یہ لوگ جو باتیں بنایا کرتے ہیں، ان سے خدا پاک صاف ہے مگر وہ لوگ جو خدا کے برگزیدہ اور خالص ہیں"۔

اور پھر فرماتا ہے:

قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یُوْحٰۤى اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَمَنْ كَانَ یَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْیَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا یُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا ○ (سورۂ کہف:۱۱۰)[3]

"اے نبیؐ! کہہ دو کہ میں بھی تمہاری طرح ایک انسان ہوں لیکن مجھے تمہارے خدا کی طرف سے وحی بھیجی جاتی ہے اور تمہارا خدا

---

① اس آیہ کریمہ سے واضح ہوتا ہے کہ دین خدا میں عبادات، توحید کی ایک شاخ ہے۔ یہ عبادات اسی توحید کی بنیاد پر واقع ہیں۔

② فرع کی توصیف و تعریف ہے: "سمجھنا" اور اس آیہ کریمہ سے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ خدا کے پاک اور مخلص بندوں کے علاوہ کوئی شخص بھی خدائے تعالیٰ کو جیسا کہ پہچاننا چاہیے، نہیں پہچان سکتا اور خدا تعالیٰ دوسروں کی عبادت سے بے نیاز ہے۔

③ اس آیہ کریمہ میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ حق کو دیکھنے اور اس تک پہنچنے کے لیے توحید اور نیک اعمال کیے بغیر کوئی راہ ممکن نہیں ہے۔

ایک ہے، پس جو کوئی خدا کی ملاقات کا اُمیدوار ہے اس کو نیک کام کرنے چاہئیں اور خدائے وحدہٗ لاشریک کے ساتھ عبادت میں کسی کو اس کا شریک نہ بنائے"۔

پھر فرماتا ہے:

- وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ○ (سورۂ حجر:۹۹)[1]

"اور اپنے پروردگار کی عبادت کرو یہاں تک کہ تم یقین (عین الیقین) تک پہنچ جاؤ"۔

اور پھر فرماتا ہے:

وَ كَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ○ (سورۂ انعام:۷۵)[2]

"اور اسی طرح ہم (اپنے پیغمبر) ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کے عجائبات دکھاتے تھے تا کہ وہ یقین کرنے والے لوگوں میں سے ہو (اس کو یقین ہو جائے اور اس کا ایمان مزید پختہ ہو جائے)"۔

اور پھر فرماتا ہے:

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ○ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ○ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ○ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ○ (سورۂ المطففین:۱۸-۲۰)[3]

---

[1] اس آیہ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حقیقی عبادت اور پرستش خدا پر یقین کا نتیجہ ہے۔

[2] اس آیہ کریمہ کا مطلب یوں ہے کہ یقین کے لوازمات میں سے ایک آسمانوں اور زمین دنیا کا مشاہدہ ہے۔

[3] آیات سے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ نیک بندوں کی تقدیر ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہے، جس کا نام "علیین" (بہت بلند) ہے کہ خدا کے مقرب بندے ہی اس کو دیکھ سکتے ہیں اور اسی طرح لفظ یشھدہ سے واضح ہے کہ یہ کتاب لکھی ہوئی نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب عالم تقرب اور ترقی و تکمیل ہے

"حقا کہ بے شک نیکوکار لوگوں کا تقدیر نامہ علیین میں لکھا ہوا ہے۔ کیا تو جانتا ہے کہ علیین کیا چیز ہے۔ علیین ایک لکھی ہوئی کتاب جس کی گواہی مقربانِ درگاہِ خدا دیتے ہیں"۔

اور پھر فرماتا ہے:

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ○ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ○ (سورۂ تکاثر: ۵-۶)[1]

"ہرگز نہیں، کیا تم جانتے ہو کہ علم الیقین کیا ہے؟ البتہ یہ اس وقت معلوم ہوگا، جب تم دوزخ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے"۔

پس خدائی معارف کو سمجھنے کے طریقوں میں سے ایک طریقہ پاکی نفس اور بندگی میں اخلاص ہے۔

ان تین طریقوں کے درمیان فرق

پچھلے بیان سے واضح ہوگیا ہے کہ قرآنِ مجید دینی معارف اور مفاہیم کو سمجھنے کے لیے تین طریقے پیش کرتا ہے۔ ظواہر دینی (شریعت) اور بندگی میں عقل و اخلاص، حقائق اور باطنی مشاہدات کے موجب ہیں، لیکن یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ تین طریقے چند لحاظ سے باہم فرق رکھتے ہیں:

پہلا "ظواہر دینی"، چونکہ ایسے لفظی بیانات ہیں، جو سادہ ترین الفاظ اور بیان میں بتائے گئے ہیں اور ان کو لوگوں کی دسترس اور اختیار میں دیا گیا ہے اور ہر شخص اپنے فہم و عقل کے مطابق ان سے بہرہ مند ہوتا ہے اور فائدہ اُٹھاتا ہے۔ یعنی دوسرے

---

[1] اس آیۂ کریمہ سے یوں سمجھ آتا ہے کہ علم یقین ظالم و ستم گار لوگوں کے انجام اور آخرت کے مشاہدے سے ہوگا، جس کو جہنم کہا گیا ہے (یعنی جب ان کو جہنم میں دیکھو گے تو تمہیں یقین آجائے گا)

دو طریقوں کے بالکل برعکس جو ایک خاص گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور عمومی نہیں ہیں۔[۱]

دوسرا، ظواہر دینی کا طریقہ وہ طریقہ ہے، جس پر چل کر اصول دینی، فروعات اور اسلامی معارف کو پہچان کر ایمانی اور عملی دعوت (اصولِ معارف اور اخلاق) تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے، دوسرے دو طریقوں کے بالکل برخلاف، کیونکہ اگرچہ عقل کے ذریعے اعتقادی، اخلاقی اور عملی مسائل کے کلیات کو سمجھا جاسکتا ہے لیکن احکام (شریعت) کی جزئیات چونکہ خاص مصلحتوں کی بنا پر عقل کی دسترس میں نہیں دی گئی ہیں، لہٰذا اس کے دائرۂ عمل سے خارج ہیں اور اسی طرح تہذیب نفس کا طریقہ ہے۔ چونکہ اس کا نتیجہ حقائق کے انکشاف پر مبنی ہے اور وہ ایسا علم ہے، جو خداداد ہے۔ اس لیے اس کے نتیجے اور اس سے حاصلہ حقائق کے لیے، جو اس خدائی عنایت کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں، کوئی حد معین نہیں کی جاسکتی یا اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ لوگ چونکہ ہر چیز سے الگ ہو چکے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا انھوں نے ہر چیز کو فراموش کر دیا ہے، لہٰذا وہ براہِ راست خدا کی ولایت اور سرپرستی کے دائرے میں چلے جاتے ہیں، پس خدا کی مرضی اور عنایت سے (نہ کہ ان کو اپنی مرضی سے) ہر چیز ان پر منکشف اور ظاہر و واضح ہو جاتی ہے۔

پہلا طریقہ: ظواہر دینی اور ان کی اقسام

جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا ہے، قرآنِ مجید جو اسلام کے بنیادی مذہبی تفکر کا مآخذ ہے، اپنے ظاہری الفاظ کے ذریعے اپنے قارئین اور سامعین کے سامنے حجت (برہان)

---

۱ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے اپنی ایک حدیث میں جس کو عام و خاص نے نقل کیا ہے فرمایا ہے کہ پیغمبروں کی جماعت لوگوں کے ساتھ ان کی عقل و دانش کے مطابق بات کرتی ہے۔
(بحار الانوار، جلد اوّل، ص ۳۷۔ اصول کافی، جلد اوّل، ص ۲۰۳)

پیش کرتا ہے اور بھی ظاہری آیات پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی احادیث کو دوسرے درجے پر رکھتی ہیں اور وہ بھی قرآن مجید کی طرح حجت (دلیل و برہان) لاتی ہیں۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الذِّكۡرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيۡهِمۡ (سورۂ نحل:۴۴)

"اور ہم نے تجھ پر ذکر (کتاب) نازل کیا تاکہ جو کچھ تم پر نازل کیا گیا ہے، اس کو لوگوں کے سامنے بیان کرو"۔

پھر فرماتا ہے:

هُوَ الَّذِىۡ بَعَثَ فِى الۡاُمِّيّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيۡهِمۡ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ (سورۂ جمعہ:۲)

"وہ (خدا) جس نے مکے والوں میں ان ہی میں کا ایک رسولؐ بھیجا، جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتا اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب (قرآن) اور حکمت (دانش و علم) سکھاتا ہے"۔

اور پھر فرماتا ہے:

لَقَدۡ كَانَ لَكُمۡ فِىۡ رَسُوۡلِ اللّٰهِ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ

"بے شک تمہارے لیے رسولؐ خدا کی اقتدا اور پیروی لازمی اور ضروری ہے"۔ (سورۂ احزاب:۲۱)

پس معلوم اور واضح ہے کہ اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے گفتار و اعمال اور حتیٰ کہ آپؐ کی خاموشی اور دستخط ہمارے لیے قرآن کی طرح حجت اور دلیل نہ ہوتے تو مذکورہ مفہوم اور مطلب بھی ٹھیک نہ ہوتا۔ پس پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا بیان ان لوگوں کے

لیے جنھوں نے خود آپؐ سے سنا، یا قابلِ اعتماد ذرائع سے ان تک پہنچا ہے، لازم الاتباع ہے (یعنی اس بیان کی اطاعت، پیروی اور پابندی لازمی ہے) اور اسی طرح آنحضرتؐ کے یہ بیانات قطعی تواتر احادیث[1] کی صورت میں ہم تک پہنچے ہیں، یعنی آپؐ کے اہلِ بیتؑ کے بیانات بھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیانات کے بعد قابلِ اعتماد اور معتبر ہیں اور اہلِ بیت علیہم السلام علمی رہبری رکھتے ہیں کیونکہ وہ اسلامی معارف اور احکام کے بیان میں ہرگز خطا اور غلطی نہیں کرتے، لہٰذا ان کے بیانات خواہ وہ زبانی ہوں یا لکھے ہوئے ہوں (البتہ قابلِ اعتماد ذرائع سے) حجت، دلیل اور برہان ہیں۔

اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ ظواہر دینی جو اسلامی تفکر میں ایک سند اور دستاویز ہے دو اقسام پر مشتمل ہے: "کتاب اور سنت" کتاب سے مراد قرآنی آیات کے ظاہری معنی ہیں اور سنت سے مراد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہلِ بیتؑ کی احادیث ہیں، جو ہم تک صحیح ذرائع سے پہنچی ہیں۔

صحابہ کی احادیث

لیکن وہ احادیث جو صحابہ کے ذریعے لکھی گئی یا نقل ہوئی ہیں، اگر وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول و فعل کے مطابق ہوں اور اہلِ بیتؑ سے روایت شدہ احادیث کے بھی مخالف نہ ہوں تو قابلِ قبول ہیں اور اگر خود صحابی کی نظر اور رائے کے مطابق ہوں تو وہ حجت و برہان نہ ہوں گی (قابلِ قبول نہ ہوں گی) اور صحابہ کا حکم بھی دوسرے تمام مسلمانوں کے برابر اور مانند ہے۔ خود اصحابِ رسول آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ایک عام مسلمان کی طرح سلوک کیا کرتے تھے۔

کتاب و سنت کے بارے میں دوبارہ بحث

کتابِ خدا (قرآنِ مجید) ہر قسم کے اسلامی تفکر کا بنیادی ماخذ ہے، اور یہ

---

[1] احادیث کی دستاویز پہلے حصے میں آچکی ہے۔

قرآن کریم ہی ہے جو دوسرے تمام دینی مآخذ کے ثبوت کو اعتبار بخشتا ہے اور ان کے معتبر ہونے کی سند دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید سب کے لیے قابل فہم ہے۔

اس کے علاوہ خود قرآن مجید اپنے آپ کو نور اور ہر چیز کو واضح کرنے والا بتاتا ہے اور چیلنج کرتے ہوئے لوگوں سے درخواست کرتا ہے کہ قرآنی آیات میں غور وخوض اور فکر کریں کہ اس کی آیات میں کسی قسم کا اختلاف اور تضاد موجود نہیں ہے اور اگر نہیں مانتے تو اس کی مانند کتاب لکھ کر لائیں اور اس کے ساتھ مقابلہ ومعارضہ کریں۔ واضح رہے کہ اگر قرآن مجید سب لوگوں کے لیے قابل فہم نہ ہوتا تو اس قسم کی حقانیت کے کوئی معنی ہی نہ ہوتے۔

البتہ ہرگز یوں نہیں سمجھنا چاہیے کہ قرآن مجید جو خود بخود قابل فہم ہے اور گزشتہ مطلب کے منافی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام اسلامی معارف اور علوم میں علمی مراجع (دینی اور علمی رہبر) ہیں اور وہ خود در حقیقت قرآن کریم کے مضامین میں سے ہیں کیونکہ بعض معارف اور علوم جن کو شریعت کے احکام اور قوانین کہا جاتا ہے، قرآن مجید ان کو مجموعی اور کلی طور پر بیان کرتا ہے لیکن ان کی تفصیلات کو جاننے کے لیے مانند نماز، روزہ وغیرہ اور اسی طرح لین دین اور دوسری عبادات وغیرہ سنت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیتؑ کی احادیث کی طرف رجوع کرنے سے واضح ہوتے ہیں اور یہ امور واحکام انہی پر موقوف ہیں۔

اسلام کا دوسرا حصہ جو اعتقادی اور اخلاقی تعلیمات اور اسی طرح معارف اسلامی پر مشتمل ہے اگرچہ ان کے مضامین اور تفصیلات عام افراد کے لیے قابل فہم ہیں لیکن ان کے معانی سمجھنے کے لیے اہل بیتؑ کی روش اختیار کرنی چاہیے۔ اسی طرح ہر قرآنی آیات کو اس کی دوسری آیات کے ساتھ ملا کر معنی، توضیح اور تفسیر کرنی چاہیے نہ کہ اپنے نظریے اور خیالات کے مطابق جیسا کہ ہمارے زمانے میں یہ رسم اور

عادت عام ہو چکی ہے اور ہم بھی اس طریقے سے مانوس ہو چکے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

قرآنِ مجید کی بعض آیات، بعض دوسری آیات کے ذریعے واضح ہوتی ہیں اور معنی دیتی ہیں، اور اس کی بعض آیات، بعض دوسری آیات کے متعلق گواہی دیتی ہیں اور ان کی تصدیق کرتی ہیں''۔[1]

اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

''قرآنِ مجید کے بعض حصے دوسرے حصوں کی تصدیق کرتے ہیں''۔ (درالمنثور، جلد۲، ص۶)

اور پھر آپ فرماتے ہیں:

''جو شخص قرآنِ مجید کی تفسیر صرف اپنے نظریے اور اپنی رائے کے مطابق کرے گا، وہ اپنے لیے جہنم میں ٹھکانہ بنائے گا''۔

(تفسیر صافی، ص۸۔ بحار الانوار، جلد۱۹، ص۲۸)

قرآن سے قرآن کی تفسیر کے لیے ایک بہت ہی سادہ سی مثال وہ ہے، جو خدا تعالیٰ قومِ لوط کے عذاب کی داستان میں ایک جگہ فرماتا ہے: ''ہم ان پر بُری بارش کریں گے''۔[2]

اور ایک دوسری جگہ اسی لفظ کو ایک دوسرے لفظ کے ساتھ بدل دیتا ہے اور فرماتا ہے: ''ہم ان پر پتھروں کی بارش کریں گے''۔[3]

---

① نہج البلاغہ خطبہ ۲۳۱ (اسلام اور قرآن) کے فٹ نوٹ میں بھی موجود ہے۔

② وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ (سورۂ شعراء: ۱۷۳) ''اور ہم نے ان پر بہت بُری بارش برسائی''۔

③ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ (سورۂ حجر: ۷۴) ''پس ہم نے شہروں کو زیروزبر کر دیا اور ان پر پتھروں کی بارش برسائی''۔

ان دو آیات کے انضمام سے واضح ہو جاتا ہے کہ بُری بارش کا مطلب "آسمانی پتھر ہے"۔ اگر کوئی شخص تحقیق و جستجو کے ساتھ اہل بیتؑ کی احادیث اور ان روایات سے جو مفسرین صحابہ اور تابعین سے ہم تک پہنچی ہیں، ان کے اندر معنی تلاش کرے تو اس میں کوئی شک وشبہ نہیں رہے گا کہ قرآن سے قرآن کی تفسیر کا طریقہ صرف اہل بیتؑ سے ہی مختص ہے۔

قرآن مجید کا ظاہر اور باطن

جیسا کہ ہمیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ قرآن کریم اپنے لفظی بیان کے ساتھ دینی مقاصد اور مطالب کو واضح کرتا ہے، اور لوگوں کو اعتقاد، ایمان اور عمل کے بارے میں احکام دیتا ہے، لیکن قرآن مجید کے مقاصد صرف اسی مرحلے پر منحصر یا ختم نہیں ہوتے بلکہ انہی الفاظ وعبادات کے اندر اور انہی مقاصد کے پردے میں ایک معنوی مرحلہ اور کئی دوسرے گہرے مقاصد اپنی بے انتہا وسعتوں کے ساتھ چھپے ہوئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے خاص بندے اپنے پاک دلوں کے ساتھ ان کو سمجھ سکتے ہیں۔

پیغمبر اکرم ﷺ جو قرآن مجید کے خدائی معلم ہیں، فرماتے ہیں:

"قرآن مجید کا ظاہر بہت ہی خوش آیند اور خوبصورت ہے اور اس کا باطن بہت ہی گہرا اور وسیع ہے"۔ (تفسیر صافی، جلد۴)

پھر فرماتے ہیں:[1]

"قرآن مجید کا ایک باطن ہے (ایک باطنی معنی ہے) اور ہر باطن کے اندر سات باطن (معنی) ہیں اور اسی طرح آئمہ اہل بیتؑ کی احادیث میں بھی قرآن کے باطن کی طرف بہت

---

[1] سفینۃ البحار، تفسیر صافی، ص ۱۵ اور تفسیر مرسلا میں آنحضرت ﷺ سے حدیث نقل کی گئی ہے اور تفسیر کافی، تفسیر عیاشی، معانی الاخبار میں بھی ایسی احادیث نقل ہوئی ہیں۔

زیادہ اشارے ہوئے ہیں"۔ (بحارالانوار، جلد اوّل، ص ۱۱۷)

ان احادیث کی اصل بنیاد اور ساکھ وہ مثال ہے، جو اللہ تعالیٰ سورہ رعد، آیہ ۱۷ میں بیان فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس آیہ کریمہ میں آسمانی فیض کو اس بارش سے تشبیہ دیتا ہے جو آسمان سے نازل ہوتی ہے اور زمین واہلِ زمین کی زندگیاں اس سے وابستہ ہیں۔ بارش آنے سے سیلاب جاری ہو جاتا ہے اور سیلاب کے مختلف راستے اپنے اندازے کے مطابق اس پانی کو اپنے اندر کھینچ لیتے ہیں اور ان کے اندر پانی بھر جاتا ہے اور وہ پانی جلدی ہو جاتا ہے۔ سیلاب کا پانی جھاگ اور کف سے پوشیدہ ہو جاتا ہے لیکن اس جھاگ کے نیچے بھی وہی پانی ہوتا ہے، جو زندگی بخش ہے اور لوگوں کے لیے بہت ہی فائدہ مند ہوتا ہے۔①

جیسا کہ مندرجہ بالا مثال میں خداوند تعالیٰ اشارہ کرتا ہے، آسمانی معارف اور قرآنی علوم جو انسان کی معنویت کو جان بخشتے ہیں، کو حاصل کرنے میں لوگوں کے فہم و ادراک اور سوچ کی گنجائش بھی مختلف ہوتی ہے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں، جو اس چند روزہ عارضی زندگی اور جہان گزراں میں مادے اور مادی زندگی کے علاوہ کسی اور چیز کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے اور اسی طرح مادی خواہشات کے بغیر کسی دوسری چیز میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے۔ اور مادی نقصانات کے سوا کسی اور چیز سے نہیں ڈرتے۔ ان لوگوں کو چاہیے کہ کم از کم اپنے درجات میں اختلاف کے لحاظ سے آسمانی معارف اور علوم کو قبول کریں اور اجمالی اعتقادات پر یقین کریں اور اسلام کے عملی دستور اور قانون پر عمل کریں اور آخرکار خدائے وحدہٗ لاشریک کی پرستش اور عبادت، قیامت

① أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ ○ (سورۂ رعد: ۱۷)

کے دن ثواب کی خواہش یا عذاب کے ڈر سے ہی کریں اور ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو صفائے باطن اور صفائے فطرت کے ذریعے اپنی سعادت اور خوش بختی کو اس دنیا کی چند روزہ اور عارضی زندگی کی لذتوں میں نہیں جانتے اور اس جہان کے سود و زیاں، نفع و نقصان، تلخیوں اور شیرینیوں کو ایک دھوکے باز خیال (سراب) کے سوا کچھ نہیں سمجھتے اور ایسے ہی اس کاروانِ ہستی کے گزرے ہوئے لوگ جو گزشتہ زمانے میں سرخرو زندگی گزار کر اس جہانِ فانی سے رخصت ہو چکے ہیں اور آج ہمارے لیے افسانہ بن چکے ہیں، ان کی زندگیوں اور کارناموں سے عبرت حاصل کرتے رہتے ہیں۔

یہ لوگ اپنے پاک دلوں کے ذریعے فطری طور پر ابدی دنیا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس ناپائیدار اور عارضی دنیا کے نقوش اور گوناگون نگاروں کو خدا تعالیٰ کی نشانیوں کے طور پر دیکھتے ہیں لیکن وہ اس کے لیے کسی قسم کی حقیقت، استقلال اور پائیداری کے قائل نہیں ہوتے۔

اس وقت یہ لوگ ان زمینی، دنیاوی اور آسمانی نشانیوں کے ذریعے خدائے پاک کی لامتناہی عظمت اور طاقت کو اپنے معنوی ادراک کے ساتھ مشاہدہ کرتے ہیں اور ان کے ناپاک دل آفرینش، فطرت اور حقیقت کے رموز کے واقف اور شیفتہ ہو جاتے ہیں اور وہ لوگ بجائے اس کے کہ ذاتی منفعت پرستی کے تنگ و تاریک غاروں میں مقید ہوں، ابدی دنیا کی لامتناہی فضا میں پرواز کرتے ہوئے اُوپر ہی اُوپر چلے جاتے ہیں۔

یہ لوگ جب آسمانی وحی کے ذریعے سنتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ بتوں کی پرستش سے منع فرماتا ہے، اس کے معنی ظاہری بتوں کے سامنے سجدہ نہ کرنے کے ہیں تو وہ اس ممنوعیت اور "نہی" کے ذریعے سمجھ جاتے ہیں کہ خدا کے سوا کسی اور کی پرستش اور اطاعت نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اطاعت کی حقیقت بھی بندگی اور سجدہ کرنے کے سوا

کچھ نہیں ہے۔ پھر وہ لوگ اس سے اور زیادہ سمجھ جاتے ہیں کہ خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرنا چاہیے اور نہ ہی کسی سے اُمید اور توقع رکھنی چاہیے۔ اس سے بھی اُوپر چلے جاتے ہیں اور ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ نفسانی خواہشات کے سامنے بھی سر تسلیم خم نہیں کرنا چاہیے، پھر اس سے بھی زیادہ سمجھ جاتے ہیں کہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہیے۔

اسی طرح جب کہ قرآن مجید کی زبانی سنتے ہیں کہ قرآن کریم نماز کا حکم دیتا ہے اور اس کے ظاہری معنی صرف مخصوص عبادت کی انجام دہی کے ہیں تو باطنی طور پر وہ سمجھ جاتے ہیں کہ جان و دل سے خدا کے سامنے خضوع و خشوع کے ساتھ سجدہ ریز ہو جانا چاہیے۔ پھر اس سے زیادہ سمجھتے ہیں کہ خدا کے سامنے اپنے آپ کو، ہیچ جاننا چاہیے اور اپنے آپ کو بھول جانا چاہیے اور صرف خدا کی یاد میں ہی مصروف رہنا چاہیے۔

جیسا کہ واضح ہے، مندرجہ بالا دو مثالوں میں جو باطنی معنی لکھے گئے ہیں وہ امرونہی کے لفظی معنی نہیں ہیں لیکن جو لوگ وسیع طور پر تفکر کرتے ہیں اور جہان بینی کو خود بینی پر ترجیح دیتے ہیں، ان کے لیے ان معانی کا ادراک ناقابلِ اجتناب ہے۔

گزشتہ بیان سے قرآن مجید کے ظاہری اور باطنی معنی واضح ہو گئے ہیں اور یہ بھی واضح ہو گیا ہے کہ قرآن مجید کا باطن اس کے ظاہر کو منسوخ نہیں کرتا بلکہ یہ ایک روح کی طرح ہے جو اپنے جسم کو زندگی اور جان دیتی ہے۔ اسلام ایک عمومی اور ابدی دین ہے، جو انسانیت کی اصلاح اور بہتری کے لیے آیا ہے اور اس کے سامنے معاشرے اور انسانوں کی اصلاح بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے، لہٰذا اسلام اپنے ظاہری قوانین سے جو معاشرے کی اصلاح کے لیے ہیں اور اپنے سادہ عقائد سے جو مذکورہ قوانین کے نگہبان اور محافظ ہیں، ہرگز ہاتھ نہیں اُٹھاتا یا ان کو نظرانداز نہیں کرتا۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک معاشرہ اس فریب اور دھوکے کے ساتھ کہ انسان کا دل پاک ہونا چاہیے اور عمل کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ہرج ومرج اور افراتفری کے ساتھ زندگی گزارے اور پھر بھی سعادت اور خوش بختی کو حاصل کرے؟ اور پھر یہ بھی کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ ناپاک کردار اور گفتار، ایک پاک دل کو جنم دے سکے یا ایک پاک دل سے ناپاک کردار اور گفتار جنم لے؟ خداوند تبارک وتعالیٰ اپنی کتاب مقدس میں فرماتا ہے:

"پاک لوگ پاک لوگوں میں سے ہیں اور ناپاک لوگ ناپاک لوگوں میں سے ہیں"۔

پھر فرماتا ہے:

وَ الْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَ الَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا كَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ

"اچھی زمین اپنی نباتات کو اچھی طرح پرورش کرتی ہے اور بُری زمین سے بُری فصل کے سوا کچھ پیدا نہیں ہوتا"۔ (سورۂ اعراف: ۵۸)

گزشتہ بیان کے ذریعے واضح ہوگیا ہے کہ قرآنِ مجید میں ظاہر اور باطن موجود ہے اور پھر باطن کے مختلف درجات بھی ہیں اور وہ احادیث نبویؐ جو قرآن کریم کے اس بیان کی تصدیق کرتی ہیں، اگلے صفحات میں آئیں گی۔

قرآنِ مجید کی تاویل

اسلام کے اوائل میں اکثریت اہلِ سنت میں یہ مشہور تھا کہ جس وقت ضرورت اور دلیل موجود ہو، قرآنِ مجید کے ظاہری معانی سے چشم پوشی کر کے معنوی اور باطنی معنی مراد لیے جاسکتے ہیں اور ان ظاہری معانی کے خلاف تفسیر کو "تاویل" کہا جاتا تھا، اور جس چیز کو قرآنِ مجید میں تاویل کہا گیا ہے، وہی معنی تفسیر کو دیئے جاتے تھے۔

اہلِ سنت کی مذہبی کتابوں اور اسی طرح مختلف مذاہب کے مناظروں میں جو

لکھے بھی جا چکے ہیں، یہ مسئلہ بہت زیادہ دکھائی دیتا ہے کہ ایک مسئلے میں جو مذہبی علما کے اجماع سے یا کسی اور وجہ سے ثابت ہو جاتا ہے۔ اگر ایک آیت کے ظاہری معنی دوسری قرآنی آیات کے مخالف ہوں تو اس آیت کی تاویل کر کے خلاف ظاہر معانی کر دیے جاتے ہیں اور کبھی کبھی دو مخالف گروہ اپنے دو متقابل اقوال کے لیے قرآنی آیات سے دلائل حاصل کرتے ہیں اور دونوں گروہوں میں سے ہر ایک گروہ کی آیات کی تاویل کرتا ہے۔

یہ طریقہ کم وبیش شیعہ مذہب میں بھی سرایت کر گیا ہے اور ان کی بعض علمِ کلام کی کتابوں میں بھی دیکھا جاتا ہے، لیکن جو چیز قرآنی آیات اور آئمہ اہلِ بیتؑ کی احادیث میں کافی غور وفکر کے بعد حاصل ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ قرآنِ مجید نے اپنے رس بھرے بیان اور واضح مطالب میں ہرگز معمہ گوئی اور مبہم روش کو اختیار نہیں کیا ہے اور اپنے مطالب اور مضامین کو سوائے ظاہری معانی کے، اپنے ماننے والوں کے سامنے پیش نہیں کرتا اور جس کو قرآنِ مجید میں تاویل کہا گیا ہے، وہ لفظی معنی نہیں ہیں بلکہ وہ حقائق ہیں، جو عام لوگوں کے فہم وادراک سے بہت بالاتر ہیں، جن میں سے اعتقادی معارف اور قرآنِ مجید کے عملی احکام سرچشمہ حاصل کرتے ہیں۔ ہاں! تمام قرآنِ مجید کی تاویل ہو سکتی ہے اور اس کی تاویل بھی براہِ راست غور وفکر اور فکر وتدبیر کے ذریعے قابلِ فہم نہیں ہے اور الفاظ کے ذریعے بھی ان کو بیان نہیں کیا جا سکتا اور صرف خدا کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، پاک لوگ اور اولیاء اللہ ہی جو انسانی آلائشوں سے پاک ہوتے ہیں، اپنے مشاہدات کے ذریعے ان کو سمجھ سکتے ہیں، مگر قرآنِ مجید کی تاویل قیامت کے دن سب لوگوں پر ظاہر ہو جائے گی۔

وضاحت: ہم بخوبی جانتے ہیں کہ جس چیز نے انسانوں کو بات کرنے، الفاظ بنانے اور ان الفاظ سے استفادہ کرنے پر مجبور کیا ہے، وہ معاشرتی اور مادی

ضروریات ہیں۔ انسان اپنی معاشرتی زندگی میں مجبور اور ناگزیر ہے کہ اپنے ضمیر کی آواز اور اپنے ارادے کو اپنے ہم جنسوں کے سامنے پیش کرے، ان کو اپنے دل کی بات بتائے اور سمجھائے، اسی وجہ سے وہ اپنی آواز اور اپنے کانوں سے مدد لیتا ہے اور اس کے علاوہ کبھی کبھی اشاروں اور آنکھوں سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک گونگے اور ایک نابینا فرد میں یہ مفاہمت نہیں پائی جاتی، کیونکہ جو بات نابینا کرتا ہے، گونگا اور بہرہ شخص اس کو نہیں سن سکتا اور جس چیز کے بارے میں گونگا اشارہ کرتا ہے اسے نابینا شخص نہیں دیکھ سکتا۔ اسی وجہ سے الفاظ بنائے گئے ہیں، جو مادی یا احساس کے نزدیک ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ شخص جس سے ہم بات کرنا چاہتے ہیں، اگر اس کے حواسِ خمسہ میں ایک حس کی کمی موجود ہے اور ہم اسی حس کے مطابق جو اس شخص میں موجود ہی نہیں ہے، بات کریں تو ایک قسم کی مثال دے کر اپنے مطلب کو واضح کرتے ہیں یا اشارہ کرتے ہیں۔ اور اگر ایک پیدائشی نابینا شخص ہو اور ہم اس کے ساتھ روشنی یا رنگ کے بارے میں بات کریں یا ایک بچے کے ساتھ جو ابھی سنِ بلوغ کو نہیں پہنچا ہے، جنسی عمل کی لذت کے متعلق بات کریں تو اپنے مطلب کو ایک دوسری چیز سے تشبیہ دے کر یا مقابلہ کر کے یا مناسب مثال دے کر اسے سمجھاتے ہیں اور یوں اپنے مطلب کو ادا کرتے ہیں، لہٰذا اگر فرض کریں کہ اس جہانِ ہستی میں بعض حقائق اور رموز موجود ہیں، جو مادے اور مادی آلائشوں سے پاک ہیں (اور حقیقت بھی یہی ہے) اور ہر زمانے میں انسانوں میں سے صرف چند لوگ ان کے مشاہدے اور ادراک کی صلاحیت رکھتے ہیں تو یہ حقائق و رموز لفظی بیانات اور عام تفکر کے ذریعے قابلِ فہم نہیں ہوں گے اور مثال و تشبیہ کے بغیر ان کے بارے میں کچھ بتایا نہیں جا سکے گا۔

اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے:

إِنَّا جَعَلْنَٰهُ قُرْءَٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝ وَإِنَّهُۥ فِىٓ أُمِّ الْكِتَٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِىٌّ حَكِيمٌ ۝ (سورۂ زخرف: ۳-۴)

"ہم نے اس کتاب کو پڑھے جانے والا الفاظ اور عربی زبان میں نازل کیا ہے تاکہ شاید تم غور کرو اور سمجھ سکو، حالانکہ یہ اُم الکتاب (لوحِ محفوظ) میں ہمارے پاس موجود ہے، جو بہت ہی بلند مقام ہے (یعنی عام فہم دماغ اس تک نہیں پہنچ سکتا اور اس کو نہیں سمجھ سکتا)"۔

اور پھر فرماتا ہے:

إِنَّهُۥ لَقُرْءَانٌ كَرِيمٌ ۝ فِى كِتَٰبٍ مَّكْنُونٍ ۝ لَّا يَمَسُّهُۥٓ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ (سورۂ واقعہ: ۷۷-۷۹)

"بے شک یہی کتاب یعنی قرآنِ مجید ہے جو بہت ہی عزیز اور گرامی ہے اور حقیقت میں یہ عام نظروں سے پنہاں ہے کہ کوئی آدمی اس کو چھو نہیں سکتا مگر خدا کے پاک بندے"۔

اسی طرح پیغمبر اکرمؐ اور آپؐ کے اہلِ بیتؑ کے بارے میں فرماتا ہے:

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ۝ (سورۂ احزاب: ۳۳)

"اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اے (پیغمبرؐ کے) اہلِ بیتؑ خدا تو بس یہ چاہتا ہے کہ تم کو (ہر طرح کی) بُرائی سے دُور رکھے اور جیسا پاک و پاکیزہ رہنے کا حق ہے ویسا پاک و پاکیزہ رکھے"۔

ان آیات کے ثبوت سے قرآن کریم کا منبع اور سرچشمہ اس جگہ ہے جہاں لوگوں کے فہم و ادراک کو ہرگز راہ نہیں ہے اور وہ لوگ اس تک پہنچنے سے عاری ہیں،

صرف خدا کے پاک بندوں کے سوا کسی شخص کو اس تک رسائی نہیں ہے اور نہ ہی کوئی اس کو سمجھ سکتا ہے اور نہ ہی اس کا دماغ وہاں تک پہنچ سکتا ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیتؑ انھی پاک بندوں میں سے ہیں۔

ایک اور جگہ فرماتا ہے:

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَ لَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ○ (سورۂ یونس: ۳۹)

"یہ لوگ جو قرآن مجید پر ایمان نہیں لاتے، وہ اس چیز کی تکذیب کرتے ہیں، جس کے علم میں وہ احاطہ نہیں کر سکتے اور ابھی تک اس کی تاویل ان پر ظاہر نہیں ہوئی ہے"۔ (یعنی یہ تاویل ان پر قیامت کے دن ظاہر اور واضح ہوگی، جب ہر چیز کو آنکھوں سے دیکھا جاسکے گا)۔

پھر ایک اور جگہ فرماتا ہے:

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ (سورۂ اعراف: آیہ ۵۳)

"جس دن قرآن کی تاویل (پورا قرآن) ظاہر ہوگی تو جن لوگوں نے اس کو فراموش کر دیا تھا، اس دن نبوت کی دعوت پر اعتراف کریں گے"۔

حدیث کی بحث کا تتمہ

اصل حدیث کا معتبر ہونا، جس کی قرآن مجید نے ضمانت اور تصدیق کر دی

ہے، اس کے بارے میں شیعوں اور تمام دیگر مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، لیکن اسلام کے اوائل میں حکمرانوں کی طرف سے حدیث نبویؐ کی حفاظت میں جو کوتاہی ہوئی اور ایسے ہی صحابہ اور تابعین کی طرف سے حدیثِ رسولؐ اکرم کو رواج دینے میں جو افراط (زیادتی) پیدا ہوئی اس کی وجہ سے حدیثِ نبوی سخت افسوس ناک حالت سے دوچار ہوگئی۔

ایک طرف تو خلفائے وقت حدیث لکھنے اور اس کی حفاظت سے منع کیا کرتے تھے اور ہر وہ ورق جس پر حدیث لکھی ہو، ملتا تھا تو اس کو ڈھونڈا اور کھوج کر جلا دیتے تھے اور کبھی کبھی حدیث بیان کرنے پر بھی پابندی عائد کردی جاتی تھی۔ اس وجہ سے بہت زیادہ احادیث میں تغیر و تبدل آ گیا، یا بہت سی احادیث بھول گئیں یا ان کو بیان نہ کیا گیا۔

دوسری طرف پیغمبر اکرم ﷺ کے صحابہ کرام جن کو پیغمبر اکرم کی احادیث سننے کا فخر حاصل رہا ہے، وہ خلفائے وقت اور عام مسلمانوں کے لیے قابلِ احترام تھے۔ انھوں نے احادیث کی ترویج شروع کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حدیث کو قرآنِ مجید پر فوقیت اور حکمرانی مل گئی اور کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ حدیث کے حکم سے قرآنِ مجید کی آیت کو منسوخ کر دیا جاتا تھا۔[1]

اور کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ حدیث کو نقل کرنے والے اشخاص ایک حدیث کو سننے کے لیے کئی کئی میل کے سفر کی صعوبت اٹھایا کرتے تھے۔ بعض غیر مسلم افراد جنھوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا اور ظاہری طور پر اسلام بھی قبول کرلیا تھا اور ایسے ہی اسلام کے اندرونی دشمنوں نے حدیث میں تغیر و تبدل شروع کر دیا اور

---

[1] حدیث کے ذریعے قرآنی آیت کو منسوخ کرنا "علم الاصول" کے مسائل میں سے ہے اور بعض علما اس کے قائل ہیں۔ باغ فدک کے مسئلے سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ اوّل بھی اس کے قائل تھے۔

اس طرح حدیث کا اعتبار اور وثوق ختم کر دیا گیا۔(۱)

اسی وجہ سے اسلامی دانش وروں کو فکر لاحق ہوئی اور انھوں نے راہِ حل ڈھونڈنا شروع کیا، پھر انھوں نے بعض علوم پیدا کیے یعنی علمِ رجال اور علمِ درایت وغیرہ تاکہ درست اور غلط احادیث کو ایک دوسرے سے جدا کیا جائے۔

لیکن شیعہ باوجودیکہ حدیث کی سند اور اصلاح اور پاک کرنے کے لیے کوشش کرتے ہیں، حدیث کے متن کو قرآن کریم سے بھی مطابقت دیتے ہیں اور حدیث کے معتبر ہونے کے لیے اس عمل کو ضروری جانتے ہیں۔

مذہب شیعہ میں بہت زیادہ احادیث پیغمبر اکرم ﷺ اور آئمہ اہلِ بیتؑ سے پہنچی ہیں جن کی قطعی سند موجود ہے کیونکہ وہ حدیث جو قرآنِ مجید کے مخالف ہو، ہرگز قابلِ قبول نہیں ہے اور صرف اسی حدیث کو ہی معتبر جاننا چاہیے جو قرآن کے معنی مطابق ہو۔ (بحار الانوار، جلد اوّل، ص ۱۳۹)

اس بیان کے مطابق وہ احادیث جو قرآنِ مجید کے مخالف ہوں، شیعہ ان پر عمل نہیں کرتے اور ایسے ہی وہ احادیث جن کی قرآنِ مجید کے ساتھ مخالفت یا مطابقت معلوم نہیں، ان کے بارے میں آئمہ اہلِ بیتؑ کی طرف سے جو حکم ملتا ہے، قبول یا ردّ کیے بغیر ان کو ویسا ہی چھوڑ دیا جاتا ہے اور ان کے متعلق بحث نہیں کرتے، البتہ شیعہ مذہب میں بھی ایسے آدمی مل جاتے ہیں، جو اہلِ سنت کی طرح، جو حدیث ان کو مل جاتی ہے اس پر عمل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ (بحار الانوار، جلد اوّل، ص ۵۵)

(۱) اس مطلب کی شہادت میں بہت زیادہ کتابوں کے نام لیے جا سکتے، کہ علما نے احادیث کو جعل کیا ہے اور اسی طرح کتب رجال میں "جھوٹے راوی" یا "احادیث جعل کرنے والوں" کے طور پر تعارف کرایا گیا ہے۔

حدیث پر عمل کے بارے میں شیعوں کا طریقہ

وہ حدیث جو بلاواسطہ پیغمبر اکرم ﷺ اور آئمہ اہل بیتؑ کی زبانی سنی گئی ہو، وہ قرآن کریم کا حکم رکھتی ہے، لیکن وہ حدیث جو بعض ذرائع سے ہم تک پہنچی ہو، شیعہ اس حدیث پر مندرجہ ذیل طریقے سے عمل کرتے ہیں:

اعتقادی معارف میں نصِ قرآن کی رُو سے علم اور یقین ضروری ہے، لہٰذا جو احادیث متواتر (احادیثِ ثقہ) ہیں یا کوئی ایسی حدیث ہے جو قرائن و شواہد کے ذریعے ثقہ احادیث کے زمرے میں آتی ہے، اس پر عمل ضروری اور لازمی ہے، ان دو طریقوں کے علاوہ کسی دوسرے طریقے سے جس کو "خبرِ واحد" (یعنی وہ احادیث، جو صرف ایک ہی ذریعے سے حاصل ہوئی ہے) کہتے ہیں۔ کسی حدیث کو قابلِ اعتبار اور قابلِ اعتماد نہیں کہا جاسکتا۔

لیکن شرعی احکام میں جب کسی حکم کا نتیجہ حاصل کیا جاتا ہے،① تو تعیّن شدہ طریقے اور دلائل پر نظر رکھتے ہوئے "حدیثِ متواتر اور حدیث قطعی" کے علاوہ "خبرِ واحد" (حدیثِ واحد) پر بھی عمل کیا جاتا ہے، بشرطیکہ اگر وہ کسی ذریعے اور طریقے سے قابلِ یقین اور قابلِ وثوق ہو۔

پس احادیث متواتر اور احادیثِ قطعی، شیعوں کی نظر میں مکمل طور پر لازم الاتباع یا واجب العمل (جن پر عمل کرنا فرض اور ضروری ہو) ہیں اور اسی طرح غیر قطعی اور غیر یقینی (خبر واحد) احادیث، بشرطیکہ کسی طریقے اور ذریعے سے قابلِ یقین ہو جائیں تو صرف شرعی احکام میں ہی حجت اور برہان ہوں گی (یعنی صرف شرعی احکام میں ہی ان کی پیروی اور اطاعت ضروری ہوگی نہ کہ تمام اُمور میں) اور یہ احادیث لازم الاتباع نہیں ہیں۔

---

① علم الاصول میں سے "خبرِ واحد" کے اعتبار کے بارے میں بحث۔

اسلام میں عام تعلیم و تعلّم

علم حاصل کرنا دین اسلام کے فرائض میں سے ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے اور قطعی شواہد سے تصدیق شدہ احادیث کے مطابق، اس علم کا مطلب اسلام کے تین اصولوں (توحید، نبوت، معاد یعنی روز قیامت) کو جاننا ہے، اور ایسے ہی ان کے قریبی علوم کو سمجھنا ہے، پھر اسلامی احکام اور قوانین کی تفصیلات کو سمجھنا ہے، یعنی ان تمام علوم کو حاصل کرنا فرض ہے، جس قدر بھی ہر انسان کرسکتا ہو اور زندگی میں اسے ضرورت ہوتی ہو۔ (بحار الانوار، جلد اوّل، ص ۵۵)

البتہ واضح ہے کہ اصول دین کے ساتھ علم حاصل کرنا، خواہ وہ اجمالی لحاظ سے ہی کیوں نہ ہو، ہر شخص کے لیے میسر ہے اور ہر انسان کی طاقت میں بھی ہے، لیکن دینی قوانین اور احکام کے تفصیلی معنی کے لحاظ سے کتاب وسنت (فقہ استدلالی کے بارے میں ٹیکنیکل اور مستند علم حاصل کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے اور صرف بعض لوگ ہی اسے حاصل کرسکتے ہیں اور اسلام میں طاقت فرسا (حرجی) حکم نہیں آیا ہے (یعنی کوئی ایسا حکم نہیں دیا گیا جس کی وجہ سے انسان کو دکھ اور تکلیف ہو)۔

لہٰذا دلیل و برہان کے ذریعے دینی قوانین واحکام کے بارے میں علم حاصل کرنا "واجب کفایہ" ہے اور صرف بعض افراد سے متعلق ہے جو اس کی صلاحیت اور طاقت رکھتے ہیں اور باقی تمام افراد کا فرض یہ ہے (جیسا کہ عام دستور اور قانون کے مطابق یعنی جاہل شخص ایک عالم اور فاضل شخص کی طرف رجوع کرے، عالم کی طرف رجوع کرنے کا طریقہ) کہ مذکورہ اشخاص کی طرف رجوع کریں (جن کو مجتہد اور فقیہ یا عالم کہا جاتا ہے) اور اس رجوع کو تقلید کہا جاتا ہے، البتہ یہ رجوع اور تقلید اس رجوع اور تقلید کے علاوہ ہے، جو اصول و معارف میں موجود ہے اور قرآن کریم کی نصِ صریحہ

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (سورۂ اسراء:۳۶) کے مطابق ممنوع ہے۔[1]

یہ جاننا چاہیے کہ شیعہ ابتدائی تقلید میں مُردہ مجتہد کی تقلید کو جائز نہیں جانتے، یعنی جو شخص مسئلے کو اجتہاد کے ذریعے نہیں جانتا اور دینی فرض کے مطابق اس ایک مجتہد کی تقلید کرنی چاہیے، بس وہ مجتہد جو زندہ نہیں ہے، اس کے نظریے کی تقلید نہیں کر سکتا۔ البتہ اگر اس مجتہد کی زندگی میں اس کی تقلید کرتا رہا ہو، اس کی وفات کے بعد بھی وہ اس کا مرجع تقلید باقی رہے گا (یعنی مجتہد کی وفات کے بعد بھی اس کی تقلید کو جاری رکھ سکے گا) اور یہ مسئلہ شیعوں کی اسلامی فقہ کو زندہ اور تازہ رکھنے کے عناصر و عوامل میں سے ہے تاکہ کچھ لوگ ہمیشہ اجتہاد تک پہنچنے کی کوشش اور جدوجہد کرتے رہیں اور اس طرح فقہی مسائل میں اپنی تحقیق جاری رکھ سکیں۔ لیکن اہل سنت پانچویں صدی ہجری میں اجماع اُمت کی وجہ سے اپنی فقہ کے چار اماموں یعنی امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ۔ امام شافعیؒ اور امام احمد حنبلؒ میں سے ایک کی تقلید کرتے ہوئے اجتہاد کو آزاد نہیں سمجھتے اور اسی طرح ان چار اماموں کی تقلید کے علاوہ کسی اور کی تقلید کو بھی جائز نہیں سمجھتے، اور اس کے نتیجے میں ان کی فقہ اسی سطح پر باقی رہ گئی ہے جیسا کہ بارہ سو سال پہلے تھی، لیکن اس آخری زمانے میں بعض افراد نے پرانی اجماع اور تقلید سے انکار کرتے ہوئے آزاد اجتہاد کو شروع کر دیا ہے۔

شیعہ اور نقلی علوم

اسلامی علوم جو علمائے اسلام کی تدوین و اختراع اور ایجاد کے مرہونِ منت ہیں، دو حصوں میں منقسم ہیں، یعنی "علومِ عقلی" اور "علومِ نقلی"۔ علومِ نقلی وہ علوم ہیں جن کے مسائل کو لکھا جاتا ہے یا زبانی بیان کیا جاتا ہے، مثلاً علم لغت، علم حدیث، علم تاریخ اور ایسے ہی دوسرے علوم اور علومِ عقلی ان کے علاوہ دوسرے تمام علوم ہیں مثلاً

---

[1] ان مسائل کو سمجھنے کے لیے علم الاصول سے اجتہاد اور تقلید کی بحث کی طرف رجوع کریں۔

علمِ فلسفہ اور علمِ ریاضی وغیرہ جن کے بارے میں غور وفکر کی ضرورت ہے۔
اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اسلام میں علومِ نقلی کی پیدائش کا اصلی سبب یا عنصر خود قرآن کریم ہی ہے اور دو تین علوم یا فنون مثلاً تاریخ، انساب اور عروض کے علاوہ باقی تمام علوم ہی آسمانی کتاب کے خانہ زاد ہیں۔
مسلمانوں نے دینی تحقیق و بحث کی رہنمائی میں ان علوم کو شروع کیا ہے، جن میں اہم عربی ادبیات، علمِ نحو، صرف معانی، بیان، بدیع ولغت وغیرہ شامل ہیں اور ایسے ہی دینی ظواہر کے متعلقہ علوم مثلاً علمِ قرأت، علمِ تفسیر، علمِ حدیث، علمِ رجال، علمِ درایت، علمِ اصول اور علمِ فقہ ہیں۔
شیعوں نے بھی کوشش اور ہمت کے مطابق ان علوم کی تدوین اور تصنیف میں بہت ہی اہم اور خصوصی حصہ لیا، بلکہ ان میں سے بہت زیادہ علوم کے بانی بھی شیعہ ہی تھے، جیسا کہ علمِ نحو (عربی زبان کی گرامر) کو ابوالاسود دئلی نے جو پیغمبر اکرم ﷺ اور حضرت علی علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھے، حضرت علیؑ کی رہنمائی میں تدوین کیا تھا، اور اسی طرح علمِ فصاحت و بلاغت، علم معانی، بیان اور بدیع کے بہت بڑے مصنفین میں سے ایک صاحب بن عباد شیعہ تھے، جو آلِ بویہ کے وزیر تھے (وفیات ابن خلکان، ص ۷۸)۔ اسی طرح سب سے پہلے لغت کی کتاب "کتاب العین" ہے، جو مشہور و معروف دانش ور اور ماہر علوم شیعہ خلیل بن احمد بصری نے لکھی تھی، جو علمِ عروض کے بانی اور مصنف تھے اور علمِ نحو میں سیبویہ نحوی کے استاد بھی تھے۔ (وفیات ابن خلکان، ص ۱۹۰۔ اعیان الشیعہ اور دوسری تمام کتب ترجمہ)
عاصم کی قرأت قرآن بھی ایک واسطے سے حضرت علی علیہ السلام تک پہنچتی ہے اور عبداللہ بن عباسؓ جو علمِ تفسیر میں سب سے پہلے صحابی شمار ہوتے ہیں، حضرت علی علیہ السلام کے شاگردوں میں سے تھے اور علمِ حدیث اور علمِ فقہ میں اہلِ بیتؑ اور ان کے شیعوں

کی کوششیں اور اسی طرح اہل سنت کے چار فقیہوں (فقہ کے چار اماموں) کا شیعوں کے پانچویں اور چھٹے امام کے ساتھ تعلق بھی مشہور ہے۔ اصول فقہ میں بھی وحید بہبہانی (وفات: ۱۲۰۵ھ) کے زمانے میں عجیب ترقی ہوئی خصوصاً شیخ مرتضی انصاریؒ (وفات: ۱۲۸۱ھ) کے ذریعے اصول فقہ (شیعہ) نے جو ترقی کی وہ اہل سنت کے اصول فقہ سے قابل موازنہ نہیں ہے۔ (اتقان سیوطی)

دوسرا طریقہ: عقلی بحث

- عقلی، فلسفی اور کلامی تفکر
- اسلام کے فلسفی اور کلامی تفکر میں شیعوں کی پیش قدمی
- فلسفہ اور دوسرے تمام عقلی علوم کے بارے میں شیعوں کی اَن تھک کوششیں
- شیعوں میں فلسفہ کیوں باقی رہ گیا ہے؟
- شیعوں میں سے چند ایک مشہور علمی شخصیتیں

عقلی، فلسفی اور کلامی تفکر

اس سے پہلے بھی بیان کیا جاچکا ہے کہ قرآن کریم نے علمی تفکر (غور وفکر) کے لیے بہت زیادہ تاکید کی ہے، اور اس کو مذہبی تفکر کا جز قرار دیا ہے البتہ انعکاس کے طور پر عقلی تفکر نے بھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور حقانیت کی تصدیق کرنے کے بعد قرآنی ظواہر (شریعت کے احکام) جو آسمانی وحی ہیں اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہلِ بیت علیہم السلام کے بیانات کو بھی عقلی حجت کی صف میں لاکھڑا کیا ہے اور وہ عقلی دلائل جو انسان اپنی خداداد فطرت اور نظریات کے ذریعے ثابت کرتا ہے، وہ دو قسم کے ہیں: "برہان اور جدل"۔

برہان: وہ حجت اور دلیل ہے، جس کے مواد ابتدائی اور حقیقی ہوں۔ اگرچہ مشہور یا مسلّم بھی نہ ہوں۔ دوسرے الفاظ میں وہ مسائل ہیں، جن کی ضروریات کو انسان اپنے خداداد شعور سے سمجھ لیتا ہے اور تصدیق کرتا ہے، جیسا کہ ہم جانتے ہیں (تین کا عدد چار کے عدد سے چھوٹا ہے) اس قسم کا تفکر، عقلی تفکر کہلاتا ہے۔ اگر یہ تفکر اس دنیا کے اندر مجموعی طور پر انجام پذیر ہو، مثلاً آفرینش کے مبدا میں تفکر، لہٰذا دنیا اور اہلِ دنیا کا انجام فلسفی تفکر کہلائے گا۔

جدل: وہ دلیل، بحث یا برہان ہے، جس کا سارا یا کچھ مواد مشہور یا مسلّم اشیا یا دلائل سے لیا گیا ہو، جب کہ مختلف ادیان یا مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان معمول ہے کہ اپنے مذہبی عقائد اور نظریات کو اس مذہب کے مسلّمہ اصول کے ساتھ ثابت کرتے ہیں۔

قرآن مجید نے دونوں طریقوں کو استعمال کیا ہے اور ان دونوں طریقوں کے

بارے میں قرآنِ مجید میں بہت سی آیات موجود ہیں۔ سب سے پہلے تو (قرآنِ مجید) کائنات کے کلیات اور ہر دو جہان کے مجموعی نظام اور ایسے ہی خاص نظاموں مثلاً آسمان، زمین، چاند، سورج، ستاروں، دن رات، نباتات، حیوانات اور انسانوں کے متعلق آزاد تفکر کی دعوت دیتا ہے اور آزاد عقل تحقیق کی بہترین الفاظ میں تعریف و توصیف کرتا ہے اور پھر عقلی، جدلی تفکر جس کو عام طور پر ''بحثِ کلامی'' کہا جاتا ہے، کے لیے حکم صادر کرتا ہے بشرطیکہ یہ امر بہترین طریقے سے (یعنی بغیر کسی ضد بازی کے اچھے اخلاق کے ساتھ حق کا اظہار) انجام پائے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَ الۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ وَجَادِلۡهُمۡ بِالَّتِیۡ هِیَ اَحۡسَنُ (سورہ نحل:۱۲۵)

''(اے رسولؐ) تم (لوگوں کو) اپنے پروردگار کی راہ پر حکمت اور اچھی اچھی نصیحت کے ذریعے بلاؤ اور بحث ومباحثہ کرو بھی تو اس طریقے سے جو (لوگوں کے نزدیک) سب سے اچھا ہو''۔

اسلام کے فلسفی اور کلامی تفکر میں شیعوں کی پیش قدمی

یہ تو مکمل طور پر واضح ہے کہ شیعہ اقلیت، سنی اکثریت سے ابتدائے اسلام میں ہی جدا اور الگ ہوگئی تھی اور ہمیشہ اپنے مخالفین کے بارے میں خاص نظریات رکھتی تھی اور اپنے مخالف (اہلِ سنت) کے ساتھ دلائل کے ساتھ بحث کرتی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ دلائل کے ساتھ بحث کرنا دو طرفہ ہے اور طرفین اس میں برابر کے شریک ہوتے ہیں لیکن ہمیشہ شیعہ حملہ کرتے تھے اور دوسرے دفاع کرتے تھے اور جو شخص حملے میں پیش قدمی کرتا ہے وہ مجبور ہے کہ کافی ساز وسامان سے لیس ہو۔

پھر وہ ترقی جو تدریجاً کلامی بحثوں کو نصیب ہوئی اور دوسری صدی ہجری اور تیسری صدی ہجری کے آغاز میں معتزلی مذہب کے شروع ہوجانے سے یہ ترقی اوج

پہنچ گئی اور شیعہ محققین اور علمائے مکتب اہل بیتؑ کے شاگردوں میں تھے، بلکہ ان متکلمین (بحث کرنے والوں) کی صف اوّل میں شمار ہوا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ اہل سنت کے متکلمین (ماہرین علم کلام) کا سلسلہ بھی اشاعرہ اور معتزلہ سے ہوتا ہوا شیعوں کے پہلے امام، حضرت علی علیہ السلام تک پہنچتا ہے (شرح ابن ابی الحدید، اوائل، جلد اوّل)۔

لیکن وہ لوگ جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کی کتابوں سے پوری طرح واقفیت رکھتے ہیں، وہ یہ بخوبی جانتے ہیں کہ صحابہ کی ان تمام کتابوں میں (جن کی تعداد تقریباً بارہ ہزار تک پہنچتی ہے) حتیٰ کہ ایک کتاب بھی فلسفی تفکر کے بارے میں نہیں لکھی گئی ہے، اور صرف حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام ہی تھے، جن کے دلچسپ اور دلکش بیانات "علم الٰہیات" کے عمیق ترین فلسفی تفکر پر مشتمل ہیں۔

صحابہ اور علمائے تابعین، جو اصلی صحابہ کے بعد آتے ہیں اور آخرکار عربی لوگ اس زمانے میں آزاد فلسفی تفکر سے واقفیت اور آشنائی نہیں رکھتے تھے لہٰذا پہلی صدی کے دانش مندوں اور علما کے اقوال و بیانات میں فلسفی تحقیق کا کوئی نہ کوئی نمونہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ صرف شیعہ اماموں کے پُرمغز بیانات اور خصوصاً امامِ اوّل اور امامِ ہشتم کے بیکراں علمی خزانے فلسفی افکار پر مشتمل ہیں اور انھوں نے ہی اپنے شاگردوں اور ماننے والوں کی ایک اچھی تعداد و جماعت کو اس طرزِ فکر سے آشنا کیا تھا۔

عربی لوگ فلسفی طرزِ فکر سے ناواقف تھے، یہاں تک کہ دوسری صدی ہجری کے آغاز میں بعض فلسفے کی کتابوں کا ترجمہ یونانی زبان سے عربی زبان میں کیا گیا تھا۔ اس کے بعد تیسری صدی ہجری کے اوائل میں یونانی، سریانی اور دوسری زبانوں سے بہت زیادہ کتابیں عربی زبان میں ترجمہ ہو گئیں۔ اس طرح فلسفی طرزِ تفکر عام لوگوں کی دسترس میں آ گیا، مگر پھر بھی اکثر فقہا اور متکلمین (ماہرین علم کلام) فلسفہ اور

دوسرے تمام عقلی علوم کی طرف، جو تازہ وارد مہمانوں کی حیثیت رکھتے تھے، زیادہ توجہ نہیں کرتے تھے، اور یہ مخالفت شروع شروع میں اس لیے زیادہ مؤثر واقع نہ ہوئی تھی کیونکہ حکومتِ وقت ان علوم کی حمایت کیا کرتی تھی، لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد حالات بالکل تبدیل ہو گئے اور فلسفے کی کتابوں کے مطالعے کی سخت مخالفت اور ممانعت کے ساتھ ساتھ فلسفے کی تمام کتابوں کو سمندر میں پھینک دیا گیا اور رسائل اخوان الصفا جو مصنفین کی ایک گمنام جماعت کے ذہن کی تراوش ہے، ابھی تک اس زمانے کی یادگار باقی ہے۔

یہ رسائل اس بات کی گواہی اور شہادت دیتے ہیں کہ اس زمانے میں کیسے پریشان کن اور آشفتہ حالات تھے۔ اس زمانے کے بعد چوتھی صدی ہجری کے آغاز میں فلسفہ، ابونصر فارابی کے ذریعے دوبارہ زندہ ہو گیا، اور پانچویں صدی ہجری کے شروع میں مشہور فلسفی دانشور بوعلی سینا کی کوششوں سے اس علم کی توسیع اور تکمیل ہوئی۔ چھٹی صدی ہجری میں بھی شیخ شہاب الدین سہروردی نے فلسفہ اشراق کو پاک کیا اور اسی جرم کی وجہ سے ہی سلطان صلاح الدین ایوبی کے ایما پر اس کو شہید کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد بھی اکثر لوگوں کے درمیان فلسفہ کی کہانی تقریباً ختم ہو گئی اور کوئی مشہور فلسفی پیدا نہ ہوا، سوائے اس کے کہ ساتویں صدی ہجری میں اندلس میں جو اسلامی ممالک میں شمار ہوتا تھا، ابن رشد اندلسی پیدا ہوئے، جنھوں نے فلسفے کو پاک اور پاکیزہ کرنے کی کوشش کی۔[1]

فلسفہ اور دوسرے تمام نقلی علوم میں شیعوں کی اَن تھک کوشش

شیعہ مذہب اور شیعہ، دانشور جیسا کہ شروع سے ہی فلسفی تفکر کی پیدائش میں

[1] مندرجہ بالا مطالب اخبار الحکما اور وفیات ابن خلکان اور دوسری ترجمہ کی کتابوں سے اخذ کیے گئے ہیں۔

ایک اہم عنصر رہے ہیں۔ اس قسم کے تفکر کی پیش رفت اور علوم نقلی کی ترویج میں بھی اہم رکن تھے اور ان علوم کی ترقی کے لیے ہمیشہ کوشش کیا کرتے تھے کیونکہ اگرچہ ابن رشد کی وفات سے اہل سنت کے اکثر لوگوں میں فلسفہ ختم ہوگیا تھا مگر شیعوں کے درمیان ختم نہیں ہوا تھا۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد بعض مشہور فلسفہ دان مثلاً خواجہ نصیرالدین طوسی، میرداماد اور صدرالمتالہین پیدا ہوئے جو یکے بعد دیگرے فلسفہ کی تعلیم اور تحریر کے لیے بہت زیادہ کوشش کرتے رہے ہیں۔ اس طرح تمام عقلی علوم میں بعض دانش ور مثلاً خواجہ نصیرالدین طوسی اور بیرجندی وغیرہ پیدا ہوئے۔

یہ سب علوم اور خصوصاً فلسفہ الٰہی شیعوں کی اَن تھک کوششوں کی وجہ سے بہت زیادہ ترقی کر گیا جیسا کہ خواجہ نصیرالدین طوسی، شمس الدین ترک، میرداماد اور صدرالمتالہین کی کتابوں کے مطالعے اور گزشتہ دانش مندوں کی کتب کے ساتھ مقابلہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے۔

شیعوں میں فلسفہ کیوں باقی رہ گیا؟

کیونکہ شیعوں میں فلسفی اور عقلی تفکر کی پیدائش میں اہم ترین اور موثر ترین عنصر علمی ذخائر اور خزانے تھے۔ اور یہ تفکر شیعوں کے ذریعے ہی دوسروں کے درمیان پیدا ہوا جو شیعوں کے اماموں اور پیشواؤں سے یادگار کے طور پر باقی رہ گیا تھا۔ اس طرز تفکر کی بقا میں اہم اور موثر عنصر شیعوں کے درمیان وہ علمی ذخائر ہیں، جن کو شیعہ احترام اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور اس مطلب کی وضاحت کے لیے کافی ہے کہ اہل بیتؑ کے علمی ذخائر کا فلسفے کی کتابوں کے ساتھ مقابلہ کریں، جو کہ ہر زمانے میں لکھی گئی ہیں، کیونکہ اس طرح ہمیں صاف طور پر نظر آ جائے گا کہ دن بہ دن فلسفہ مذکورہ علمی ذخائر کے بہت نزدیک آتا جا رہا تھا، یہاں تک کہ گیارہویں صدی ہجری میں تقریباً ان دونوں (اہل بیتؑ کی علمی کتابوں اور فلسفہ کی کتابوں) نے مطابقت پیدا

کرلی ہے اور ان کے درمیان سوائے تعبیر اور تشریح کے کوئی فاصلہ نہ رہا)۔

شیعوں میں سے چند ایک مشہور علمی شخصیتیں

الف: الاسلام شیخ محمد بن یعقوب کلینی (وفات ۳۲۹ ہجری قمری) شیعوں میں سے پہلے شخص تھے، جنھوں نے شیعہ روایات واحادیث کو اصول سے (ہر محدث نے جو احادیث آئمہ اہل بیتؑ سے اخذ کی ہیں، ان کو جمع کرتے تھے) اور مذکورہ کتاب کو "اصل" کہا جاتا ہے) نکال کر اور ان کے بارے میں بڑے غور وخوض سے تحقیق کر کے ان کو ابواب فقہ کی ترتیب اور اعتقاد سے مرتب کیا تھا۔ ان کی کتاب جو "کافی" کے نام سے مشہور ہے تین حصوں میں منقسم ہے، یعنی اصول، فروع اور روضہ (متفرقہ) اور اس کتاب میں سولہ ہزار ایک سو ننانوے (۱۶,۱۹۹) احادیث ہیں۔ اس طرح یہ کتاب حدیث کی کتابوں میں ایک معتبر اور مشہور کتاب ہے، جو دنیائے شیعہ میں موجود ہے اور تین دوسری کتابیں جو "کافی" کے بعد آتی ہیں وہ یہ ہیں: "کتاب فقیہ" مؤلفہ شیخ محمد صدوق محمد بن بابویہ قمی (وفات ۳۸۱ ہجری قمری)، کتاب تہذیب اور کتاب استبصار، تالیف شیخ طوسی (وفات: ۴۶۰ھ ق)

ب: ابوالقاسم جعفر بن حسن بن یحییٰ حلی المشہور "بہ محقق" (وفات: ۶۷۶ھ ق)
آپ ماہر فقہ اور شیعہ فقیہوں میں سب سے بڑے عالم تھے، ان کے فقہی شاہکاروں میں سے ایک کتاب "نافع" اور دوسری کتاب "شرائع" ہے، جو سات سو سال تک فقیہوں کے درمیان بہت زیادہ مشہور اور مقبول رہی ہیں اور ان کتابوں کو بڑی قدردانی اور عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

محقق حلی کے بعد شہید اول شمس الدین محمد بن مکی کو شمار کرنا چاہیے، جن کو ۷۸۶ھ ق میں دمشق میں شیعہ ہونے کے الزام میں شہید کردیا گیا تھا۔ ان کے فقہی شاہکاروں میں سے ایک کتاب "لمعہ دمشقیہ" ہے، جو ان کی گرفتاری کے بعد

سات دن کے اندر جیل میں لکھی گئی تھی اور اسی طرح شیخ جعفر کاشف الغطاء نجفی (وفات: ۱۲۲۷ھ ق) کو بھی انھی دانشوروں میں شمار کرنا چاہیے۔ ان کے فقہی شاہکاروں میں ایک کتاب ''کشف الغطاء'' ہے۔

ج: شیخ مرتضیٰ انصاری شوشتری جنھوں نے ۱۲۸۱ھ ق میں وفات پائی، انھوں نے علم اصولِ فقہ کو کانٹ چھانٹ کر صاف کیا اور عملی اصول کے طریقے کو جو اس فن اور علم کا سب سے اہم حصّہ ہے، تحریر فرمایا۔ اب ایک سو سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے کہ ان کا مکتب تمام شیعہ فقہا کے لیے معتبر اور جاری ہے۔

د: خواجہ نصیرالدین طوسی (وفات ۶۷۶ھ ق) آپ سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے علمِ کلام کو فنی اور ٹیکنیکل شکل میں مدوّن کیا اور ان کے علمی شاہکاروں میں سے ایک کتاب ''تجرید الکلام'' ہے، جس کو سات سو سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے لیکن یہ کتاب اب تک اہلِ فن کے درمیان معتبر ہے اور اسی لیے عام و خاص نے اس کتاب پر بہت زیادہ شرحیں لکھیں اور حاشیے بھی لکھے ہیں۔ خواجہ نصیرالدین طوسی علمِ کلام میں بہت مہارت رکھنے کے علاوہ فلسفہ اور ریاضیات میں بھی اپنے زمانے کی ماہر شخصیت رہے ہیں اور اس دعوے کا بہترین ثبوت ان کی گرانقدر تالیفات ہیں جو انھوں نے تمام عقلی علوم میں لکھی تھیں۔ ان عقلی علوم میں سے وہ رصدخانہ بھی ہے جو آپ نے مراغہ شہر میں ہلاکو خان کی حکومت میں بنوایا تھا۔

ھ: صدرالدین محمد شیرازی (ولادت: ۹۷۹ھ ق وفات ۱۰۵۰ھ ق) آپ سب سے پہلے فلسفی ہیں جنھوں نے فلسفے کے مسائل کو (اگرچہ فلسفہ صدیوں تک اسلام میں مختلف مراحل طے کرتا رہا تھا) انتشار اور پراگندگی سے باہر نکالا اور ریاضی کی طرح اس کو ایک منظم اور مرتب شکل دی۔

اس طرح سب سے پہلے تو فلسفے کو یہ امکان اور وقار ملا کہ وہ سیکڑوں فلسفی

مسائل جو پہلے کبھی فلسفہ میں داخل اور قابلِ بحث نہیں سمجھے گئے تھے اب ان کو پیش اور حل کیا گیا۔ پھر عرفانی مسائل کو (کہ اس زمانے تک ایسے مسائل کو ورائے عقل کی قسم یا نا قابلِ ادراک اور ایسی معلومات میں شمار کیا جاتا تھا، جو حس و ادراک اور فہم وشعور سے بالاتر ہیں) بڑا آسان اور قابلِ بحث بنایا، اور ان کے بارے میں بحث اور نظریات قائم کیے۔ تیسرا یہ کہ ظواہر دین (احکامِ شرع) میں بہت سے علمی ذخیرے اور خزانے اور ائمہ اہلِ بیتؑ کے گہرے فلسفی بیانات جو صدیوں تک لاینحل معمّہ کے طور پر موجود تھے اور ان میں سے اکثر "متشابہات" میں شمار ہوتے تھے، حل اور واضح ہو گئے اور اسی طرح دینی ظواہر، عرفان اور فلسفہ میں بھی ایک قسم کی مکمل مفاہمت پیدا ہو گئی اور ان تینوں علوم نے ایک مشترکہ راستہ اختیار کر لیا۔ صدرالمتألہین سے پہلے بھی بعض دانش مند اور فلسفی پیدا ہوئے تھے۔ مثلاً شیخ شہاب الدین سہروردی مؤلف کتاب "حکمۃ الاشراق" چھٹی صدی ہجری کے فلسفی اور شمس الدین محمد ترکہ جو آٹھویں صدی ہجری کے فلسفی تھے وغیرہ، جنھوں نے اس میدان میں مؤثر قدم اٹھائے لیکن مکمل کامیابی صدرالدین شیرازی صدرالمتألہین کو ہی ملی۔

صدرالمتألہین اس روش اور طریقے کے ذریعے کامیاب ہو گئے کہ "جوہری حرکت" کے نظریے کو ثابت کریں اور اس کے بعد "رابع اور نظریۂ اضافیت" کو (ذہن کے باہر، نہ ذہن اور فکر کے اندر) دریافت کریں۔ انھوں نے تقریباً پچاس کتابیں اور رسالے تصنیف وتالیف کیے اور ان شاہکاروں میں سے ایک کتاب "اسفار" چار جلدوں پر مشتمل ہے۔

تیسرا طریقہ: عقلی بحث

- انسان اور عرفانی ادراک
- اسلام میں عرفان کا ظہور
- عرفانِ نفس اور اس کے منصوبوں کی طرف کتاب وسنت کی رہنمائی

انسان اور عرفانی ادراک

اگر چہ دنیا کے تمام انسان اپنی معاشی حالت کو سدھارنے اور روزمرہ زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف ہیں اور معنویات کی طرف توجہ نہیں دیتے لیکن اس کے باوجود ان افراد کی سرشت میں ایک فطرت یا احساس موجود ہے، جس کو حقیقت بینی کا "احساس یا غریزہ" کہا جاتا ہے، جو کبھی کبھی بعض انسانوں میں پیدا اور جاری ہوتا ہے اور یہی احساس ان کو بعض معنوی مطالب کے سمجھنے کے لیے اُبھارتا ہے۔

ہر انسان (سوفسطائیوں اور شکاکوں کے علاوہ جو حقیقت اور واقعیت کو ایک خیال وگمان یا فہم وخرافات جانتے ہیں) ایک ثابت اور مستقل حقیقت پر ایمان رکھتا ہے اور جب کبھی اپنے صاف ذہن اور پاکیزہ فطرت کے ساتھ اس کائنات کی مستقل اور ثابت حقیقت میں غور کرتا ہے تو اس وقت اس دنیا کے تمام اجزا کی ناپائیداری کو سمجھ لیتا ہے۔ دنیا اور دنیا کے مظاہر کو ایک آئینے کی طرح دیکھتا ہے، جو خوبصورتی کی مستقل حقیقتوں کو نظروں کے سامنے لے آتے ہیں کہ ان حقائق کو سمجھنے کی لذت دیکھنے والوں

کی نظروں میں ہر دوسری لذت کو ذلیل و خوار اور پست کر دیتی ہے، لہٰذا فطری طور پر یہ لذتیں انسان کو ان دوسری تمام لذتوں کی طرف لے جانے سے روکتی ہیں جو اس دنیا میں موجود ہیں اور مادّی زندگی کی ناپائیدار لذتوں پر مبنی ہیں۔

یہ وہی عرفانی جذبہ ہے جو خداشناس انسان کو عالم بالا (خدا) کی طرف متوجہ کرتا ہے اور خدائے پاک کی محبت کو انسان کے دل میں جاگزیں کرتا ہے اور اللہ کے سوا ہر چیز کو بھلا دیتا ہے اور اس طرح انسان کی تمام مادّی، دنیاوی آرزوؤں اور خواہشوں پر خطِ بطلان کھینچ لیتا ہے۔ پھر انسان کو خدائے غائب کی پرستش اور عبادت کے لیے اُبھارتا ہے، جہاں ہر چیز واضح اور آشکار ہو جاتی ہے۔ درحقیقت یہ بھی باطنی کشش کا نتیجہ ہے، جس کے ذریعے خدائی اور آسمانی مذاہب اس دنیا میں پیدا ہوئے ہیں، "عارف" اس شخص کو کہا جاتا ہے جو مہر و محبت اور عشق کے ساتھ خدا کی عبادت اور پرستش کرے، نہ کہ ثواب کی اُمید اور عذاب کے ڈر سے۔[1]

یہاں یہ چیز واضح ہو جاتی ہے کہ عرفان کو ہرگز دوسرے مذاہب کے مقابلے میں ایک مستقل مذہب نہیں جاننا چاہیے بلکہ عرفان عبادات کے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے (یعنی محبت اور عشق کے ساتھ عبادت، نہ کہ اُمید اور خوف سے) اور مذاہب کے حقائق کو سمجھنے کے لیے ایک راستہ ہے، جو ظواہر دینی اور عقلی تفکر کے مقابلے میں ایک طریقہ ہے۔

خدا پرستی (توحید) کے تمام مذاہب حتیٰ کہ مجوسیت (دو خداؤں پر ایمان) میں

[1] امام ششم (جعفر صادق علیہ السلام) فرماتے ہیں: "عبادت تین قسم کی ہے: ایک جماعت ڈر اور خوف سے خدا کی عبادت کرتی ہے اور وہ غلاموں کی عبادت ہے۔ دوسرا گروہ نیک صلے اور ثواب کی خاطر خدا کی پرستش کرتا ہے اور ایسی پرستش مزدوروں کی پرستش ہے لیکن بعض لوگ مہر و محبت اور عشق کے ساتھ خدا کی عبادت کرتے ہیں اور یہی عبادت آزاد لوگوں کی عبادت کہلاتی ہے اور یہی سب سے اچھی عبادت ہے"۔ (بحار الانوار، جلد ۱۵، ص ۲۰۸)

بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو سلوک (عرفان) کے ذریعے خدا تک پہنچتے ہیں یا عبادت کرتے ہیں اور ایسے ہی مجوسیت، یہودیت، عیسائیت، مجوسیت اور اسلام میں بھی عارف لوگ موجود ہیں اور غیر عارف بھی۔

اسلام میں عرفان کا ظہور

پیغمبر اکرم ﷺ کے اصحاب میں (جن کی تعداد کتب رجال میں تقریباً بارہ ہزار لکھی ہوئی ہے اور ان کی شناخت ہو چکی ہے) سے صرف حضرت علی علیہ السلام ہی ہیں جن کے فصیح و بلیغ بیانات عرفانی حقائق اور معنوی زندگی کے مراحل اور بیکراں علمی ذخائر پر مشتمل ہیں۔ وہ تحریریں جو تمام صحابہ کرام سے ہم تک پہنچی ہیں، ان میں اس قسم کے مسائل موجود نہیں ہیں۔ آپؑ کے اصحاب اور شاگردوں میں سے بعض سلمان فارسیؓ، اویس قرنیؓ، کمیل بن زیادؓ، رشید ہجریؓ اور میثم تمارؓ ایسے اشخاص بھی موجود ہیں، جن کو عام اسلامی عارف لوگ حضرت علی علیہ السلام کے بعد اپنے سلسلوں کے بانی اور روحانی مرشد کہتے ہیں۔ اس گروہ اور طبقے کے بعد بعض دوسرے افراد مثلاً طاؤس یمانی، مالک بن دینار، ابراہیم ادھم اور شقیق بلخی ایسے افراد ہیں، جو دوسری صدی ہجری میں پیدا ہوئے تھے اور تصوف و عرفان کو آشکار نہ کرتے ہوئے بھی عام زاہدوں اور لوگوں کے لیے اولیاء اللہ اور پاک بندوں کے طور پر مشہور تھے لیکن بہرحال یہ لوگ اپنے سے پہلے طبقے کے ساتھ اپنے تعلقات کو مخفی نہیں رکھتے تھے۔

اس طبقے کے بعد دوسری صدی ہجری کے آخر اور تیسری صدی ہجری کے آغاز میں ایک دوسرا گروہ پیدا ہوا، جن میں بایزید بسطامی، معروف کرخی، جنید بغدادی اور ایسے ہی دوسرے اولیاء اللہ شامل ہیں، جنھوں نے عرفانی سیر و سلوک کی وادی میں قدم رکھا اور تصوف و عرفان کو آشکارا کیا کرتے تھے۔ یہ لوگ کشف و شہود اور کرامت کا اظہار بھی کیا کرتے تھے، لہٰذا یہ لوگ اپنے ناشائستہ اور ناپسندیدہ اظہارات و بیانات کی

وجہ سے اپنے وقت کے فقیہوں اور متکلمین (ماہرین علم کلام) کو اپنے خلاف اُبھرنے کا موقع دیا کرتے تھے، جس کے نتیجے میں ان کے لیے بہت زیادہ مشکلات پیدا ہوگئیں۔ اس طرح ان میں سے بہت زیادہ افراد کو قید و بند اور شکنجوں کی سزائیں دی گئیں، حتیٰ کہ بعض کو سولی پر بھی چڑھا دیا گیا۔

اس کے باوجود یہ لوگ اپنے مخالفوں اور دشمنوں کا مقابلہ کیا کرتے تھے اور اس طرح دن بہ دن طریقت میں توسیع اور ترقی ہوتی رہی، یہاں تک کہ ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں یہ تصوف و عرفان اور طریقت بہت زیادہ وسعت اور طاقت اختیار کر گئی۔ اس کے بعد کبھی اوج اور کبھی تنزل پر پہنچتی رہی اور آج تک اپنے طریقوں اور زندگی کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ (ترجمہ شدہ کتابوں مثلاً تذکرۃ الاولیاء، [عطار] اور تصوف کی دوسری کتابوں کی طرف رجوع کریں)

اگرچہ مشائخ عرفان، جن کے نام تذکروں میں محفوظ ہیں، ظاہری طور پر مذہب اہلِ سنت رکھتے ہیں، اور وہ طریقت جو آج ہم مشاہدہ کرتے ہیں (کہ ایک قسم کے آداب و رسوم پر مشتمل ہے اور کتاب و سنت میں ایسی تعلیم ہرگز موجود نہیں ہے) انہی کی یادگار ہے، پھر بھی ان کے بعض آداب و رسوم شیعوں میں بھی سرایت کر چکے ہیں یا شیعوں سے ملتے جلتے ہیں۔

جیسا کہ کہا جاتا ہے، ایک گروہ کا عقیدہ یہ تھا کہ اسلام میں سیر و سلوک کا منصوبہ یا پروگرام صاف طور پر بیان نہیں کیا گیا ہے بلکہ معرفتِ نفس (خودی) کا طریقہ ہی ایسا طریقہ ہے، جس کو مسلمانوں نے شروع کیا تھا اور یہی خدا کا پسندیدہ اور مقبول طریقہ ہے مثلاً رہبانیت کا طریقہ حضرت عیسیٰ مسیح کی دعوتِ حق اور تبلیغ دین میں موجود نہ تھا لیکن عیسائیوں نے خود بخود اس کو گھڑ کر مقبول بنا دیا ہے۔[1]

---

[1] اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَ رَهْبَانِيَّةَ ۨابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ ←

اس طرح مشائخ طریقت میں سے ہر ایک نے جس طرح بھی آداب و رسوم کے مطابق ٹھیک سمجھا، اسے اپنے سیر و سلوک کے پروگراموں اور منصوبوں میں جاری کر دیا اور اپنے مریدوں کو حکم دیا کہ اس طریقے کی پیروی کریں لہٰذا یہ طریقہ یا پروگرام آہستہ آہستہ ایک مستقل اور وسیع شکل اختیار کر گیا۔ مثلاً مریدی اختیار کرنے کی رسومات، ذکر اور وظیفے کی تلقین، خرقہ پہنانا، موسیقی کا استعمال، خوراک و غذا کا پروگرام، ذکر اور وظیفے کے وقت وجد میں آنا اور کبھی کبھی بعض فرقوں میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ شریعت کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا اور پھر شریعت و طریقت میں جدائی پڑ گئی، لہٰذا اس طریقے کے جانب دار اور طرف دار و پیروکار عملی طور پر باطنی فرقے کے ساتھ ملحق ہو گئے، لیکن شیعوں کے عقیدتی قوانین کے پیش نظر جو چیز حقیقی اسلام اور اس کے اصلی اصولوں اور اسناد سے ثابت ہوتی ہے (یعنی کتاب و سنت سے) وہ اس عقیدے اور طریقے کے بالکل خلاف ہے اور اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ دینی اسناد و بیانات (آیات و احادیث) اس حقیقت کی طرف رہنمائی نہیں کرتے یا اس کے بعض پروگراموں اور منصوبوں کو واضح کرنے میں سستی کرتے ہیں یا کسی شخص کے متعلق (خواہ کوئی بھی ہو) فرائض اور حلال و حرام کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

عرفانِ نفس اور اس کے منصوبوں کی طرف کتاب و سنت کی رہنمائی

اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں چند جگہ فرماتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ لوگوں کو چاہیے کہ قرآنِ مجید میں تفکر اور غور کریں اور اس کے ساتھ ہی اس کے احکام پر عمل کریں اور

← رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا (سورۂ حدید آیہ ۲۷) "اور وہ رہبانیت جس کو عیسائیوں نے خود گھڑ لیا ہے، ہم نے اسے اس طرح ان پر نازل کیا ہے بلکہ ہمارا مقصد تو یہ تھا کہ وہ خدا کی رضا کو قبول کریں، لیکن انھوں نے جس طرح کہ چاہیے تھا خدائے تعالیٰ کی رضا کو مدنظر نہیں رکھا۔

صرف معمولی اور سطحی طور پر سمجھنے پر ہی قناعت نہ کریں اور اپنی بہت زیادہ آیات میں دنیائے فطرت کا اور اس کے علاوہ جو کچھ اس میں موجود ہے، کسی استثنا کے بغیر اپنی آیات اور نشانیوں کا تعارف کراتا ہے۔

آیت یا نشانی کے معنی میں تھوڑا سا غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آیت یا نشانی اس وجہ سے آیت اور نشانی ہے کہ دوسری چیز کو واضح کرے نہ کہ اپنے آپ کو مثلاً سرخ بتی جو خطرے کی علامت ہے اور ایک جگہ پر نصب کی جاتی ہے، اس کو دیکھنے سے انسان صرف سرخ بتی کی طرف توجہ نہیں کرتا (بلکہ خطرے کی طرف توجہ کرتا ہے) اور اگر بتی کی شکل اور شیشے کی خاصیت یا رنگ کا خیال کرے تو اس کے ذہن میں بتی کی صورت یا شیشے اور رنگ کے سوا کچھ نہیں آئے گا، نہ کہ خطرے کا تصور۔

لہٰذا اگر دنیا اور دنیا کے مظاہر سب کے سب اور ہر لحاظ سے خداوند کریم کی نشانیوں کے طور پر سمجھے جائیں تو یہ سب چیزیں الگ وجود کی مالک نہیں ہوں گی اور جس طرح بھی ان میں غور کیا جائے خداوند پاک کی نشانیوں اور علامتوں کے سوا اور کوئی چیز نظر نہیں آئے گی، اور جو شخص قرآنی تعلیمات اور ہدایات کے ذریعے اس تصور سے دنیا اور اہلِ دنیا کی طرف توجہ کرے کہ وہ خدائے پاک کے سوا کسی اور چیز کو نہیں دیکھے گا اور اسی طرح دنیا کی خوبصورتی اور رعنائی جو دوسرے لوگوں کو جہان کے نقشے پر نظر آتی ہے، کے مقابلے میں وہ ایک لامتناہی خوبصورتی کو دیکھے گا، جو اس دنیا کے تنگ دریچے سے اپنی تجلی کو ظاہر کرتی ہے اور اس وقت انسان اپنی زندگی کے خرمن کو برباد کر کے اپنے دل کو خدا کی محبت اور عشق میں محو کر دیتا ہے۔

جیسا کہ واضح ہے، یہ ادراک کانوں، آنکھوں یا دوسرے حواس یا عقل و خیال کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتا، کیونکہ ان چیزوں یا اعضا کا کام خود بھی خدا کی نشانیوں اور علامتوں یا آیات میں ہے لہٰذا یہ تمام حواس اس ادراک و ہدایت کو حاصل کرنے

میں عاجز اور قاصر ہیں۔①

اور وہ سالک جو خدا کی یاد میں ماسوا اللہ کو فراموش کرنے کی کوشش نہیں کرتا، جب وہ سنتا ہے کہ خداوند تبارک وتعالیٰ اپنے کلامِ پاک میں ایک جگہ فرماتا ہے:

يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ (سورۂ مائدہ:۱۰۵)

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اپنے نفس (خودی) کو پہچانو، کیونکہ جب تم نے حقیقی راستے کو پہچان لیا تو دوسرے لوگ جو گم راہ ہو چکے ہیں تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے"۔

تو اس وقت سمجھ لے گا کہ صرف وہی شاہراہ جس پر چل کر حقیقی اور کامل ہدایت حاصل کی جا سکتی ہے، انسانی نفس (خودی) کا ہی راستہ ہے اور انسان کے حقیقی راہنما نے جو اس کا خدا ہے، اس انسان کو ذمہ دار اور خود مختار بنا دیا ہے، تاکہ اپنے آپ کو پہچانے اور تمام دوسرے راستوں اور طریقوں کو نظر انداز کر کے صرف نفس (خودی) کا طریقہ اپنائے اور اپنے نفس (ذات) کے ذریعے خدا کو دیکھے اور پہچانے، پھر اپنے حقیقی اور واقعی مطلوب کو پالے گا۔

اس طرح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ

"جس شخص نے اپنے آپ کو پہچان لیا، اس نے خدا کو پہچان لیا"۔

اور پھر فرماتے ہیں:

اَعْرَفُكُمْ بِنَفْسِهٖ اَعْرَفُكُمْ بِرَبِّهٖ

① حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: خدا وہ نہیں جو کسی کی عقل و معرفت کے دائرے میں آسکے بلکہ خدا وہ ہے، جو دلیل و برہان کو اپنی طرف ہدایت کرتا ہے۔ (بحار الانوار، جلد ۴، ص ۱۸۶)

''تم میں سے وہی شخص خدا کو بہتر طور پر پہچانتا ہے، جو اپنے آپ کو بہتر پہچانتا ہے''۔

لیکن سیر و سلوک کا منصوبہ اور پروگرام! اس سے متعلق قرآن کریم کی بہت زیادہ آیات موجود ہیں، جو خدا کو یاد کرنے کا حکم دیتی ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَاذْكُرُونِيْٓ اَذْكُرْكُمْ (سورۂ بقرہ:۱۵۲)

''مجھے یاد کرو تا کہ میں بھی تمہیں یاد کروں''۔

اور اس کے علاوہ دوسری آیات، اعمالِ صالح (نیک اعمال) کے متعلق قرآن وسنت میں تفصیلات آئی ہیں اور آخر میں فرماتا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (سورۂ احزاب:۲۱)

''اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کرو''۔

پس کیسے ممکن اور متصور ہوسکتا ہے کہ اسلام، خدا کے راستے کو تو تشخیص دے اور پھر لوگوں کو اس راستے پر چلنے کی تاکید اور وصیت نہ کرے؟

یا اس راستے کو دوسروں کے سامنے تو پیش کرے لیکن اس کے منصوبوں اور پروگراموں کو بیان کرنے میں غفلت یا سستی کرے؟

حالانکہ خداوند تعالیٰ اپنے کلام میں فرماتا ہے:

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (سورۂ نحل:۸۹)

''ہم نے قرآن کو تم پر نازل کیا ہے اور یہ کلام ہر اس چیز کے بارے میں واضح بیان کرتا ہے، جو لوگوں کے دین و دنیا سے متعلق ہو''۔

تیسرا حصّہ

اسلامی عقائد کے بارے میں بارہ امامی شیعوں کا نظریہ

خدا شناسی (خدا کی پہچان)

- زندگی اور حقیقت کے پیش نظر دنیا پر ایک نظر، خدا کی ضرورت
- باب کا خاتمہ (خدا کی وحدانیت) انسان اور جہان کے رابطے سے ایک اور نظر
- ذات وصفات
- خدائی صفات کے معنی
- صفات کے معنی میں مزید وضاحت
- فعل کی صفات
- قضاوقدر
- انسان اور اختیار

زندگی اور حقیقت کے پیش نظر دنیا پر ایک نظر، خدا کی ضرورت

انسانی إدراک (عقل) اور شعور جو انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی پیدا ہوتا ہے، بالکل شروع سے ہی انسان پر دونوں جہانوں کے خدا کی ہستی کو واضح کر دیتا ہے، کیونکہ ان لوگوں کے عقائد کے بالکل خلاف جو زندگی میں ہر چیز پر شک و تردید کا اظہار کرتے ہیں اور جہان ہستی کو صرف ایک وہم و گمان اور خیال کے سوا کچھ نہیں سمجھتے۔ ہم جانتے ہیں کہ ایک انسان اپنی پیدائش کے ساتھ ہی عقل و شعور رکھتا ہے اور وہ اپنی دنیا اور اپنے آپ کو بخوبی سمجھتا ہے، یعنی اسے اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں ہوتا کہ وہ موجود ہے اور اس کے علاوہ دوسری چیزیں بھی موجود ہیں اور جب تک یہ انسان، انسان ہے، اس میں عقل و شعور اور علم موجود رہتا ہے، لہٰذا اس کے لیے کسی قسم کے شک و تردید کی گنجائش نہیں ہوتی اور علم و شعور اور عقل میں بھی ہرگز تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔

یہ حقیقت اور ہستی جس کو انسان ایک سوفسطائی یا شک کرنے والے کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے، پہلے ہی سے ثابت شدہ ہے اور اس میں ہرگز بطلان پیدا نہیں ہوتا یعنی سوفسطائی اور شک کرنے والے شخص کے اقوال جو دراصل واقعیت اور حقیقت کی نفی ہیں، ہرگز درست نہیں ہیں۔ پس جہانِ ہستی (کائنات) میں ایک ثابت اور پائیدار حقیقت موجود ہے۔

لیکن یہ تمام حقیقی مظاہر جن کو ہم اس دنیا میں مشاہدہ کرتے ہیں کچھ عرصے کے بعد ان کی حقیقت ختم ہو جاتی ہے اور یہ سب نابود ہو جاتے ہیں۔ اس طرح واضح ہو جاتا ہے کہ یہ دنیا اور اس کے تمام اجزا خود بخود عینِ حقیقت نہیں ہیں (کہ جو نابود اور فنا ہونے نہ پائیں) بلکہ یہ سب ایک پائیدار اور مستقل حقیقت سے وابستہ ہیں اور اسی

پائیدار حقیقت کے ذریعے ہی یہ حقیقت دار ہوتے ہیں اور اسی کے ذریعے ان کو زندگی ملتی ہے، لہٰذا جب تک اس حقیقت کے ساتھ رابطہ اور تعلق رکھتے ہیں اس حقیقت کی موجودگی کے ساتھ زندہ رہتے ہیں، لیکن جونہی اس سے ان کا تعلق ختم ہو جاتا ہے، تو فوراً نابود ہو جاتے ہیں۔[1] ہم اس پائیدار اور مستقل (لازوال) حقیقت کو "واجب الوجود" یعنی خدا کہتے ہیں۔

انسان اور جہان کے رابطے سے ایک اور نظر

وہ طریقہ جو گزشتہ باب میں خدا کی ہستی کو ثابت کرنے کے لیے بتایا گیا ہے، وہ طریقہ بہت ہی سادہ اور واضح ہے کہ انسان اپنی خداداد قابلیت اور سرشت کے ساتھ اسے اپنا سکتا ہے اور اس طریقے میں کوئی پیچ وخم بھی موجود نہیں ہے۔ لیکن بہت زیادہ لوگ مادیات کی طرف متوجہ ہونے اور محسوس لذائذ میں محو و مستغرق ہونے کے سبب اپنی خداداد، سادہ اور پاک فطرت کی طرف توجہ دینے سے قاصر ہیں، کیونکہ ایسی حالت میں معنویات کی طرف توجہ دینا بہت ہی مشکل اور سخت کام ہے۔

بنابریں اسلام جو کہ اپنے آپ کو ایک عمومی دین کہتا ہے اور تمام انسانوں کو اپنے دینی مقاصد کے سامنے مساوی جانتا ہے، ایسے لوگوں کے لیے، خدا کی ہستی کو ثابت کرنے کا دوسرا طریقہ اختیار کرتا ہے اور جس طرح لوگوں کی توجہ سادہ فطرت (دین) سے ہٹ گئی ہے اسی طرح ان سے بات کرتا ہے اور اپنی ذات کو پہچنواتا ہے۔

---

[1] خدائے بزرگ و برتر اپنی کتاب میں اس دلیل و برہان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (سورۂ ابراہیم:۱۰) "(ان کے پیغمبر نے کہا) کیا خدا میں بھی شک کیا جا سکتا ہے؟ وہ خدا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے (جس نے عدم کو چیر کر اس میں آسمانوں اور زمین کو ظاہر کیا ہے؟)"۔

قرآن کریم مختلف طریقوں سے عام لوگوں کو خدا شناسی کی تعلیم دیتا ہے، اور اس سے بڑھ کر ان کے افکار کو دنیا کی آفرینش اور اس نظام کی طرف متوجہ کراتا ہے جو اس دنیا میں حکومت کر رہا ہے (جاری وساری ہے) اور پھر انفس و آفاق کے مطالعے کی دعوت دیتا ہے، کیونکہ انسان اپنی چند روزہ زندگی میں جو راستہ یا طریقہ بھی اختیار کرے یا جس حالت میں زندگی گزارے، وہ دنیائے فطرت اور اس میں موجودہ نظام کی حکومت سے ہرگز باہر نہیں نکلا جاسکتا اور اس کا شعور وادراک، زمین و آسمان کے عجیب و غریب مناظر کو ہرگز نظر انداز نہیں کرسکتا۔

یہ وسیع جہان ہستی (نظامِ کائنات) [1] جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے (جیسا کہ ہم جانتے ہیں) اس کا ہر ایک جزو اور ذرہ، کلی طور پر ہمیشہ تغیر وتبدل کا شکار ہے اور ہر لحظہ اس کی شکل وصورت دگرگوں ہو کر ایک نیا رُوپ دھار لیتی ہے جو پہلے سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔

---

① خدائے تعالیٰ فرماتا ہے: إِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ لَآيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِينَ ○ وَفِي خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِن دَابَّةٍ آيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ ○ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا أَنزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِن رِّزْقٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيفِ الرِّيٰحِ آيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ○ تِلْكَ آيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَ اللّٰهِ وَآيٰتِهِ يُؤْمِنُونَ (سورۂ جاثیہ: ۳-۶) "بے شک آسمان اور زمین میں ایمان لانے والوں کے لیے (قدرتِ خدا کی) بہت سی نشانیاں ہیں، اور تمہاری پیدائش میں (بھی) اور جن جانوروں کو وہ (زمین پر) پھیلاتا رہتا ہے (ان میں بھی) یقین کرنے والوں کے واسطے بہت سی نشانیاں ہیں، اور رات اور دن کے آنے جانے میں اور خدا نے آسمان سے جو (ذریعہ) رزق (پانی) نازل فرمایا پھر اس سے زمین کو اس کے مرجانے کے بعد زندہ کیا (اس میں) اور ہواؤں کے پھیر بدل میں عقل مند لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔ یہ خدا کی آیتیں ہیں جن کو ہم ٹھیک (ٹھیک) تمہارے سامنے پڑھتے ہیں تو خدا اور اس کی آیتوں کے بعد کون سی بات ہوگی جس پر یہ لوگ ایمان لائیں گے"۔

اور پھر قوانین کے زیر اثر جس میں استثنا موجود نہیں ہے، حقیقت اور اثبات کا لباس پہن لیتی ہے اور اسی طرح بہت بلند اور دُور کہکشانوں سے لے کر چھوٹے چھوٹے ذرّے تک جن سے اس جہان کی تشکیل و تکمیل ہوئی ہے، ہر چیز ایک خاص اور واضح نظام میں حرکت کرتی ہے، اور اپنے قوانین کے ذریعے جس میں کسی قسم کی استثنا موجود نہیں ہے، بڑے حیرت انگیز طریقے سے یہ ساری چیزیں اپنے اپنے کام میں لگی ہوئی ہیں، لہٰذا یہ سب اشیاء اپنے دائرہ عمل کو بہت ہی پست اور نچلی سطح سے مکمل ترین حالت کی طرف بڑھاتی چلی جاتی ہیں، یہاں تک کہ تکمیل کے مرحلے تک پہنچ جاتی ہیں۔

اور خصوصی نظاموں، عمومی نظاموں اور آخر کار عام دنیاوی نظام سے بالاتر جن کے بے شمار اجزا ایک دوسرے کو آپس میں مربوط کرتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے نظاموں کو آپس میں ملاتے ہیں اور اپنی دائمی حرکت میں ہرگز کسی استثنا کو قبول نہیں کرتے اور نہ ہی ان نظاموں میں کسی قسم کی ہرج و مرج پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً اگر فطرت کا نظام انسان کو زمین میں جگہ دیتا ہے تو اس زمین کے وجودی ڈھانچے کو اس طرح ترکیب (مختلف اجزا کا مجموعہ) دیتا ہے کہ اس کی زندگی اور ماحول کے ساتھ سازگار ہو اور پھر اس زندگی اور ماحول کو اس طرح بناتا ہے کہ ایک مہربان دایہ کی طرح مہر و محبت کے ساتھ اس کی پرورش کرتے ہوئے کائنات کی ہر چیز مثلاً سورج، چاند، ستارے، پانی، مٹی، دن، رات، سال کے موسموں، بادل، ہوا، بارش، زمین کے نیچے اور زمین کے اُوپر موجود ذخائر اور خزانے اور آخر کار اپنی قدرت اور طاقت کے تمام وسائل اور سرمائے کو اس کے آرام و آسائش کی خاطر کام پر لگائے رکھتا ہے۔ ہم ایسے رابطے اور تعلق کو دنیا کے ہر مظہر اور اس کے اردگرد اور ہمسایہ چیزوں کے درمیان مشاہدہ کرتے ہیں، یعنی دنیا کے تمام مظاہر، جن میں انسان زندگی گزارتا ہے، آپس میں مربوط ہیں۔

کائنات کے ہر مظہر کے داخلی نظام میں بھی اس قسم کا تعلق اور رابطہ موجود اور

ظاہر ہے۔ اگر فطرت نے انسان کے لیے روٹی مہیا کی ہے تو اس کو حاصل کرنے کے لیے ہاتھ اور کھانے کے لیے منہ اور چبانے کے لیے دانت بھی دیئے ہیں اور ان تمام چیزوں کو زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک قسم کے منظم ذرائع کے ساتھ آپس میں مرتبط کر رکھا ہے۔ یعنی ہر چیز اپنے کمال کی طرف گامزن ہے۔ (بقا اور کمال)

دنیا کے ماہرین اور دانشور اس امر میں کوئی شک وشبہ نہیں رکھتے کہ وہ بے شمار تجربے، جو انھوں نے اپنی چند ہزار سالہ علمی کاوشوں کے ذریعے حاصل کیے ہیں وہ فطرت اور کائنات کے اسرار میں سے ایک بہت ہی معمولی جلوہ ہیں، جس کے پیچھے ایک بہت ہی طویل اور بے انتہا سلسلہ موجود ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔ ہر تازہ انکشاف انسان کے سامنے بے شمار مجہولات (جن چیزوں کا علم نہ ہو) لے آتا ہے (جس میں انسان گم ہو کر رہ جاتا ہے)۔

کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ وسیع جہانِ ہستی (کائنات) جس کے تمام اجزا الگ الگ ہوتے ہوئے بھی آپس میں ایک مضبوط اتحاد اور وحدت و اتصال اور حیرت انگیز اتفاق رکھتے ہیں اور یہ سب ایک لامتناہی طاقت اور علم کو بیان کرتے ہیں، ان کا کوئی پیدا کرنے والا نہیں ہے؟ اور یہ سب کچھ اپنے آپ، عبث اور فضول پیدا ہو گیا ہے۔

آیا یہ جزئی اور کلی نظامات اور آخرکار دنیا کا عمومی نظام، جس نے دنیا کے لاانتہا اجزا کو آپس میں مربوط اور متصل کر کے ایک بڑا متحدہ کائناتی نظام (one unit universal system) بنا دیا ہے، اپنے منظم قوانین کے ساتھ جس میں کوئی استثنا موجود نہیں ہے، ہر چیز میں جاری وساری ہے۔ کیا یہ سب کچھ بغیر کسی نقشے کے اتفاقیہ طور پر بن گیا ہے؟ یا ان میں سے ہر ایک مظہر اور کائنات کے چھوٹے بڑے ماحول نے اپنی پیدائش سے پہلے ہی اپنے لیے ایک خاص نظام اور طریقہ انتخاب کر لیا ہے؟ اور اپنی پیدائش کے بعد اس نظام کو خاص موقع ومحل کے مطابق نافذ اور جاری کرتا ہے۔

البتہ وہ انسان جو ہر حادثے، واقعے اور مظہر کو ایک علت اور سبب یا حادثے سے منسوب کرتا ہے اور کبھی کبھی ایک مجہول سبب اور علت کو پیدا کرنے کے لیے مدتوں بحث، کوشش اور جستجو میں گزار دیتا ہے اور کبھی کبھی علمی کامیابیوں کے پیچھے چکر لگاتا رہتا ہے، وہ انسان جو ان چند اینٹوں کو دیکھ کر جو بڑی ترتیب کے ساتھ ایک دوسری کے اُوپر نیچے رکھی گئی ہوں، اس کو ایک طاقت اور علم کے ساتھ منسوب کرتا ہے اور اس میں ہر قسم کے اتفاق اور حادثے کی نفی کرتے ہوئے اس کو ایک نقشے اور مقصد کا نتیجہ سمجھتا ہے، وہ ہرگز اس بات پر تیار نہیں ہوگا کہ اس کائنات اور جان ہستی کی پیدائش کو بے سبب اور بے علت سمجھے یا دنیا کے نظام کو ایک اتفاقیہ حادثہ خیال کرے۔

پس یہ جہان اور کائنات ایک خاص نظام کے ساتھ پیدا کیے گئے ہیں اور وہی نظام اس میں حکومت کرتا ہے اور اس کا پیدا کرنے والا بہت ہی عظیم ہے، جس نے اپنے بیکراں اور ختم نہ ہونے والے علم اور طاقت کے ساتھ اس کو پیدا کیا ہے اور اس کو ایک خاص نہج اور طریقے یا ہدف کی طرف چلا رہا ہے اور وہ وقتی اور چھوٹے حوادث اور بعض دوسرے اتفاقات جو اس جہان میں پیدا ہوتے ہیں اور یہ سب حالات و واقعات اسی نکتے تک پہنچ کر ختم ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ تمام چیزیں ہر طرف سے اسی (خدا) کی تسخیر اور احاطے میں واقع ہیں۔ ہر چیز اپنی زندگی میں اسی (پروردگار) کی محتاج ہے اور وہ کسی چیز کا محتاج یا نیازمند نہیں ہے اور اس کا کوئی منبع یا سرچشمہ نہیں ہے (نہ کسی کو اس نے پیدا کیا اور نہ ہی وہ کسی سے پیدا ہوا ہے (لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ)۔

باب کا خاتمہ (خدا کی وحدانیت)

فرض کریں کائنات کی حقیقتوں میں سے ہر ایک حقیقت محدود ہے، یعنی فرض اور تقدیر (سبب اور شرط) کے ساتھ ہر چیز زندہ ہے اور فرض و تقدیر (سبب و شرط) کے نہ ہونے کی بنا پر منتفی ہے، یعنی زندہ نہیں ہے۔ دراصل ہر چیز کا وجود ایک حد کے اندر

ہے اور اس حد کے باہر کچھ بھی نہیں ہے۔ صرف خدا کی ذات ہی ہے جس کے لیے کوئی حد فرض نہیں کی جا سکتی، کیونکہ اس کی حقیقت مطلق ہے اور ہمیشہ اور ہر جگہ موجود ہے، لہٰذا کسی سبب اور شرط کے ساتھ اس کو مرحلط نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اس کی ذات کسی علت اور شرط کی محتاج ہے۔

واضح ہے کہ لامتناہی اور محدود چیز کے لیے کوئی عدد فرض نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ہر دوسری چیز جو پہلی چیز کے لیے فرض کے طور پر لائی جائے گی وہ پہلی چیز کے علاوہ ہوگی۔ پس نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں چیزیں محدود اور لامتناہی ہوں گی اور ایک دوسری کی حدود اور حقیقت کے برابر ہو جائیں گی۔ مثال کے طور پر اگر ایک جسم کو لامحدود و لامتناہی فرض کریں تو اس کے برابر کسی دوسرے جسم کو فرض نہیں کر سکتے اور اگر فرض کریں گے تو دوسرا جسم پہلے جسم کے برابر اور مانند ہو جائے گا۔ پس خدائے تعالیٰ یکتا، یگانہ اور بے مثال ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔(1)

---

(1) جنگ جمل میں ایک عربی شخص حضرت علی علیہ السلام کے پاس آیا اور کہنے لگا: یا امیر المومنین! آپ فرماتے ہیں کہ خدا ایک ہے؟ لوگوں نے ہر طرف سے اس پر اعتراضات کرنے شروع کر دیئے اور کہنے لگے: کیا تم نہیں دیکھ رہے کہ امیر المومنین کو کس قدر پریشانی اور تشویش ہے اور تم یہ سوال پوچھ رہے ہو؟۔
امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو کیونکہ جو کچھ یہ عربی شخص جاننا چاہتا ہے یہ وہی مطلب ہے کہ ہم جو اس جماعت پر واضح کرنا چاہتے ہیں۔ پھر اس عربی شخص سے فرمایا: یہ جو کہا جاتا ہے کہ خدا ایک ہے، چار طرح سے ہے، جن میں سے دو طریقے ٹھیک نہیں ہیں اور دو طریقے ٹھیک ہیں، لیکن جو دو طریقے ٹھیک نہیں ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ خدا ایک ہے اور اس کے لیے عدد اور نمبر کو سامنے رکھے تو یہ معنی ٹھیک نہیں ہیں، کیونکہ جس کی مثال نہیں ہے وہ عدد میں محدود نہیں ہو سکتا۔ آیا تجھے معلوم نہیں کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ خدا تین ہیں: (باپ، بیٹا، روح)۔ عیسائیوں کی تثلیث کی طرف اشارہ ہے) وہ کافر ہو گئے تھے۔ ←

ذات اور صفات

اگر ایک انسان کا عقلی لحاظ سے تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اس کی ذات ہے اور یہ ذات وہی ذاتی انسانیت یا شخصیت ہے اور اس کے ساتھ وہ صفات بھی رکھتا ہے جس سے اس کی ذات (شخصیت) کو پہچانا جاتا ہے، مثلاً وہ فلاں کا بیٹا ہے اور اس کا باپ فلاں شخص ہے۔ وہ دانا ہے، طاقت ور ہے، اس کا قد اُونچا ہے، وہ خوبصورت ہے یا ان صفات کے برعکس ہے۔

اگرچہ ان صفات میں سے بعض صفات مثلاً صفتِ اوّل اور دوم ہرگز ذات سے جدا نہیں ہیں اور بعض دوسری صفات مثلاً دانائی اور طاقت میں تبدیلی کا امکان موجود ہے، لیکن بہرحال سب کی سب صفات اس کی ذات کے علاوہ ہیں اور ہر صفت میں فرق ہے۔

ذات اور صفت یا تمام صفات میں فرق بہترین ثبوت اور دلیل ہے کہ وہ ذات

اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اگر کوئی کہے کہ فلاں شخص انسانوں میں سے ایک ہے، یعنی انسان کی جنس میں سے ایک ہے (یا اس قسم اور جنس کا ایک جزو ہے) یہ معنی بھی خدا کے لیے ٹھیک نہیں ہیں کیونکہ یہ تشبیہ ہے اور خداوند تشبیہ سے مبرا اور پاک ہے۔ لیکن دوسرے دو مطلب اور معنی کہ جو خدا کی یکتائی کے بارے میں ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ کوئی کہے خدا ایک ہے جس کی اشیاء میں کوئی مثال یا تشبیہ نہیں ملتی۔ خدا ایسے ہی ہے اور دوسرا یہ کہے کہ خدا ایک ہے (احد ہے اور اس میں کوئی کثرت نہیں اور نہ ہی اس کی قسمیں ہیں) یعنی نہ تو عقل کے اندر سما سکتا ہے اور نہ ہی وہم و گمان میں آسکتا ہے اور نہ ہی اس کے باہر کوئی حد موجود ہے"۔ (بحار الانوار، ص ۶۵)

پھر حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: خدا کو پہچاننے کا مطلب یہی ہے کہ اس کو واحد یگانہ، یکتا اور بے مثال جاننا چاہیے (بحار الانوار، جلد ۲، ص ۱۸۶)۔ یعنی خدائے تعالیٰ کے وجود کا اثبات جو لامتناہی اور لامحدود ہے اس کی وحدانیت کو ثابت کرنے میں ہی کافی ہے، کیونکہ لامحدود چیز کے لیے دوسری کوئی مثال تصور نہیں کی جا سکتی۔

جس کی صفت موجود ہو، اور وہ صفت جو ذات کا تعارف کراتی ہو، دونوں محدود اور متناہی ہیں، کیونکہ اگر ذات لامحدود اور لامتناہی ہو تو صفات بھی ویسی ہی ہوں گی اور تمام صفات ایک دوسری کے برابر ہوں گی اور آخرکار سب کی سب ایک ہو جائیں گی، جیسا کہ فرض کیا تھا کہ انسان کی ذات، طاقت تھی اور اسی طرح طاقت، عقل مندی (دانائی) بلندی اور خوبصورتی تمام کی تمام ایک دوسری کی مانند تھیں۔ لہٰذا مجموعی طور پر ان سب کا صرف ایک ہی مطلب تھا (یعنی انسان)۔

گزشتہ بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ ذات باری تعالیٰ عزوجل کے لیے صفت کا وہ مفہوم ہرگز نہیں ہے جس کا ہم نے پہلے تجزیہ کیا ہے کیونکہ خدا کے لیے کوئی صفت ثابت نہیں کی جا سکتی، اس لیے کہ صفت حدود کے بغیر نہیں ہوتی اور خدا کی پاک ذات ہر حدود سے بالاتر ہے (حتیٰ کہ یہی پاکی دراصل خدا کی صفت کو ثابت کرتی ہے)

خدائی صفات کے معنی

جہانِ آفرینش (فطرت اور کائنات) میں بہت زیادہ کمالات موجود ہیں جو صفات کی شکل میں ظاہر ہوئے ہیں۔ یہ مثبت صفات ہیں جو ہر جگہ ظاہر ہوتی ہیں اور اپنے وجود کو کامل اور مکمل کرتے ہوئے اس کو زیادہ سے زیادہ وجودی اہمیت کے قابل بناتی ہیں جیسا کہ ایک زندہ چیز مثلاً انسان کا مقابلہ ایک بے جان اور بے روح چیز مثلاً پتھر کے ساتھ کریں تو واضح ہو جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ان تمام کمالات وصفات کو خدائے تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اور اسی نے ہی یہ صفات دوسری چیزوں کو دی ہیں اور اگر خود خدا میں یہ صفات و کمالات موجود نہ ہوتے تو وہ دوسروں کو ہرگز نہ دیتا یا نہیں دے سکتا تھا اور نہ ہی ان کی تکمیل کرتا۔ لہٰذا عقلِ سلیم کے مطابق یوں کہنا چاہیے کہ خدائے تعالیٰ علم و قدرت رکھتا ہے اور ہر حقیقی کمال اسی کے پاس ہے۔

اس کے علاوہ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے علم اور طاقت کے آثار، اور ان آثار کے نتیجے میں کائنات کے نظام کی زندگی بھی ظاہر ہے۔ لیکن اس مطلب کے پیش نظر کہ ذاتِ خداوندی لامحدود اور لامتناہی ہے، یہ کمالات جو اس کے لیے صفات کی شکل و صورت میں ثابت ہوتے ہیں، حقیقت میں عین ذات اور اس طرح ایک دوسرے کے بالکل برابر اور مانند ہیں۔ اور وہ فرق جو ذات و صفات یا خود صفات کے درمیان نظر آتا ہے صرف مفہوم کے طور پر، لیکن حقیقت میں ایک ناقابلِ تقسیم یکتائی کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔[1]

اسلام اس غلطی کے سدِ باب کے لیے (یعنی صفات کے ذریعے وحدانیت یا اصل کمال کی نفی) اپنے پیروکاروں کے عقیدے اور ایمان کو نفی و اثبات کے درمیان ہی رکھتا ہے اور اس سے تجاوز نہیں ہونے دیتا۔[2] اور حکم دیتا ہے کہ اس قسم کے عقائد رکھیں

---

① امام ہشتم علیہ السلام فرماتے ہیں: "خدا کی ذات اور ہستی ثابت ہے (ناقابلِ تغیر یا ناقابلِ تقسیم ہے) اور اس کا علم بھی وہ خود ہی ہے حالانکہ معلوم (وہ چیز جس کا علم ہو) نہیں تھا اس کی شنوائی بھی وہ خود ہی ہے حالانکہ سنی جانے والی چیز (صدا اور آواز) موجود نہ تھی اور اس کی بینائی بھی وہ خود ہی ہے حالانکہ دیکھی جانے والی چیز موجود نہ تھی (خدا کے علم، اس کی بینائی اور شنوائی کی کوئی مثال نہیں ہے) کیونکہ یہ صفات اس وقت بھی موجود تھیں جب کہ کوئی دوسری چیز موجود نہ تھی"۔ (بحار الانوار، جلد۲، ص ۱۲۵) اور اہلِ بیتؑ کی احادیث اس بارے میں بہت زیادہ ہیں۔ نہج البلاغہ، توحید، عیون اور بحار الانوار جلد۲ کی طرف رجوع کریں۔

② پانچویں، چھٹے اور آٹھویں امام علیہم السلام فرماتے ہیں: "خدائے تعالیٰ ایک نور ہے جو ظلمت کے ساتھ مخلوط نہیں ہے اور خدا ایک علم ہے جس میں جہالت موجود نہیں ہے اور وہ ایک زندگی ہے جس کو کبھی موت نہیں ہے" (بحار الانوار، جلد۲، ص ۱۲۹)۔ آٹھویں امام علیہ السلام فرماتے ہیں: "عوام خدائی صفات کے بارے میں تین عقائد رکھتے ہیں: ایک جماعت صفات کو خدائے تعالیٰ کے ساتھ ثابت کرتی ہے اور دوسری جماعت چیزوں کے ساتھ تشبیہ دیتی ہے، لیکن ایک جماعت صفات کی نفی کرتی ہے۔ حقیقی طریقہ تیسری جماعت کا ہے اور وہ طریقہ یہ ہے کہ صفات کا اثبات دوسری چیزوں کے ساتھ تشبیہ کے بغیر کیا جائے۔ (بحار الانوار، جلد۲، ص ۹۳)

یعنی خدا علم رکھتا ہے لیکن اس کا یہ علم دوسروں کے علم کی طرح نہیں ہے۔ وہ طاقت رکھتا ہے لیکن اس کی یہ طاقت انسانوں کی طاقت کی طرح نہیں ہے۔ وہ سنتا ہے لیکن کانوں کے ذریعے نہیں (اس کے کان نہیں ہیں)۔ وہ دیکھتا ہے لیکن آنکھوں سے نہیں (اس کی آنکھیں نہیں ہیں) اور اسی طرح دوسری صفات۔

صفات کے معنی میں مزید وضاحت

صفات دو قسم کی ہیں: مکمل صفات اور ناقص صفات۔ مکمل صفات جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے، اثباتی معنی رکھتی ہیں جو اپنے وجود کی زیادہ اہمیت کا باعث بنتی ہیں اور اپنے موصوف کے وجودی اعتبار کو زیادہ کرتی ہیں، جیسا کہ ایک زندہ، جاندار، طاقتور اور عقل مند چیز یا وجود کو ایک مُردہ، بے علم، بے طاقت چیز یا وجود کے ساتھ مقابلہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے اور ناقص صفات اس کے برعکس ہیں۔

جب ہم ناقص صفات کے معنی پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ معنی کے لحاظ سے یہ صفات منفی ہیں اور ان میں کمال موجود نہیں ہے اور ایسے ہی وجودی اہمیت کے نہ ہونے کی خبر دیتی ہیں مثلاً جہالت، عجز، بے عقلی، بدصورتی، بیماری اور بدی وغیرہ۔

لہٰذا گزشتہ موضوع کے مطابق صفات کی نفی، مکمل صفات کے نہ ہونے کے معنی دیتی ہے مثلاً نادانی کی نفی دانائی کے معنوں میں ہے اور ناتوانی کی نفی توانائی کے معنی دیتی ہے۔

قرآن کریم ہر مکمل صفت کو براہ راست خدائے تعالیٰ کے بارے میں ثابت کرتا ہے اور ہر ناقص صفت کی نفی کرتے ہوئے اس کی نفی کو خداوند تعالیٰ کے بارے میں ثابت کرتا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے: وَهُوَ الْعَلِيمُ الْقَدِيرُ (سورۂ روم:۵۴) هُوَ الْحَيُّ ، لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ (سورۂ بقرہ: ۲۲۵) وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ (سورۂ تو ۳۰)

ایک مطلب کو ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ ایک مطلق حقیقت ہے جس کی کوئی حد نہیں ہے اور اسی طرح ہر کامل صفت بھی جو اس کے بارے میں ثابت ہوتی ہے وہ بھی محدود معنوں میں نہیں ہوگی۔① وہ (خدا) مادی، جسمانی، قیود یا مکان و زمان کی حدود میں محدود نہیں ہے اور ہر صفت سے منزہ اور پاک ہے کیونکہ ہر وہ صفت جو حادث ہو، خدا اس صفت سے پاک ہے اور ہر وہ صفت جو حقیقت میں خدا سے منسوب کی جاتی ہے وہ محدودیت کے معنی سے بالکل دور ہے جیسا کہ خدا فرماتا ہے: لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (سورۂ شوریٰ:۱۱)

صفات فعل

صفات (جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے) مختلف اقسام میں تقسیم ہوتی ہیں، یعنی "صفات ذات" اور "صفات فعل"۔

اس کی وضاحت یوں ہے کہ کبھی ایک صفت خود موصوف کے ساتھ قائم ہوتی ہے، مثلاً زندگی، علم اور طاقت جو ایک زندہ، دانا اور توانا انسان کے ساتھ قائم ہیں اور ہم صرف انسان کو ہی ان کے ساتھ متصف فرض کر سکتے ہیں، اگرچہ اس کے بغیر کسی اور چیز کو فرض بھی نہ کریں۔ اور کبھی کبھی صرف موصوف کے ساتھ ہی قائم نہیں ہے کیونکہ اگر موصوف کو ان صفات کے ساتھ متصف کریں تو اس وقت ہمیں پہلے بعض دوسری چیزوں کو ثابت کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، مثلاً لکھنا، بولنا (تقریر کرنا) اور چاہنا وغیرہ کیونکہ انسان اس وقت تک ادیب نہیں بن سکتا جب تک دوات، قلم اور کاغذ کو فرض نہ کر لیا جائے اور اسی وقت تقریر کر سکتا ہے جب اس کے لیے سننے والے کو فرض کر لیا جائے اور اس وقت کسی چیز کو چاہتا ہے جب چاہنے والی چیز موجود ہو اور

① امام ششم علیہ السلام فرماتے ہیں: خدائے تعالیٰ زمان و مکان اور حرکت و سکون اور نقل و انتقال کے ساتھ متصف نہیں ہو سکتا بلکہ وہ زمان و مکان کا خالق اور پیدا کرنے والا ہے۔ (بحار الانوار، جلد ۳، ص ۹۶)

صرف ان صفات کو ثابت کرنے کے لیے انسان کا فرض ہی کافی نہیں ہے۔

یہاں واضح ہو جاتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کی حقیقی صفات (جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے) عینِ ذات ہیں اور صرف پہلی قسم کی ہیں، لیکن دوسری قسم کی صفات جن کو ثابت کرنے میں بعض دوسری چیزوں کا سہارا لینا ضروری ہے، خدا کے سوا ہر چیز مخلوق ہے اور خدا کے بعد پیدا ہوئی ہیں لہٰذا ہر چیز اپنی پیدائش کے ساتھ جو صفات اپنے ساتھ لاتی ہے، ان کو صفتِ ذات اور خدائے تعالیٰ کی مانند "عینِ ذات" نہیں کہا جا سکتا۔

وہ صفات جو خدائے تعالیٰ کے لیے کائنات کی پیدائش کے بعد ثابت اور منسوب ہوتی ہیں مثلاً آفریدگار، کردگار، پروردگار، زندہ کرنے والا، مارنے والا اور روزی دینے والا وغیرہ۔ وہ عینِ ذات نہیں ہیں بلکہ ذات کے علاوہ ہیں اور ان کو "صفتِ فعل" کہا جاتا ہے۔

صفتِ فعل کا مطلب یہ ہے کہ فعل کے ثابت اور عملی ہونے کے بعد، صفت کے معنی فعل سے حاصل کیے جاتے ہیں نہ کہ ذات سے، مثلاً آفریدگار، جو کائنات اور مخلوقات کی پیدائش ثابت ہو جانے کے بعد خدا کے آفریدگار (پیدا کرنے والا) ہونے کے معنی اس سے ماخوذ ہوتے ہیں اور یہ معنی صرف مخلوقات کے ساتھ قائم ہیں، نہ کہ خداوند پاک کی مقدس ذات کے ساتھ، کیونکہ اگر ایسا ہو تو ذات میں بھی صفت کے ساتھ ساتھ تبدیلی واقع ہو جائے گی۔

شیعہ، دو صفات یعنی "ارادہ" اور "کلام" اور ان سے حاصل ہونے والے معانی کو صفتِ فعل جانتے ہیں۔[1] کیونکہ ارادہ چاہنے کے معنی میں ہے اور کلام کا

---

① امام ہشتم علیہ السلام فرماتے ہیں: "خداوند تعالیٰ ہمیشہ اپنی ذات میں "عالم" تھا حالانکہ "معلوم" موجود نہیں تھا اور "قادر" تھا، حالانکہ مقدور (طاقت) موجود نہیں تھا"۔ راوی کہتا ہے: "میں نے عرض کیا، کیا متکلم بھی تھا؟" آپ نے فرمایا: "کلام حادث ہے، خدا موجود تھا، لیکن کلام موجود نہ تھا، اس کے بعد خدا نے کلام کو پیدا کیا (بحار الانوار، جلد ۲، ص ۱۴۷)۔ اور امام ہشتم علیہ السلام

مطلب ہے: ''الفاظ کا انکشاف''۔ اور علمائے اہلِ سنت ان صفات کو علم کے معنی میں لیتے ہیں اور انھی کو ''صفتِ ذات'' کہتے ہیں۔

قضا و قدر

کائنات میں علّت اور سبب کا قانون بغیر کسی استثنا کے حکم فرما اور جاری ہے۔ اس قانون کے مطابق اس جہان کا ہر مظہر یا مخلوق اپنی پیدائش میں ایک سبب یا علّت پر منحصر ہے۔ (اسباب اور ان کا عملی ہونا) کہ فرض کریں اگر یہ سبھی اسباب پورے ہو جائیں (جس کو علّتِ تامہ کہتے ہیں) تو مظہر کی پیدائش (معلول و مفروض) ضروری یا جبری ہو جاتی ہے اور اگر فرض کریں کہ یہ سب یا ان میں سے بعض اسباب موجود نہ ہوں تو مذکورہ مظہر کی پیدائش محال ہو جاتی ہے۔

اس نظریہ میں تحقیق اور جستجو کے ساتھ ہمارے لیے مندرجہ ذیل دو مطلب واضح ہو جاتے ہیں:

◇ اگر ہم ایک مظہر (معلول) کو مجموعی علّتِ تامہ اور اسی طرح علّتِ تامہ کے اجزا کے ساتھ پرکھیں تو علّتِ تامہ کے ساتھ اس کی نسبت (رشتہ) ''نسبتِ ضرورت'' (جبر) پر ہوگی، اور علّتِ تامہ کے تمام اجزا (جن کو علّتِ ناقصہ کہا جاتا ہے) کے ساتھ اس کی نسبت، ''نسبتِ امکان'' کی ہوگی کیونکہ ہر علّت کا ایک جزو، معلول کی نسبت صرف امکانِ وجود رکھتا ہے نہ کہ ضرورتِ وجود (جبری پیدائش)۔

بنابرایں یہ کائنات جس کے اجزا کا ہر مظہر اپنی پیدائش میں اپنی علّتِ تامہ کے ساتھ لازمی تعلق رکھتا ہے، اس کی پیدائش میں ایک ضرورت کارفرما ہے اور اس کا جسم

فرماتے ہیں: ''لوگوں کا ارادہ ''ضمیر'' ہے اور اس کے بعد ''فعل'' پیدا ہوتا ہے، اور خدا ہی اس کا پیدا کرنے والا ہے اور بس۔ کیونکہ خداوند تعالیٰ ہماری طرح تردید، وہم اور تفکر نہیں رکھتا'' (یعنی ان صفات سے پاک ہے)۔ (بحارالانوار، جلد ۲، ص ۱۴۴)

ایک قسم کے قطعی اور ضروری حوادث پر منحصر ہے۔ لہٰذا اس کے اجزا میں "صفتِ امکان" (وہ مظاہر جو اپنی علت کے علاوہ کسی اور علت کے ساتھ نسبت اور تعلق رکھتے ہیں) محفوظ رہتی ہے۔

قرآن کریم اپنی تعلیمات میں ضرورت (جبر) کے اس حکم کو قضائے الٰہی کہتا ہے، کیونکہ یہی جبر اور ضرورت کائنات کے پیدا کرنے اور بنانے والے کی ذات سے سرچشمہ حاصل کرتی ہے، اسی وجہ سے حکم اور "یقینی قضا" ہے جس میں کسی قسم کی خلاف ورزی یا تبدیلی ممکن نہیں ہے اور یہ بالکل عادلانہ ہے اور اس میں کسی قسم کا امتیاز یا استثنا موجود نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ (سورۂ اعراف، آیہ ۵۴)

اور پھر فرماتا ہے: وَ اِذَا قَضٰی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ (سورۂ بقرہ، آیت ۱۱۷)

اور پھر فرماتا ہے: وَ اللّٰهُ یَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ (سورۂ رعد، آیت ۴۱)

۲ علت کا ہر جز اپنے معلول (نتیجے) کے متناسب اور مطابق ہوتا ہے اور معلول کی پیدائش بھی علت کے تمام نمونوں اور اندازوں کے مطابق ہے جو علتِ تامہ نے اس کے لیے معین کر رکھے ہیں، مثلاً وہ وجوہات یا علل جو انسان کے لیے سانس لینے کا باعث ہوتے ہیں وہ مکمل تنفس کو پیدا نہیں کرتے بلکہ منہ اور ناک کے اردگرد ہوا کا ایک معین اندازہ، معینہ مکان و زمان اور شکل و صورت میں سانس کی نالی کے ذریعے پھیپھڑوں کے اندر بھیجتے ہیں اور وہ وجوہات اور علل جو دیکھنے کی قوت کو انسان کے لیے پیدا کرتے ہیں (اور انسان بھی انھی کا ایک جز ہے) قوتِ دید کو بلا قید و شرط ثابت نہیں کرتے بلکہ اس نظر یا دید کو پیدا کرتے ہیں جو ان ذرائع کے سبب ہر طرح سے ایک خاص اندازے کے مطابق معین کی گئی ہے۔ یہ حقیقت، کائنات کے تمام

مظاہر اور ان حوادث و واقعات میں بغیر کسی خلاف ورزی کے، جاری ہے جو اس کائنات میں رونما ہوتے ہیں۔

قرآن مجید نے اپنی تعلیمات میں اس حقیقت کو "قدر" کہا ہے اور اس کو خدائے تعالیٰ سے منسوب کیا ہے جو تمام کائنات کا سرچشمہ ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ (سورۂ قمر:۴۹)

اور پھر فرماتا ہے:

وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَ مَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (سورۂ حجر:۲۱)①

اور چونکہ قضائے الٰہی کے مطابق اس نظامِ کائنات میں ظاہر ہونے والا ہر حادثہ، واقعہ یا مظہر ضروری الوجود اور ناقابلِ اجتناب ہے، اسی طرح "قدر" کے مطابق ہر پیدا ہونے والا حادثہ یا مظہر اپنے اس معینہ اندازے کی ہرگز خلاف ورزی نہیں کرتا جو خدائے تعالیٰ نے اس کے لیے معین کر رکھا ہے۔

انسان اور اختیار

انسان جو کام بھی کرتا ہے وہ اس کائنات کا مظہر ہے اور کائنات کے تمام مظاہر کی طرح اس کی پیدائش بھی ایک مکمل علت پر منحصر ہے، لہٰذا اس امر کے پیش نظر کہ انسان بھی کائنات کا ایک جز ہے اور دنیا کے تمام دوسرے اجزا کے ساتھ جسمانی تعلق رکھتا ہے، پس اس کے فعل اور کام میں دوسرے اجزا کو بے اثر نہیں سمجھا جا سکتا۔

مثلاً انسان جو روٹی کھاتا ہے اس کام کو کرنے کے لیے جیسا کہ ہاتھ، پاؤں،

---

① امام ہشتم علیہ السلام فرماتے ہیں: "جب خدائے تعالیٰ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو "تقدیر کرتا ہے" اور جب تقدیر کرتا ہے تو "قضا کرتا ہے" اور جب قضا کرتا ہے تو جاری کرتا ہے۔ (بحار الانوار، جلد ۳، ص ۳۴)

متہ، علم، طاقت اور ارادے کا ہونا ضروری ہے، اسی طرح روٹی کا وجود اور اس کا دسترس میں ہونا، رکاوٹ کا نہ ہونا اور ایسے ہی دوسری مکانی اور زمانی شرائط بھی اس عمل کے لیے ضروری ہیں اور اگر ان تمام شرائط میں سے ایک شرط اور ذریعہ موجود نہ ہو تو فعل یا عمل کا انجام ہونا محال ہو جائے گا اور ان تمام شرائط اور ذرائع کی تکمیل (علتِ تامہ کے اثبات کے لیے) اس فعل اور عمل کے لیے ضروری ہیں۔

اور جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے علتِ تامہ کے مجموعی اجزا کی نسبت، فعل کا ضروری ہونا، انسان کے ساتھ فعل کے منسوب ہونے کے منافی نہیں ہے کیونکہ خود انسان علتِ تامہ کے اجزا میں سے ایک ہے، لہٰذا "معلتِ امکان" ہے۔

انسان، فعل کا امکان یا اختیار رکھتا ہے اور تمام اجزائے علت کی نسبت فعل کا ضروری ہونا، اس کے بعض اجزا کی نسبت، جو انسان ہے، فعل کے ضروری ہونے کا باعث نہیں ہوگا۔

انسان کا سادہ اور بے آلائش و پاک ادراک بھی اس نظریے کی تائید کرتا ہے، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان اپنی خداداد فطرت اور قابلیت کے ساتھ، کھانے پینے، آنے جانے اور صحت، بیماری، بڑائی، چھوٹائی اور بلندی و پستی کے درمیان فرق کو جانتا ہے، اور پہلی قسم جو انسان کے ارادے اور خواہش کے ساتھ براہِ راست تعلق رکھتی ہے، انسان کے اختیار میں سمجھی جاتی ہے اور اس کی تعریف یا بُرائی بھی کی جاسکتی ہے، برخلاف دوسری قسم کے کہ اس میں انسان پر کسی قسم کا کوئی فرض عائد نہیں ہوتا۔

اسلام کے آغاز ہی سے اہلِ سنت مذہب میں انسانی افعال کے بارے میں دو مذاہب یا نظریے مشہور تھے۔ ایک جماعت اس لیے کہ انسان کے افعال خدا کی مرضی کے بغیر انجام نہیں پاتے اور ان کی خلاف ورزی ممکن نہیں ہے۔ انسان کو اپنے افعال یا اعمال میں مجبور سمجھتے تھے اور انسانی اختیار و ارادے کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی، لیکن

ایک جماعت انسان کو اپنے افعال اور اعمال میں خودمختار جانتی تھی اور ان کو خدائی ارادے سے متعلق نہ جانتے ہوئے "قدر" کے دائرے سے خارج سمجھتی تھی۔

لیکن اہل بیتؑ کی تعلیم کے مطابق جو قرآن کی ظاہری تعلیم کے ساتھ پوری مطابقت رکھتی ہے، انسان اپنے افعال میں خودمختار ہے، لیکن آزاد نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اختیار کے ذریعے انسانی فعل کو جاری کیا ہے اور ہماری پچھلی تعبیر کے مطابق، اللہ تعالیٰ نے علت تامہ کے تمام اجزا کے ذریعے جن میں سے ایک انسان کا ارادہ اور اختیار بھی ہے، فعل کو جاری کیا ہے اور اس کو لازمی قرار دیتا ہے، جس کے نتیجے میں خدا کی یہ خواہش فعل کو ضروری اور انسان کو اس میں خودمختار بنا دیتی ہے، یعنی فعل اپنی علت کے تمام اجزا کی نسبت ضروری ہو جاتا ہے اور ان اجزا میں سے ایک کی نسبت، جو انسان ہے، اختیاری اور ممکن ہو جاتا ہے۔

امام ششم علیہ السلام فرماتے ہیں: نہ "جبر" ہے اور نہ ہی "قدر" بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک امر ہے۔[1]

---

① بحار الانوار، جلد ۳، ص ۵ اور امام ششم علیہ السلام سے روایت۔ بحار الانوار، جلد ۳، ص ۶۔ یزید شامی نے آٹھویں، چھٹے اور پانچویں اماموں علیہم السلام سے نقل کیا ہے: "خدائے تعالیٰ اپنی کائنات کے ساتھ اس سے زیادہ مہربان ہے کہ پہلے تو اس کو گناہ کی طرف مجبور کرے اور پھر اس کو عذاب دے اور خدا تعالیٰ اس سے زیادہ عزیز ہے کہ ایک امر کو چاہے لیکن پھر اس کو نہ کرسکے"۔
اور پھر امام ششم علیہ السلام فرماتے ہیں: "خدا تعالیٰ اس سے زیادہ کریم ہے کہ انسانوں پر اس کام کو فرض کرے جس کی طاقت نہ رکھتے ہوں اور اس سے کہیں بڑا ہے کہ اس کی کائنات میں وہ امر یا حادثہ پیدا ہو جائے جسے وہ نہ چاہتا ہو"۔ (بحار الانوار، جلد ۳، ص ۱۵۔ جبر اور قدر (تفویض) کے نظریات کی طرف اشارہ ہے۔

پیغمبر شناسی

(پیغمبروں کی پہچان)

- مقصد کی طرف، عمومی ہدایت
- خصوصی ہدایت
- عقل اور قانون
- وہ مرموز قانون جس کو "وحی" کہا جاتا ہے
- پیغمبر اور نبوت کی عصمت
- پیغمبر اور آسمانی دین
- پیغمبر اور وحی و نبوت کی حجت
- خدا کے پیغمبروں کی تعداد
- اولوالعزم صاحب شریعت پیغمبر
- حضرت محمد ﷺ کی نبوت
- پیغمبر اکرم ﷺ اور قرآن مجید

ہدف کی طرف، عمومی ہدایت

گندم کا دانہ جو مٹی کے اندر خاص شرائط کے ساتھ بویا جاتا ہے وہ آہستہ آہستہ رشد و نمو کرتا ہوا انقلاب کی شاہراہ پر گامزن ہوتا ہے اور ہر لحظہ اپنی شکل اور حالت بدلتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ اپنا فطری راستہ طے کرتا ہوا مکمل پودا اور بوٹا بن جاتا ہے جس کے کئی خوشے (بالیاں) ہوتے ہیں اور اگر اس پودے کا ایک دانہ زمین پر گرے تو وہ بھی اپنا راستہ طے کرتا ہوا یہی حالت اختیار کرے گا اور اگر ایک پھل کی گٹھلی ہے تو وہ بھی زمین میں اپنی حرکت آغاز کر کے اپنے خول یا چھلکے کو پھاڑتی ہوئی سبز کونپل نکالتی ہے اور پھر منظم اور مشخص راستے کو طے کرتی ہوئی آخرکار ایک تنومند درخت کی شکل اختیار کر لیتی ہے جس کے پتے سبز اور پھل میٹھے ہوتے ہیں۔

اگر حیوان یا انسان کا نطفہ ہے تو انڈے یا ماں کے رحم کے اندر ارتقا پیدا کر کے ایک معین راستے یا منزل کو طے کرتا ہوا جو اس حیوان کے نطفے کے لیے مخصوص ہے وہی کامل انسان یا حیوان بن جاتا ہے۔

یہی معین اور مشخص طریقہ، ہر قسم کی پیدائش اور فطرت کے لیے، جو اس دنیا میں موجود ہے، قائم اور جاری ہے اور اپنی فطرت میں اپنی ہی خاص قسم کے مطابق ہوگا یعنی گندم کا سبز پودا اپنے دانے سے شروع ہو کر ہرگز بھیڑ یا بکری نہیں بن سکتا اور مادہ حیوان جو اپنے نر حیوان سے حاملہ ہوتا ہے ہرگز گندم کی بالی یا چنار کا درخت پیدا نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اگر اعضا کی ترکیب میں کسی قسم کا نقص پیدا ہو جائے اور یا بچے کے قدرتی ارتقائی عمل میں کوئی کمی بیشی واقع ہو جائے مثلاً ایک بھیڑ کا بچہ اندھا پیدا ہو یا گندم کے

پودے پر بالیاں نہ لگیں تو ہمارے لیے اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں رہے گا کہ یہ سب کچھ کسی بیماری کی وجہ سے ہوگیا ہے، یا بعض مخالف عناصر اور عوامل کے سبب ایسا ہوا ہے (ورنہ اس کی فطرت ایسی نہیں تھی)۔

اشیاء کی تبدیلی اور پیدائش میں دائمی نظم ونسق اور ہر قسم کی پیدائش اور فطرت میں خاص قسم کا ارتقا ایک دانشور محقق کے لیے ناقابلِ انکار بات ہے۔ اس واضح نظریے سے دو اور نتیجے حاصل کیے جا سکتے ہیں:

① ہر قسم کی مخلوق اپنی پیدائش کے آغاز سے لے کر جو تمام مراحل طے کرتی ہے اس میں ایک رابطہ اور تعلق واتصال موجود ہوتا ہے، مثلاً مذکورہ بالا تمام چیزیں اپنی جسمی تبدیلی اور ارتقا کے دوران مختلف مراحل سے گزرتی ہیں اور ان کے آگے بھی بہت سے مراحل ہوتے ہیں جن کو اپنی زندگی میں طے کرتی ہیں۔

② مندرجہ بالا اشیاء کے اتصال وارتباط کے پیش نظر ہر قسم کی مخلوق کا آخری مرحلہ اپنی پیدائش سے لے کر ارتقا تک، اپنی ہی خاص قسم اور مخلوق کے دائرے کے اندر رہتا ہے، جیسا کہ اخروٹ کا بیج جو مٹی کے نیچے سبز کونپل نکالتا ہے تو اس وقت سے لے کر اس کا ارتقا ایک تنومند اخروٹ کے درخت کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور ایسے ہی انڈے یا ماں کے رحم میں بچہ بھی شروع ہی سے ایک مکمل حیوان یا انسان کی صورت ہے جو مختلف مراحل طے کرتا ہوا اپنی آخری شکل اور حد تک پہنچ جاتا ہے۔

قرآن مجید اپنی تعلیمات میں (جو تمام چیزوں کی پیدائش اور پرورش کو خدا سے منسوب کرتا ہے) ارتقا اور مختلف مراحل سے گزرنے اور بڑھنے کو جو ہر قسم کی مخلوق اپنی ترقی کی راہ میں اپنے سامنے رکھتی ہے، اس کو خدا کی رہبری اور ہدایت سے منسوب کرتا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (سورۂ طٰہٰ:

۵۰)

وہ خدا جس نے ہر قسم کی مخلوق کو ایک خاص قسم کی پیدائش اور فطرت عطا کی ہے اور اس کے بعد اس کو ہدایت کی ہے (زندگی اور فطرت کے مقاصد کی طرف)۔

اور پھر فرماتا ہے:

الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ○ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ○

''جس نے (ہر چیز کو) پیدا کیا اور درست کیا اور جس نے (اس کا) اندازہ مقرر کیا پھر راہ بتائی''۔ (سورۂ اعلیٰ: ۲-۳)

اور ان آیات کے نتائج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا (سورۂ بقرہ: ۱۴۸)

ہر چیز کا ایک خاص مقصد، ہدف اور غرض و غایت ہے اور وہ ہمیشہ اس مقصد کے پیش نظر زندگی گزارتی ہے۔

پھر فرماتا ہے:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ○ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

''اور ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل کے طور پر (بے مقصد) پیدا نہیں کیا ہے بلکہ حقیقت اور فطرت (ہدف، مقصد اور غرض و غایت) پر پیدا کیا ہے لیکن اکثر لوگ اس کو نہیں جانتے''۔ (سورۂ دخان: ۳۸-۳۹)

خصوصی ہدایت

ظاہر ہے کہ انسان بھی ان کلیات سے مستثنیٰ نہیں ہے اور یہی تکوینی ہدایت (ارتقائی ہدایت) ہے جو تمام کائنات اور انسان میں بھی حکومت کرتی ہے اور جیسا کہ

ہر چیز اپنی خاص اصلیت کے ساتھ کمال اور ارتقا کی طرف گامزن ہے اور مختلف مراحل میں ہدایت پیدا کرتی رہتی ہے۔ انسان بھی اپنی اصلی اور تکوینی ہدایت کے ساتھ کمال اور بلندی کی طرف ہدایت حاصل کرتا رہتا ہے۔ اگرچہ انسان بہت زیادہ خصائص میں دوسری تمام حیوانی اور نباتاتی کائنات کے ساتھ شریک ہے، مگر اس میں ایک خصوصی خاصیت بھی موجود ہے جو دوسری چیزوں سے اس کو جدا اور ممتاز کرتی ہے اور وہ ہے ـــــ "عقلِ انسانی"۔

عقل کے ساتھ انسان غور وفکر کرتا ہے اور اسی کے ساتھ تمام ذرائع سے اپنے فائدے کے لیے استفادہ کرتا ہے اور اسی کے ذریعے آسمانوں کی بیکراں فضا میں بلندی حاصل کرتا ہے اور سمندروں کی گہرائیوں میں تیرتا ہے اور زمین میں تمام جمادات، نباتات اور حیوانات سے استفادہ کرتا ہے اور ان کو کام میں لاتا ہے حتیٰ کہ اپنے ہم جنسوں سے بھی حتی الامکان فائدہ اُٹھاتا ہے۔

انسان اپنی فطری خاصیت اور عادت کے مطابق اپنی سعادت اور بہتری کو مکمل آزادی میں ہی دیکھتا ہے، لیکن چونکہ اس کی جسمی تنظیم ایک اجتماعی تنظیم ہے اور بے شمار ضروریات رکھتا ہے، جن کے پیشِ نظر ہرگز اکیلا ان تمام ضروریات اور احتیاجات کو پورا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا اور اجتماعی طور پر اپنے دوسرے ہم جنسوں کے ساتھ مل کر، کہ وہ بھی اسی طرح کی ضروریات مثلاً خودغرضی، آزادی اور دوستی کی خواہشات رکھتے ہیں ناگزیر اور مجبور ہے کہ اپنی آزادی کا کچھ حصہ اس راہ میں دوسروں کے لیے وقف کردے اور اس کے برابر دوسروں کی کمائی ہوئی دولت سے فائدہ اُٹھائے اور اسی طرح اپنی کمائی سے دوسروں کو بھی حصہ دے یعنی سماجی تعاون کو مجبوری کی خاطر قبول کرلیتا ہے۔

یہ حقیقت بچوں اور نابالغوں کے حالات پر نظر ڈالنے سے اور بھی زیادہ واضح ہوجاتی ہے۔ چھوٹے بچے شروع میں جب کوئی چیز لینا چاہتے ہیں تو زور اور رونے پر

تکیہ کرتے ہیں اور کسی قانون یا اصول کو ہرگز قبول نہیں کرتے، لیکن جب ان کی عقل میں اضافہ ہو جاتا ہے تو آہستہ آہستہ سمجھ جاتے ہیں کہ زندگی کے کام کاج صرف زور اور سرکشی کے ساتھ ہی انجام نہیں پاتے۔ اس طرح بتدریج ایک سماجی انسان کی حالت اختیار کر لیتے ہیں، یہاں تک کہ ایک اجتماعی شخص کی عمر کو پہنچ کر، جو مکمل عقل اور غور و فکر رکھتا ہے اپنے ماحول کے اندر تمام سماجی اصولوں اور قوانین کے مطیع بن جاتے ہیں۔ انسان، تعاونی معاشرے کو قبول کرنے کے لیے قانون کو ضروری جانتا ہے کہ جو معاشرے میں حکومت کرے اور ہر شخص کے فرائض کو معین کرتے ہوئے خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے سزا معین کرے، یعنی ایک ایسا قانون جس کے عملی نفاذ کے ذریعے معاشرے کے تمام افراد حقیقی سعادت کو حاصل کریں اور وہ خوشحالی جو ان کی اجتماعی اقدار کے مطابق ہو، اس تک پہنچ جائیں۔

یہ قانون عملی اور عمومی قانون ہے کہ انسان اپنی پیدائش کے آغاز سے لے کر آج تک ہمیشہ اس کا خواہاں اور شیفتہ رہا ہے اور ہمیشہ اس کو حاصل کرنے کی آرزو اور خواہش کرتا رہا ہے اور اس کو پانے کی کوشش میں ہے، ظاہر ہے کہ اگر ایسی چیز ممکن نہ ہوتی اور انسان کی تقدیر میں لکھی ہوئی نہ ہوتی تو انسان ہمیشہ اس کی خواہش نہ کرتا۔[1]

---

(1) دنیا کے تمام انسان حتی کہ ان میں سے بہت ہی سادہ اور بے فکر لوگ بھی اپنی فطرت کے مطابق چاہتے ہیں کہ یہ انسانی دنیا ایسی ہو جائے کہ تمام انسان اس میں صلح و صفا اور آرام و سکون کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ فلسفے کے مطابق: "چاہنا، خواہش کرنا، رغبت کرنا اور بھوک وغیرہ"۔ ایسی صفات ہیں جن کو اضافی اور ارتباطی کہا جاتا ہے اور ان کا وجود دو طرفہ ہوتا ہے۔ مثلاً چاہنے والا اور جس کو چاہا جائے یا عاشق و معشوق وغیرہ، اور ظاہر ہے کہ پسند کرنے یا عاشق ہونے کا امکان نہ ہوتا تو عاشق ہونا یا پسند کرنا کوئی معنی یا حقیقت نہ رکھتا اور آخرکار ہر ایسا نظریہ "ادراک نقص" کی طرف واپس نہ لوٹتا کیونکہ اگر کمال یا عروج و ترقی ممکن نہ ہوتے تو نقص یا پستی کے کوئی معنی نہ ہوتے۔

خداوند تعالیٰ نے اس انسانی معاشرے کی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا (سورۂ زخرف: ۳۲)①

انسانی خودغرضی اور اجارہ داری کی خواہش کے متعلق فرماتا ہے:

إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ○ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ○ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ○ (سورۂ معارج: ۱۹-۲۱)②

عقل اور قانون

اگر اچھی طرح سے غور کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ قانون جس کی انسان ہمیشہ آرزو و خواہش کرتا رہا ہے اور سبھی لوگ انفرادی طور پر یا مجموعی طور پر اپنی خداداد فطرت کے ساتھ ایسے قوانین کی خواہش اور ضرورت کو محسوس کرتے ہیں جو ان کی سعادت اور خوش بختی کو پورا کرسکیں۔ یہ وہی قانون ہے جو انسانی دنیا کو انسانی دنیا ہونے کے طور پر کسی استثنا اور امتیاز کے بغیر سعادت تک پہنچاتا ہے اور یہی قانون تمام افراد کے درمیان عمومی حیثیت رکھتا ہے اور ظاہر ہے کہ اب تک انسانی زندگی کے مختلف

---

① ہم نے معیشت اور زندگی کو انسانوں کے درمیان تقسیم کر دیا ہے (ہر مشکل شخص بھی اسی معیشت کا حصہ ہے) اور ان میں سے بعض کو برتری دی ہے تاکہ ان میں سے بعض لوگ، بعض دوسرے لوگوں کو مسخر کریں (ان پر غلبہ حاصل کریں) جیسا کہ ہر مزدور یا حاکم خاص موقعوں پر دوسروں کو مسخر کرتے ہیں اور اسی طرح افسر اور ماتحت، مالک اور مزارعہ یا خریدار اور بیچنے والا"۔

② بے شک انسان حریص اور لالچی پیدا ہوا ہے، جب اس کو شر (مصیبت) اور ناگواری کی بو مَس کرتی ہے (نقصان اُٹھاتا ہے) تو جزع (بے صبری اور گریہ وزاری) کرتا ہے اور جب اس کو فائدہ ہوتا ہے تو دوسروں کو اس سے منع کرتا ہے (دوسروں کو اس میں شریک اور حصہ دار نہیں بناتا)۔

نشیب و فراز اور مختلف زبانوں میں وہ قانون جو عقل و خرد کے مطابق بنایا گیا ہو، لوگوں نے اس کو نہیں سمجھا ہے اور اگر ایسا قانون فطرت کے مطابق اور تکوینی ہدایت کی طرف سے عقل کے سپرد کیا گیا ہوتا تو یقیناً ہر عقل مند انسان اس کو مکمل طور پر سمجھ سکتا تھا بلکہ وہ لوگ جو عقل رکھتے ہیں ایسے قانون کو اچھی طرح تفصیل سے سمجھ سکتے تھے جیسا کہ معاشرے میں ایسے قانون کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں۔

واضح الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ وہ مشترکہ مکمل قانون جو اس انسانی معاشرے کی خوش حالی اور خوش نصیبی کو پورا کرے اور اس کے ذریعے انسان، فطرت اور حقیقی راستے کی طرف ہدایت حاصل کر سکے، اگر قدرتی اور فطری طور پر عقل کے ذمے لگایا گیا ہوتا تو ہر عقلمند انسان اس کو ضرور سمجھ سکتا تھا جیسا کہ نفع، نقصان اور اپنی زندگی کی تمام دوسری ضروریات کو سمجھتا ہے، لیکن ایسے قانون کا آج تک کہیں سراغ نہیں ملتا، اور وہ قوانین جو خود بخود پیدا ہو گئے ہیں یا ان کو کسی حکمران نے یا افراد اور قوموں نے بنایا ہے، اور آج انسانی معاشرے میں جاری اور نافذ ہیں، وہ سب کے سب ایک جماعت کے لیے فائدہ مند ہیں اور دوسری جماعت کے لیے نہیں ہیں۔ ایک جماعت ان قوانین سے مطلع ہے اور دوسری نہیں جانتی، لہٰذا تمام انسان جو انسانی لحاظ سے مساوی ہیں اور سب کے سب خداداد عقل رکھتے ہیں، ان قوانین کے بارے میں مشترکہ سوجھ بوجھ یا عقیدہ نہیں رکھتے۔

وہ مرموز شعور جسے وحی کہا جاتا ہے

گزشتہ بیان کے ذریعے واضح ہو گیا ہے کہ ایسا قانون جو انسانی سعادت اور خوش بختی کو پورا کرنے کی ضمانت دے سکے، عقل اس کو سمجھنے سے قاصر ہے اور چونکہ "عمومی ہدایت" کے نظریے کے مطابق انسانوں میں ایسی سوجھ بوجھ کا ہونا ضروری ہے تاکہ ایسے قانون کو سمجھ سکیں، پس ضروری ہے کہ انسانوں میں ایسے قانون کو سمجھنے

کے لیے ایک معیار، پیمانہ یا آلہ ہونا چاہیے جو زندگی کے حقائق و فرائض کو اچھی طرح بیان کر سکے اور سب کی دسترس میں قرار دے اور اس شعور و ادراک کو جو ظاہری عقل و شعور اور احساس کے علاوہ ہے "شعور وحی" کہا جاتا ہے، البتہ ہر انسان میں ایسی طاقت کا پیدا ہونا ضروری نہیں ہے کیونکہ ایسی طاقت تمام انسانوں میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ مثلاً قوت باہ تمام انسانوں میں موجود ہے لیکن شادی کی لذت کو سمجھنا اور شادی کرنا صرف اسی وقت میسر آ سکتا ہے جب انسان سنِ بلوغ کو پہنچ جائے، اسی طرح وحی کا شعور ان افراد میں جوان کو نہیں سمجھتے "مرموز" چیز ہے، بالکل اسی طرح جیسا کہ نابالغ افراد کے لیے شادی کی لذت کو سمجھنا مرموز ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں خصوصاً اپنی شریعت کی وحی اور اس کو سمجھنے میں عقل کی نارسائی کے بارے میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَّ النَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰٓ إِبْرٰهِيمَ وَ إِسْمٰعِيلَ وَ إِسْحٰقَ وَ يَعْقُوبَ وَ الْأَسْبَاطِ وَعِيسٰى وَ أَيُّوبَ وَ يُونُسَ وَ هٰرُونَ وَ سُلَيْمٰنَ ۚ وَ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُورًا ۝ وَ رُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَ رُسُلًا ...... رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَ مُنْذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ (سورہ نساء: ۱۶۳-۱۶۵)

"ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی جیسا کہ نوحؑ اور نوحؑ کے بعد آنے والے تمام پیغمبروں پر وحی نازل کی ......"۔

وہ پیغمبر جو انسانوں کو خوشخبری سناتے تھے اور خدا سے ڈراتے تھے تاکہ پیغمبروں کو بھیجنے کے بعد لوگوں کے پاس کوئی بہانہ نہ رہے کہ اگر خدا کو پہچاننے کے لیے عقل

کافی ہوتی تو اس کام کے لیے پیغمبروں کی کوئی ضرورت نہ ہوتی۔

پیغمبر اور نبوت کی عصمت

خدا کے پیغمبروں کا ظہور جیسا کہ گزشتہ فصل میں بیان ہوا ہے "نظریہ وحی" کی تائید اور تصدیق کرتا ہے۔ خدا کے پیغمبر ایسے انسان تھے جنھوں نے وحی اور نبوت کی دعوت اور تبلیغ کی اور اپنے دعوے کے بارے میں قاطع دلیل لاتے تھے اور خدا کے دین کے تمام پہلوؤں کو جو کہ سعادت اور خوشحالی بخشنے والا خدائی قانون ہے، لوگوں کو بتاتے تھے اور خاص و عام کی دسترس میں پہنچاتے تھے۔ اور چونکہ پیغمبر، وحی اور نبوت کے مالک تھے اس لیے جب بھی وہ اس دنیا میں تشریف لاتے اور ظاہر ہوتے تو ان کی تعداد بیک وقت ایک یا چند افراد سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ خدائے تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کو پیغمبروں کی دعوت و تبلیغ کے ذریعے مکمل کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ خدا کا ہر پیغمبر عصمت و طہارت کی صفت سے متصف ہونا چاہیے یعنی خدا کی طرف سے وحی حاصل کرنے اور اس کی حفاظت کرنے اور اس کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے پیغمبر کو ہر خطا اور غلطی سے پاک ہونا چاہیے۔ اس کو گناہ (قانونِ خدا کی خلاف ورزی) نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے وحی کے معنی، اس کی حفاظت اور تبلیغ کے تین مراحل یا ارکان ہیں جو فطری ہدایت پر مبنی ہیں اور فطرت میں کسی قسم کی غلطی یا خطا کا کوئی امکان نہیں ہے۔

دعوت و تبلیغ کے دعویدار (یعنی دعوت دینے والے) کی طرف سے ہر قسم کی غلطی یا خلاف ورزی خود مقاصد دعوت کے برعکس اور برخلاف اقدام ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس تبلیغ کی درستی اور حقیقت کے متعلق لوگوں کا یقین اور وثوق اُٹھ جائے اور اسی طرح آخرکار اس تبلیغ اور دعوت کے مقاصد اور غرض و غایت کو تباہ و برباد کرنے کا موجب ہوگا۔

اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں پیغمبروں کی عصمت وطہارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَ اجۡتَبَيۡنٰهُمۡ وَ هَدَيۡنٰهُمۡ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ

''ہم نے پیغمبروں کو اپنے پاس جمع کیا (یعنی وہ ہمارے بغیر کسی اور کے سامنے نہیں جھکتے اور نہ ہی اطاعت کرتے ہیں) اور ان کو ٹھیک راستے پر چلا دیا ہے''۔(سورۂ انعام: ۸۷)

اور پھر فرماتا ہے:

عٰلِمُ الۡغَيۡبِ فَلَا يُظۡهِرُ عَلٰى غَيۡبِهٖۤ اَحَدًا ○ اِلَّا مَنِ ارۡتَضٰى مِنۡ رَّسُوۡلٍ فَاِنَّهٗ يَسۡلُكُ مِنۡۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ وَمِنۡ خَلۡفِهٖ رَصَدًا ○ لِّيَـعۡلَمَ اَنۡ قَدۡ اَبۡلَغُوۡا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمۡ (سورۂ جن: ۲۶-۲۸)

''صرف وہی (خدا تعالیٰ) غیب کا جاننے والا ہے اور وہ اپنے علم غیب پر کسی کو مسلط نہیں کرتا، مگر اپنے پسندیدہ اور برگزیدہ بندوں کے سوا یعنی پیغمبروں کو، اور اس صورت میں آگے اور پیچھے سے ان (پیغمبر یا وحی) کی مکمل حفاظت کرتا ہے تاکہ خداوند تعالیٰ کے پیغامات بالکل اصلی حالت میں پہنچائیں)''۔

پیغمبر اور آسمانی دین

جو کچھ خدا کے پیغمبروں کو وحی کے ذریعے حاصل ہوا اور انھوں نے پیغام و نصیحت کے طور پر انسانوں تک پہنچایا اس کو ''دین'' کہتے ہیں، یعنی زندگی کا طریقہ اور انسانی قوانین وفرائض جو انسان کی حقیقی سعادت کو پورا کرتے ہیں۔

مجموعی طور پر ہر آسمانی دین دو حصوں پر مشتمل ہوتا ہے، یعنی اعتقادی اور عملی،

اعتقادی حصہ ایسے بنیادی عقائد اور حقیقت بینی کے اصولوں پر مشتمل ہوتا ہے جن پر انسان کو اپنی زندگی کی بنیاد رکھنی چاہیے۔ اور وہ تین بنیادی اصول یا ارکان ہیں یعنی توحید، نبوت، معاد (قیامت اور حساب کتاب کا دن) اگر ان تینوں میں سے ایک میں بھی شک پیدا ہو جائے یا کمی واقع ہو جائے تو دین کی پیروی نہیں ہو سکتی۔

دین کا عملی حصہ ایسے اخلاق اور عملی فرائض پر مبنی ہے جو خداوند تعالیٰ کی طرف سے انسان پر عائد کیے گئے ہیں اور انسان پر اس دنیا میں انسانی معاشرے کی طرف سے بھی عائد ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ وہ فرعی فرائض جو آسمانی ادیان میں انسان کے لیے بنائے گئے ہیں وہ دو قسم کے ہیں: یعنی اخلاق اور اعمال، اور پھر یہ دو دو حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔

اخلاق اور اعمال کا ایک حصہ وہ ہے جو صرف خداوند تعالیٰ سے متعلق ہے، مثلاً خلق، ایمانی صفت، اخلاص، تسلیم و رضا اور خضوع و خشوع وغیرہ۔ اور ایسے ہی نماز، روزہ، قربانی وغیرہ۔ اس قسم کے اخلاق اور اعمال کو عبادت کہا جاتا ہے، خضوع و خشوع اور بندگی انسان کو خدا کے سامنے ذمہ دار اور با اعتبار بناتے ہیں۔

نیک اعمال و اخلاق کا ایک حصہ وہ ہے جو معاشرے سے متعلق ہے، مثلاً انسانوں سے محبت، خیر خواہی، انصاف، سخاوت، میل جول کے فرائض اور طریقے اور لین دین وغیرہ اور اس قسم کے اخلاق و اعمال کو "معاملات" (لین دین یا معاہدہ کرنا) کہا جاتا ہے۔

دوسری طرف انسان ہمیشہ اور بتدریج ترقی و کمال کی طرف متوجہ ہے اور انسانی معاشرہ آہستہ آہستہ مکمل تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس قسم کی تکمیل آسمانی شریعتوں اور ادیان میں بھی ضروری اور لازمی ہے۔ اور قرآن کریم اس تدریجی ارتقا کو (جیسا کہ عقل کے ذریعے حاصل ہوتا ہے) تائید اور تصدیق کرتا ہے جیسا کہ قرآن مجید کی آیات سے

مستفاد ہوتا ہے، ایک شریعت یا دین کے بعد میں آنے والی شریعت یا دین کو مکمل تر بیان کرتا ہے:

وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ...... (سورۂ مائدہ: ۴۸)

''اور ہم نے کتاب (قرآن) کو تم پر نازل کیا ہے، حالانکہ اس سے پہلی کتابوں (تورات اور انجیل وغیرہ) کو پیش نظر رکھتی ہے اور ان کی تصدیق کرتی ہے، لیکن ان پر تسلط اور برتری رکھتی ہے''۔

البتہ جیسا کہ علمی نظریات اور عقائد سے پتا چلتا ہے اور قرآن کریم بھی اس کی وضاحت کرتا ہے۔ انسانی معاشرے کی زندگی، اس کائنات اور دنیا میں ابدی اور ہمیشگی نہیں ہے، لہٰذا فطری طور پر اس قسم کا ارتقا لامتناہی نہیں ہوگا۔ اسی طرح عمل اور اعتقاد کے لحاظ سے تمام انسانی فرائض مجبوراً ایک مقام یا مرحلے پر جا کر ٹھہر یا ختم ہو جائیں گے جس کے نتیجے میں ایک دن نبوت اور شریعت بھی عملی اصول کی توسیع اور اعتقاد کے ارتقا کے لحاظ سے اپنی آخری حد کو پہنچ کر ختم ہو جائیں گی۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اس موضوع کو واضح کرنے کے لیے کہ اسلام، حضرت محمد ﷺ کا دین تمام آسمانی ادیان سے مکمل تر اور آخری دین ہے۔ اپنے آپ کو ناقابل منسوخ کتاب اور حضرت محمد ﷺ کو آخری اور خاتم الانبیاء پیغمبر اور ایسے ہی دین اسلام کو تمام انسانی اور خدائی فرائض پر مشتمل بیان فرماتا ہے:

لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ (سورۂ حم: ۴۲)

''اور یقیناً قرآن ایسی کتاب ہے جو بہت ہی پیاری اور کسی

باطل چیز کو آگے یا پیچھے سے قبول نہیں کرتی بلکہ پاس بھی پھٹکنے نہیں دیتی (باطل اس کتاب میں راہ پیدا نہیں کر سکتا)"۔

اور پھر فرماتا ہے:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (سورۂ احزاب:۴۰)

"محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تم میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ خدا کے رسول اور آخری پیغمبر (خاتم النبیین) ہیں"۔

اور پھر فرماتا ہے:

وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (سورۂ نحل:۸۹)

"اور ہم نے تمھاری طرف کتاب بھیجی ہے جو ہر چیز کو واضح کرنے والی ہے"۔

پیغمبر اور وحی و نبوت کی حجت

موجودہ زمانے میں بہت زیادہ دانشور اور محقق جنھوں نے وحی اور نبوت کے بارے میں تحقیق کی ہے انھوں نے وحی، نبوت اور ان سے متعلقہ مسائل کو معاشرے کے نفسیاتی اصول کے ساتھ توجیہ کی ہے وہ کہتے ہیں کہ خدا کے پیغمبر پاک فطرت، بلند ہمت اور خلائق دوست انسان ہیں جنھوں نے انسانوں کی مادّی اور معنوی ترقی اور بُرے معاشروں کی اصلاح کے لیے قوانین بنائے ہیں اور لوگوں کو ان کی طرف دعوت دی ہے۔ چونکہ اس زمانے کے لوگ عقل اور منطق کو قبول نہیں کرتے تھے اس لیے انھوں نے لوگوں کی اطاعت اور فرمانبرداری حاصل کرنے کے لیے ان قوانین کو عالمِ بالا (خدا) سے منسوب کر دیا ہے اور اپنی پاک روح کو روح القدس اور اس سے حاصلہ افکار کو وحی و نبوت اور مطلوبہ فرائض کو آسمانی یا خدائی شریعت کہا جاتا ہے اور جن بیانات اور کلام

کے ذریعے یہ تمام امور بتائے جاتے ہیں ان کو" کلام خدا" یا" آسمانی کتاب" کہا ہے۔

جو شخص پورے انصاف کے ساتھ آسمانی کتابوں اور خصوصاً قرآن مجید میں گہرے غور وفکر سے اور اسی طرح پیغمبر کی شریعتوں میں توجہ کرے، بلا شک وشبہ اسے معلوم ہوگا کہ یہ نظریہ ٹھیک نہیں کہ خدا کے پیغمبر سیاست دان نہیں تھے بلکہ وہ مردانِ حق تھے اور ان میں سراپا صدق وصفا موجود تھا۔ وہ جس چیز کو سمجھتے تھے اس کو کسی کمی بیشی کے بغیر لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے، اور جو کچھ فرماتے تھے اس پر عمل بھی کرتے تھے، اور جس چیز کا دعویٰ کرتے تھے وہ ایک مرموز شعور تھا جو غیبی امداد کے ساتھ ان تک پہنچتا تھا اور اس کے ذریعے انسانوں کے عمل اور اقتصادی فرائض خداوند تعالیٰ سے حاصل کر کے لوگوں کے درمیان اس کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔

یہاں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دعویٰ نبوت کو ثابت کرنے کے لیے حجت، دلیل اور ثبوت ضروری ہے۔ اور اگر وہ شریعت جو ایک پیغمبر لاتا ہے وہ عقل کے مطابق ہو تو دعوائے پیغمبری کو ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے کیونکہ جو شخص پیغمبری اور نبوت کا دعویٰ کرتا ہے وہ اپنی شریعت کے حقیقی ہونے کے دعوے کے علاوہ ایک اور دعویٰ بھی کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ وحی ونبوت کے ذریعے عالم بالا سے تعلق اور رابطہ رکھتا ہے اور وہ خدا کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔ اور یہ دعویٰ بجائے خود ثبوت اور دلیل چاہتا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ (جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے) ہمیشہ لوگ اپنے سادہ افکار اور ذہنوں کے ساتھ خدا کے پیغمبروں سے ان کے دعویٰ نبوت اور پیغمبری کو ثابت کرنے کے لیے معجزے چاہتے تھے۔

اس سادہ اور ٹھیک منطق کے معنی یہ ہیں کہ وہ وحی اور نبوت جس کا ایک پیغمبر یا نبی دعویٰ کرتا ہے اور تمام دوسرے انسانوں میں جو اس کی طرح انسان ہیں یہ بات موجود نہیں ہے، مجبوراً اس کو ایک ایسی غیبی طاقت ماننا پڑے گا جو خدا کی طرف سے

مافوق الفطرت ذرائع سے پیغمبر کو ملتی ہے اور پیغمبر اس کے ذریعے سے خدا کے کلام کو سن کر اپنی رسالت کے مطابق اسے لوگوں تک پہنچاتا ہے۔ اگر یہ سب ٹھیک ہے، تو پیغمبر کو چاہیے کہ اپنے خدا سے ایک دوسری مافوق الفطرت چیز مانگے اور اسے لوگوں کے سامنے پیش کرے تاکہ لوگ اس کے ذریعے پیغمبر کی پیغمبری اور نبی کی نبوت و صداقت پر ایمان لے آئیں۔

جیسا کہ معلوم ہے پیغمبروں سے معجزے کی درخواست ایک ٹھیک اور درست منطق کے مطابق ہے اور خدا کا پیغمبر اپنی نبوت کے اثبات کے شروع ہی میں یا لوگوں کی درخواست کے بعد معجزہ دکھائے۔ اور قرآن کریم بھی اس منطق کی تائید اور تصدیق کرتا ہے اور اس طرح بہت زیادہ پیغمبروں کے معجزوں کو بیان کرتا ہے جو انھوں نے اپنی نبوت کے آغاز میں یا لوگوں کی درخواست کے بعد دکھائے ہیں۔

البتہ بہت سے محققین نے معجزے (مافوق الفطرت) سے انکار کیا ہے لیکن ان کے دلائل اور کلام ٹھوس نہیں ہیں اور علل و اسباب جو موجودہ زمانے تک ہونے والے حوادث و واقعات کے بارے میں تجربے اور تحقیق کے ذریعے ہمیں معلوم ہوئے ہیں، ان کے متعلق ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں کہ آیا یہی اسباب دائمی ہیں اور ان کے علاوہ ہرگز کوئی اور سبب یا حادثہ کسی اور طرح سے یا دوسرے علل و اسباب کے ذریعے رونما نہیں ہوسکتا؟ اور وہ معجزات جن کو پیغمبروں نے خدا سے منسوب کیا ہے، محال اور عقل کے خلاف نہیں ہیں (جیسا کہ تین کے عدد جفت نہیں ہوسکتا) بلکہ خارق العادت یا مافوق الفطرت ہیں، حالانکہ یہ خارق العادت یا کرامات ریاضت اور مجاہدہ کرنے والے افراد سے بہت زیادہ دیکھی اور سنی گئی ہیں۔

خدا کے پیغمبروں کی تعداد

تواریخ کے مطابق بہت زیادہ پیغمبر اس دنیا میں تشریف لائے ہیں اور قرآن

مجید میں ان میں سے اکثر اور بہت زیادہ پیغمبروں کی تصدیق کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک جماعت کا نام بھی لیا گیا ہے، لیکن تمام پیغمبروں کی حقیقی اور مشخص تعداد کو بیان نہیں کیا گیا ہے۔

کسی قطعی یا حتمی کتاب میں بھی پیغمبروں کی حقیقی تعداد بیان نہیں کی گئی سوائے اس کے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ کی مشہور روایت یا حدیث میں جو انھوں نے پیغمبر اکرم ﷺ سے نقل کی ہے۔ لکھا ہے کہ پیغمبروں کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار معین ہوئی ہے۔

اولوالعزم صاحب شریعت پیغمبر

قرآن کریم کے مطالب سے حاصل ہونے والے نتائج سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے تمام پیغمبر شریعت نہیں لائے ہیں بلکہ ان میں سے صرف پانچ پیغمبر یعنی حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہی اولوالعزم اور صاحب شریعت پیغمبر ہیں اور دوسرے تمام پیغمبر شریعت میں ان اولوالعزم پیغمبروں کے تابع تھے۔ اللہ تعالیٰ اپنے پاک کلام میں فرماتا ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى (سورۂ شوریٰ: ۱۳)

"خداوند تعالیٰ نے تمہارے لیے اسی دین کی شریعت بھیجی ہے جو نوحؑ پر نازل کی تھی اور جو تم پر نازل کی ہے اور جو ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ پر نازل کی تھی"۔

(یہ آیت مہربانی اور امتنان کا درجہ رکھتی ہے اور ظاہر ہے کہ اگر ان پیغمبروں کے علاوہ کوئی اور پیغمبر بھی صاحب شریعت ہوتا تو اس کا ذکر بھی اس آیت میں ہوتا)

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقَهُمْ وَ مِنْكَ وَ مِنْ نُّوْحٍ وَّ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِیْسَى ابْنِ مَرْیَمَ وَ اَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّیْثَاقًا غَلِیْظًاۙ (سورۂ احزاب: ۷)

"اور جب تم نے پیغمبروں سے وعدہ کر لیا تھا (بیعت کر لی تھی) اور تم سے اور ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ سے بھی وعدہ لیا تھا"۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت

خدا کے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو صاحب کتاب و شریعت ہیں اور مسلمان آپؐ پر (اور آپؐ کی پیغمبری کے مقاصد پر) ایمان لائے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سنہ ہجری قمری شروع ہونے سے پچاس سال پہلے حجاز کے شہر مکہ کے بنی ہاشم خاندان میں جو خاندانِ قریش میں سب سے باعزت گھرانہ تھا، پیدا ہوئے۔ آپؐ کے والد ماجد حضرت عبداللہ اور والدہ ماجدہ حضرت آمنہ تھے۔ آپؐ ابھی بچے ہی تھے کہ والد ماجد اور والدہ ماجدہ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اس کے بعد آپؐ اپنے دادا حضرت عبدالمطلبؑ کی سرپرستی میں آگئے۔ حضرت عبدالمطلبؑ بھی جلد ہی اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے، لہٰذا آپؐ کے چچا حضرت ابوطالبؑ نے آپؐ کی سرپرستی اور دیکھ بھال اپنے ذمے لی اور آپؐ کو اپنے گھر لے گئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے چچا حضرت ابوطالبؑ کے گھر پرورش پائی اور بڑے ہوئے۔ ابھی آپ کمسن ہی تھے کہ اپنے چچا کے ہمراہ تجارت کی غرض سے شام تشریف لے گئے۔ آپؐ نے تعلیم حاصل نہیں کی تھی اور لکھنا پڑھنا بھی نہیں سیکھا تھا لیکن سنِ بلوغ کو پہنچنے کے بعد آپؐ باعقل، باادب اور امانت دار مشہور ہو گئے تھے۔ عقل و امانت کے نتیجے میں ہی خاندانِ قریش کی دولت مند خاتون (خدیجہ) نے آپؐ کو اپنے مال کا سرپرست بنا دیا تھا۔ اسی طرح تجارت اور لین دین کے تمام کام آپؐ

کے سپرد کر دیے تھے۔

آنحضرت ﷺ نے مال تجارت کے ساتھ دو بار شام کا سفر کیا اور اپنی عقل و دانش کے ذریعے بہت زیادہ منافع حاصل کیا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اس خاتون نے آنحضرت ﷺ کو شادی کی پیش کش کی اور آپؐ نے بھی یہ پیش کش قبول کر لی۔ شادی کے بعد سے جو پچیس سال کی عمر میں ہوئی، چالیس سال کی عمر تک آپؐ یہی کام کرتے رہے۔ آپؐ نے عقل مندی اور امانت داری میں بہت زیادہ شہرت حاصل کر لی تھی، لیکن آپؐ بتوں کی پوجا نہیں کیا کرتے تھے۔ (اگرچہ اس زمانے میں عرب کا عام مذہب بت پرستی تھا) اور کبھی کبھی خلوت اور تنہائی میں جا کر اپنے خدا سے راز و نیاز کیا کرتے تھے۔ چالیس سال کی عمر تک (مکہ معظمہ کے نزدیک تہامہ پہاڑوں کے اندر ایک غار) غار حرا میں جا کر تنہائی میں خدا کی عبادت کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ آپؐ خدائے تعالیٰ کی طرف سے نبوت کے لیے منتخب ہوئے اور آپؐ کے ذمے تبلیغ کا کام لگا دیا گیا۔ اس طرح قرآن مجید کی پہلی سورت (سورۂ علق) آپؐ پر نازل ہوئی۔ اسی دن آپؐ اپنے گھر تشریف لائے اور راستے میں اپنے چچازاد بھائی حضرت علی ابن ابی طالبؑ کو دیکھا اور تمام واقعہ بیان کیا۔ حضرت علی علیہ السلام فوراً آپؐ پر ایمان لے آئے اور جب آپؐ گھر کے اندر تشریف لائے تو آپؐ کی بیوی (حضرت خدیجہؓ) بھی آپؐ پر ایمان لے آئیں۔

پیغمبر اکرم ﷺ نے جب پہلی بار لوگوں کی ایک جماعت کو دین اسلام کی دعوت دی تھی آپؐ بہت ہی شدید اور دردناک ردعمل سے دوچار ہوئے، لہٰذا مجبوراً ایک عرصے تک پوشیدہ اور خفیہ طور پر تبلیغ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ دوبارہ خدا کی طرف سے آپؐ کو حکم ملا کہ اپنے نزدیکی رشتہ داروں کو دین اسلام کی طرف بلائیں لیکن اس تبلیغ کا بھی کوئی فائدہ اور نتیجہ نہ نکلا اور حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے سوا کوئی شخص

مسلمان نہ ہوا (لیکن آئمہ اہل بیتؑ کی دستاویزات، اسناد و احادیث اور ایسے ہی حضرت علی علیہ السلام کے اشعار کے حوالے سے شیعہ معتقد ہیں کہ ابوطالبؑ ایمان لے آئے تھے مگر چونکہ وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اکیلے حامی تھے اس لیے اپنے دین (اسلام) اور ایمان کو لوگوں سے چھپا کر رکھتے تھے تاکہ قریش میں اپنی ظاہری طاقت کو محفوظ رکھ سکیں)۔ اس کے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا کے حکم کے مطابق اپنی تبلیغ کا کام اعلانیہ شروع کر دیا۔ اس اعلانیہ تبلیغ کے ساتھ اہل مکہ کی طرف سے شدید ردعمل، آزار، شکنجے اور دوسری تکالیف شروع ہو گئیں جو آپؐ اور آپؐ کے پیروکار دوسرے نئے مسلمانوں پر روا رکھی جاتی تھی۔

قریش کی طرف سے سختیاں اور تکلیفیں اس حد تک پہنچ گئی تھیں کہ بہت سے مسلمان اپنے گھر بار چھوڑ کر حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے چچا حضرت ابوطالبؑ اور بنوہاشم خاندان کے دوسرے افراد اپنے رشتہ داروں کے ساتھ شعب ابوطالب میں (جو مکہ کی ایک وادی میں ایک قلعہ تھا) محصور ہو گئے اور نہایت ہی سختی اور تنگی کی حالت میں زندگی گزارتے رہے۔ قریش خاندان میں سے کوئی شخص بھی ان سے میل جول اور لین دین نہ رکھتا تھا اور نہ ہی آپؐ اس قلعے سے باہر آنے کی طاقت رکھتے تھے۔

اگرچہ مکہ کے بت پرست اور مشرک لوگ ہر قسم کے دباؤ، شکنجے، مارنے پیٹنے، توہین، مذاق، رکاوٹ ڈالنے اور ہر قسم کی دوسری تکالیف دینے سے گریز نہیں کرتے تھے اور کبھی کبھی آپؐ کو اسلام کی تبلیغ اور دعوت سے ہٹانے کے لیے نرم رویہ اختیار کرتے ہوئے آپؐ کو بہت زیادہ مال و دولت سلطنت و امارت وغیرہ کا وعدہ بھی دیتے تھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر میں ان لوگوں کے وعدے اور تکلیفیں برابر تھے اور یہ سب چیزیں آپؐ کی ہمت، آپؐ کے ارادے اور فیصلے میں اضافہ کرتی تھیں۔

ایک دفعہ بت پرست لوگ آپؐ کے پاس آئے اور انھوں نے بہت زیادہ مال و دولت، امارت اور سلطنت کا وعدہ دیا تو آنحضرت ﷺ نے مثال کے طور پر ان سے فرمایا: "خدا کی قسم، جس کے ہاتھ اور اختیار میں میری جان ہے اگر میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دو، تو بھی خداوند تعالیٰ کی پرستش، اطاعت اور اپنے مشن سے ہاتھ نہیں کھینچوں گا"۔

آنحضرت ﷺ اپنی بعثت کے تقریباً دسویں سال میں شعب ابی طالب سے باہر آئے۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد آپؐ کے چچا حضرت ابوطالبؑ اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے اور اسی طرح آپؐ کی وفادار بیوی حضرت خدیجہؓ بھی فوت ہو گئیں۔

اس کے بعد پیغمبر اکرم ﷺ کے لیے کوئی پناہ گاہ اور امن کی جگہ نہ رہی۔ مکہ کے بت پرستوں اور مشرکوں نے آپؐ کو قتل کرنے کا خفیہ منصوبہ بنایا اور رات کے وقت چاروں طرف سے آپؐ کے مکان کو گھیرے میں لے لیا تاکہ رات کے آخری حصے میں ایک حملہ کر کے آپؐ کو بستر مبارک پر ہی قتل کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اس واقعے کی اطلاع دے دی اور حکم دیا کہ یثرب (مدینے) کی طرف ہجرت کر جائیں۔ آپؐ نے حضرت علیؑ کو اپنے بستر مبارک پر سونے کا حکم دیا اور خود خدا تعالیٰ کی حفاظت میں اپنے گھر سے نکلے [1] اور دشمنوں کے محاصرے میں سے گزر کر مکہ سے چند فرسخ (ایک فرسخ چھ کلومیٹر کے برابر) کے

---

[1] جیسا کہ تواریخ میں لکھا ہے: حضرت ابوبکر رات آپؐ کے ساتھ تھے۔ حضرت ابوبکر کا غلام دو اونٹنیاں لیے شہر مکہ کے باہر آپ کا منتظر تھا۔ آپؐ اور ابوبکر اونٹنیوں پر سوار ہو کر غار ثور تک پہنچ کر صبح ہونے والی تھی، لہٰذا آپؐ نے اونٹنیوں اور غلام کو واپس کر دیا اور خود ابوبکر کے ساتھ غار میں چھپ گئے۔ جب دشمن مایوس ہو کر واپس چلے گئے تو آپؐ دونوں غار سے نکل کر مدینہ منورہ روانہ ہو گئے۔ (مترجم)

فاصلے پر ایک غار میں پناہ لی۔ تین رات دن تک دشمن آپؐ کی تلاش میں لگے رہے اور جب آپؐ کو گرفتار کرنے میں نا اُمید ہو گئے تو واپس مکہ لوٹ گئے۔ تب آپ غار سے باہر نکلے اور یثرب (مدینہ منورہ) کی طرف روانہ ہو گئے!

اہلِ یثرب کے بزرگ پہلے ہی آنحضرت ﷺ پر ایمان لے آئے تھے اور آپ کی بیعت کر چکے تھے، انھوں نے آپ کا پرجوش استقبال کیا اور اپنے جان و مال کو آپؐ کے اختیار میں دے دیا۔

آنحضرت ﷺ نے پہلی بار یثرب (مدینہ) میں ایک چھوٹے سے اسلامی معاشرے کی بنیاد رکھی اور مدینہ کے اردگرد سکونت رکھنے والے یہودی قبیلوں اور اسی طرح اس علاقے کے طاقتور عرب قبیلوں کے ساتھ بھی معاہدے کیے اور پھر اسلام کی تبلیغ میں مصروف ہو گئے۔ اس طرح شہر یثرب "مدینۃ النبیؐ" کے نام سے مشہور ہو گیا۔

اسلام دن بہ دن ترقی اور وسعت پیدا کر رہا تھا۔ مسلمان مکہ میں قریش کے ظلم وستم میں گرفتار تھے۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے گھربار چھوڑ کر مدینہ کی طرف ہجرت کر کے شمع رسالت کے گرد پروانوں کی طرح جمع ہو رہے تھے۔ ان کو "مہاجرین" کہا جاتا تھا۔ اسی طرح یثرب میں آنحضرت ﷺ کے جانب داروں اور مددگاروں کو "انصار" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

اسلام بڑی تیزی سے ترقی کر رہا تھا لیکن اس کے باوجود قریش کے بت پرست اور حجاز کے یہودی قبیلے رکاوٹوں اور جنگوں سے باز نہیں آتے تھے۔ وہ ان منافقوں کے ساتھ مل کر جو مسلمانوں میں داخل ہو گئے تھے اور کسی طرح بھی پہچانے نہیں جاتے تھے، مسلمانوں کے لیے ہر روز ایک تازہ مصیبت پیدا کرتے رہتے تھے، یہاں تک کہ آخرکار جنگوں کی نوبت آئی اور مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے درمیان

بہت سی جنگیں لڑی گئیں جن میں فتح اسلامی لشکر کو ہی نصیب ہوتی تھی۔ ان چھوٹی اور بڑی جنگوں کی تعداد اسی (۸۰) سے زیادہ تھی، جن میں جنگِ بدر، جنگِ اُحد، جنگِ خندق اور جنگِ خیبر وغیرہ بہت ہی مشہور ہیں۔ پیغمبر اکرم ﷺ ان تمام جنگوں میں اکثر خود موجود ہوتے تھے۔ تقریباً تمام بڑی خونی جنگوں اور ایسے ہی بہت زیادہ چھوٹے بڑے معرکوں میں حضرت علی علیہ السلام کی وجہ سے ہی فتح ہوتی تھی، آپ ایسے شخص تھے کہ ان تمام جنگوں میں ہرگز پیچھے نہ رہتے تھے۔ ان تمام جنگوں میں جو ہجرت کے بعد دس سال کے عرصے میں لڑی گئیں۔ مسلمانوں میں سے دو سو سے کم تر شہید ہوئے اور کافروں میں سے ایک ہزار سے کم تر مارے گئے۔

آنحضرت ﷺ کی کارکردگی، مہاجرین اور انصار کی فداکاریوں اور جان نثاریوں کی وجہ سے ہجرت کے بعد دس سال کے عرصے میں اسلام تمام جزیرۃ العرب میں پھیل گیا۔ اس مدت میں دوسرے تمام ممالک مثلاً ایران، روم، مصر اور حبشہ وغیرہ کے بادشاہوں کو تبلیغی خطوط بھی لکھے گئے۔

آنحضرت ﷺ غریبوں کے ساتھ غریبوں کی سی زندگی گزارتے تھے اور اپنی اس فقیری پر فخر کیا کرتے تھے[1] اور اپنی زندگی میں ایک لمحہ بھی بیکار نہ رہتے تھے۔ آپ نے اپنے وقت کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک حصہ تو خدا کے لیے مخصوص تھا یعنی عبادات اور خدا کی یاد میں گزارتے تھے۔ دوسرا حصہ اپنے اہل خاندان اور گھر کی ضروریات کے لیے وقف تھا اور تیسرا حصہ لوگوں کے لیے تھا۔ اس حصے کو آپ معارف اسلامی کی تعلیم، اسلامی معاشرے کے کاموں اور اس کی اصلاح میں صرف کیا کرتے تھے اور مسلمانوں کی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ داخلی اور

---

① آپ ﷺ کی مشہور حدیث ہے الفقر فخری۔ اس قول کے مطالب کے لیے سیرت ابن ہشام، سیرت حلبی اور بحار الانوار، جلد ۶ وغیرہ کی طرف رجوع کریں۔

خارجی تعلقات کو مضبوط بنانے اور دوسرے تمام مملکتی اُمور میں صرف کیا کرتے تھے۔

مدینہ میں دس سال قیام کے بعد آنحضرت ﷺ اس زہر کی وجہ سے جو ایک یہودی عورت نے آپؐ کے کھانے میں ڈال کر کھلایا تھا کمزور ہوتے گئے اور چند دن کی بیماری کے بعد آپؐ رحلت فرما گئے۔ جیسا کہ احادیث و روایات میں موجود ہے کہ آپؐ کی زبان مبارک سے جو آخری الفاظ نکلے وہ عورتوں اور غلاموں کے (ساتھ بہتر سلوک کرنے کے) بارے میں وصیت تھی۔

پیغمبر اکرم ﷺ اور قرآن مجید

عوام، دوسرے پیغمبروں کی طرح پیغمبر اکرم ﷺ سے بھی معجزہ طلب کیا کرتے تھے اور آنحضرت ﷺ خود بھی پیغمبروں کے معجزات کی تصدیق فرماتے تھے، جیسا کہ قرآن مجید میں واضح طور پر ان کی تصدیق ہوتی ہے۔

آنحضرت ﷺ سے بھی بہت زیادہ معجزے رونما ہوئے اور ان میں سے بعض مسلّم اور قابلِ اعتماد ہیں لیکن آپؐ کا ہمیشہ باقی رہنے والا معجزہ جو زندہ اور موجود ہے "قرآن کریم" ہے، جو آپؐ کی الہامی اور آسمانی کتاب ہے۔ یہ خدائی کتاب چھ ہزار سے زیادہ آیات پر مشتمل ہے اور اس میں ایک سو چودہ چھوٹی بڑی سورتیں ہیں۔

قرآن کریم کی آیاتِ کریمہ آنحضرت کی تئیس سالہ نبوت اور بعثت کے دوران بتدریج نازل ہوئی ہیں اور اس کی ہر آیت یا مکمل سورت رات، دن، سفر، حضر، جنگ، صلح یا مختلف تنگی اور آسودگی کے زمانے میں وحی کے ذریعے نازل ہوئی ہے۔

قرآن مجید اپنی بہت زیادہ آیات میں واضح طور پر اپنے آپ کو معجزہ کہتا ہے اور تاریخی شہادت کے مطابق اس زمانے میں عرب کے لوگ جو فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ ترین درجے پر پہنچ چکے تھے اور اپنی زبان کی مٹھاس اور روانی کی وجہ سے شعر و شاعری اور تحریر و تقریر کے میدان میں دادِ سخن دیا کرتے تھے، ان کو مقابلے کے

لیے طلب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر یہ خیال کرتے ہیں کہ قرآن مجید ایک انسان کا ساختہ و پرداختہ ہے، یعنی خود حضرت محمدؐ نے اس کو اپنی طرف سے بیان کیا ہے یا آپؐ نے کسی اور سے سیکھا ہے اور اس کی تعلیم حاصل کی ہے تو اس (قرآن) کی مانند[1] یا اس کو دس سورتوں کی طرح[2] یا حتیٰ کہ ایک ہی سورت کی طرح[3] بنا کر لائیں اور اس کام کے لیے ہر ممکن ذرائع سے استفادہ کریں۔ عرب کے نامور سخن وروں اور ادیبوں نے اس چیلنج کے مقابلے میں جو جواب دیا وہ یہ تھا کہ یہ قرآن "جادو کی کتاب" ہے اور ہماری طاقت سے باہر ہے۔[4]

قرآن مجید صرف فصاحت و بلاغت کے ذریعے ہی چیلنج اور مقابلے کے لیے طلب نہیں کرتا بلکہ کبھی کبھی معنی کے لحاظ سے بھی مقابلے کی پیش کش کرتا ہے اور جنوں و انسانوں کی فکری اور علمی طاقت کو مقابلے کے لیے بلاتا ہے۔

---

① جیسا کہ فرماتا ہے: فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِن كَانُوا صَادِقِينَ (سورۂ طور:۳۴) "اگر وہ سچ کہتے ہیں تو قرآن کی مانند کلام لائیں"۔

② جیسا کہ فرماتا ہے: أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (سورۂ ہود:۱۳) "کہتے ہیں محمدؐ نے قرآن کو جھوٹ موٹ خدا سے منسوب کر دیا ہے، اے نبیؐ! کہہ دو کہ اگر جھوٹ اور تہمت ہے تو قرآن کی مانند دس سورتیں لا کر دکھاؤ اور اس کام کے لیے جس سے چاہو مدد حاصل کر سکتے ہو"۔

③ جیسا کہ فرماتا ہے: أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ (سورۂ یونس:۳۸) بلکہ وہ کہتے ہیں کہ قرآن جھوٹ ہے جسے خدا سے منسوب کیا گیا ہے تو کہہ دے کہ اگر یہ جھوٹ ہے تو قرآن کی طرح کی صرف ایک ہی سورت بنا کر دکھاؤ۔

④ جیسا کہ ایک عربی شاعر کے بارے میں آیا ہے: فَقَالَ إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ يُؤْثَرُ ○ إِنْ هَٰذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ (سورۂ مدثر:۲۴-۲۵) "(ولید نے بڑے غور و خوض کے بعد حق سے منہ موڑ کر سرکشی شروع کر دی) اس نے کہا: یہ قرآن سوائے جادو کے اور کچھ نہیں ہے اور یہ قرآن انسانی کلام کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے"۔

یہ کتاب دنیاوی زندگی کے مکمل پروگرام پر مشتمل ہے اور اگر اس میں غور و خوض یا تحقیق کریں تو یہ وسیع پروگرام جس میں انسانی زندگی کے تمام اعتقادات، اخلاق و اعمال کے تمام پہلو شامل ہیں اور ان تمام صفات کے چھوٹے چھوٹے اجزا پر بھی نظر رکھتی ہے۔ قرآن، خدا (حق) کی طرف سے ہے اور اسی کو "دین حق" کہتا ہے (یعنی اسلام ایسا دین ہے جس کے اصول و قوانین، حقیقت اور حقیقی صلاح سے سرچشمہ حاصل کرتے ہیں نہ کہ اکثریت اقوام کی خواہشات یا عوام میں سے ایک شخص کے ارادوں سے مثلاً ایک طاقتور اور حکمران انسان کی خواہشات سے)۔

اس وسیع پروگرام کی بنیاد بہت ہی عزیز و گرامی لفظ "حق" جس کے معنی ایک خدا پر ایمان ہے، رکھی گئی ہے اور اس کے تمام اصول و معارف، توحید (ایک خدا پر ایمان رکھنا) سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد پسندیدہ ترین انسانی اخلاق اصول و معارف سے حاصل کر کے ان کو پروگرام کا جز بنا دیا ہے۔ پھر انسانی اعمال کے بے شمار کلی اور جزوی اصول، انفرادی اور اجتماعی حالات کا مطالعہ اور اس سے متعلقہ فرائض جو ایک خدا کی پرستش اور عبادت سے سرچشمہ حاصل کرتے ہیں، بنائے گئے ہیں۔

دین اسلام میں اصول و فروع کے درمیان ایسا رابطہ موجود ہے کہ ہر قسم کے فرعی حکم کا اگر تجزیہ اور مطالعہ کیا جائے تو وہ لفظ توحید کی طرف واپس لوٹتا ہے اور لفظ توحید بھی فرعی اصول و احکام کے ساتھ مرکب ہوتا ہے۔

البتہ ایسے وسیع آئین اور قانون کی آخری ترتیب اور ساخت کے علاوہ جو اس قدر اتحاد اور تعلقات پر مشتمل ہے، حتیٰ کہ اس کی ابتدائی فہرست تیار کرنا بھی عام حالات میں ایک عام آدمی کی طاقت سے باہر ہے، خواہ وہ دنیا کا کتنا بڑا قانون دان ہی کیوں نہ ہو تو اس شخص کی تو بات ہی دوسری ہے جو بہت کم عرصے میں ہزاروں بلکہ لاکھوں مصروفیات، جانی، مالی، ذاتی، عمومی مشکلات کے علاوہ خونی جنگوں، اندرونی اور

بیرونی سازشوں، ممانعتوں اور رکاوٹوں میں پھنس کر آخرکار دنیا کے مقابلے میں اکیلا اور تنہا رہ گیا ہو۔

اس کے علاوہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لکھنا پڑھنا بھی نہیں سیکھا تھا اور نہ ہی کسی سے تعلیم حاصل کی تھی اور دعوت اسلام سے پہلے① اپنی دو تہائی زندگی بھی اس قوم کے درمیان گزاری تھی جو تہذیب وتمدن سے بالکل عاری تھی بلکہ اس قوم میں تہذیب وتمدن کی بو تک بھی موجود نہ تھی اور وہ قوم خشک، بنجر اور ریگستانی زمین میں سخت گرم آب و ہوا کے اندر ناگفتہ بہ حالت میں زندگی گزارتی تھی اور ایسے ہی ہر روز اپنے ہمسایہ ممالک کی حکومتوں میں سے ایک کے زیر تسلط رہتی تھی۔

ان سب کے علاوہ قرآن مجید ایک دوسرے طریقے سے چیلنج کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ کتاب بتدریج مختلف حالات وشرائط میں گوناگوں مشکلات، آسودگی، آرام، جنگ، صلح، طاقت، کمزوری وغیرہ کے دوران تیئس سال کی مدت میں نازل ہوتی رہی ہے اور اگر یہ کتاب خدا کی طرف سے نہ ہوتی اور ایک انسان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہوتی تو اس میں ضرور تناقض اور تضاد موجود ہوتا اور لامحالہ اس کا آخری حصہ جو پہلے

---

① اللہ تعالیٰ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے فرماتا ہے: فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (سورۂ یونس:۱۶) "میں قرآن مجید کے نازل ہونے سے پہلے ایک عمر تک تمہارے درمیان زندگی گزارتا رہا ہوں، کیا تم نہیں سمجھتے؟ اور پھر فرماتا ہے: وَمَا كُنتَ تَتْلُو مِن قَبْلِهِ مِن كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ (سورۂ عنکبوت:۴۸) "قرآن مجید نازل ہونے سے پہلے لکھے ہوئے کو نہیں پڑھ سکتا تھا اور نہ ہی اپنے ہاتھوں سے لکھ سکتا تھا"۔ اور پھر فرماتا ہے: وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ (سورۂ بقرہ:۲۳) "اور اگر تم اس قرآن کے بارے میں شک کرتے ہو جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تو تم بھی (ایسے شخص سے جو ویسی ہی شرائط رکھتا ہو، یعنی جس نے لکھنا پڑھنا نہ سیکھا ہو یا جس کا کوئی تعلیم دینے والا نہ ہو) محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح ایسی سورت لکھ کر لاؤ تاکہ معلوم ہو جائے کہ قرآن مجید خدا کا کلام نہیں ہے۔

حصے سے بہتر ہوتا جیسا کہ انسانی تکمیل کا لازمہ ہے، لیکن اس کتاب (قرآن) کی مکی آیات اور مدنی آیات یکساں ہیں اور اس کا آخری حصہ ابتدائی حصے سے کوئی فرق نہیں رکھتا اور یہ کتاب متشابہ الاجزا (جس کے تمام اجزا مشابہ اور مانند ہوں) ہے اور اپنی حیرت انگیز بیانی اور کلامی طاقت میں ایک ہی نہج اور طریقے پر ہے۔[1]

---

(1) جیسا کہ فرماتا ہے: اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَ لَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا (سورۂ نساء:۸۲) ''کیا یہ لوگ قرآن مجید میں تدبر اور غور و خوض نہیں کرتے؟ اور اگر یہ قرآن خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے نازل ہوا ہوتا تو اس میں بہت زیادہ اختلاف پیدا کرتے''۔

معاد کی پہچان

- انسان، روح اور بدن سے بنا ہے
- دوسرے نظریئے سے روح کی حقیقت کے بارے میں بحث
- "موت" اسلامی نظریئے کے مطابق
- برزخ
- روز قیامت اور رستاخیز
- ایک اور بیان
- پیدائش کا جاری رہنا

انسان، روح اور بدن سے بنا ہے

جو لوگ اسلامی علوم سے کسی حد تک واقفیت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ قرآن وسنت میں روح، جسم یا نفس و بدن کے بارے میں بہت زیادہ بیان کیا گیا ہے۔ یا یہ کہ جسم اور بدن کا تصور جو ادراک کے ذریعے محسوس ہو سکتا ہے، کسی حد تک سمجھنا آسان ہے اور روح یا نفس کا تصور مبہم اور پیچیدہ ہے۔

شیعہ اور سنّی علمائے علم بحث، ماہرین علم کلام اور فلسفہ، روح کی حقیقت کے بارے میں مختلف نظریات رکھتے ہیں، لیکن ایک حد تک مسلّم ہے کہ اسلامی نظریے کے مطابق روح اور بدن دو مختلف اور ایک دوسرے کے مخالف حقائق ہیں۔ موت کی وجہ سے بدن میں زندگی کی تمام خصوصیات ختم ہو جاتی ہیں اور آخرکار یہ بدن ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ لیکن روح ایسی نہیں ہے بلکہ حقیقی زندگی میں موجود ہے اور جب تک روح بدن سے متعلق ہے، بدن بھی اس سے زندگی حاصل کرتا ہے اور جب روح بدن سے جدا ہو جاتی ہے اور بدن سے تعلق توڑ لیتی ہے (یعنی جب موت آ جاتی ہے) تو بدن بے جان ہو جاتا ہے، لیکن روح اسی طرح اپنی زندگی جاری رکھتی ہے۔

جو کچھ قرآنِ مجید میں غور و خوض اور فکر و تدبر سے اور ایسے ہی آئمہ اہلِ بیت کے بیانات سے حاصل ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ انسانی روح ایک ایسا غیر معمولی مظہر ہے جو بدن کے ساتھ ایک قسم کی ہم بستگی اور یگانگت رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنی کتاب قرآنِ مجید میں فرماتا ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِينٍ ○ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ○ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ

لَحۡمًا ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰهُ خَلۡقًا اٰخَرَ (سورۂ مومنون: ۱۲-۱۴)

''تحقیق ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا ہے۔ پھر اس کو نطفے میں تبدیل کر دیا ہے اور اس کی جگہ پر محفوظ رکھا۔ پھر نطفے کو منجمد خون کی شکل دے دی۔ اس کے بعد منجمد خون کو چبائے ہوئے گوشت کی شکل میں تبدیل کیا۔ پھر اس چبائے ہوئے گوشت کو ہڈیوں میں تبدیل کر دیا۔ پس ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا۔ اس کے بعد اس کو ایک ایسی موجود بنایا جس کی اس سے پہلے مثال نہ تھی''۔

ان آیات کے معنی سے واضح ہے کہ مندرجہ بالا آیات فطرت کے مادی اور تدریجی ارتقا کو بیان کرتی ہیں اور اس کے ذیل میں جب روح یا شعور اور ارادے کی پیدائش کے بارے میں اشارہ کرتی ہیں تو ایک اور فطرت کو بیان کرتی ہیں جو پہلی قسم کی پیدائش یا فطرت کے بالکل برعکس اور مخالف ہے۔

اسی طرح قرآن مجید ایک دوسری جگہ معاد کے منکروں کے جواب میں اس مضمون کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انسان موت کے بعد اور بدن کے ختم ہو جانے اور زمین کے اجزا میں گم ہو جانے کے بعد کس طرح دوبارہ زندہ ہوتا ہے اور پہلے انسان کی طرح ہو جاتا ہے؟ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلۡ يَتَوَفّٰىكُمۡ مَّلَكُ الۡمَوۡتِ الَّذِىۡ وُكِّلَ بِكُمۡ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمۡ تُرۡجَعُوۡنَ (سورۂ سجدہ: ۱۱)

''اے پیغمبرؐ! کہہ دو کہ موت کا فرشتہ تمہیں تمہارے بدنوں سے الگ کر دیتا ہے، اور اس کے بعد تم اپنے خدا کی طرف واپس لوٹ جاتے ہو، یعنی جو چیز موت کے بعد ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین کے اجزا میں گم اور حل ہو گئی ہے وہ تمہارے بدن ہیں۔

لیکن تم کو (تمہاری روحوں کو) موت کے فرشتے نے تمہارے بدن سے نکال لیا ہے اور ہمارے پاس محفوظ ہو"۔

اس قسم کی آیات کے علاوہ قرآن مجید ایک جامع بیان کے ذریعے روح کو غیر مادی چیز کہتا ہے، اور جیسا کہ فرماتا ہے:

وَ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَ مَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ○ (سورۂ بنی اسرائیل:۸۵)

"اے نبیؐ! تجھ سے روح کی حقیقت کے بارے میں سوال کرتے ہیں، تو کہہ دے کہ روح خدا کا امر ہے"۔

دوسری جگہ خدا کے امر کا یوں تعارف کراتا ہے:

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ○ فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (سورۂ یٰسین:۸۲-۸۳)

"خدا کا امر جب کسی چیز کو بنانا چاہتا ہے تو فرماتا ہے کہ ہو جا اور وہ چیز بن جاتی ہے، اور ہر چیز کی حقیقت بھی یہی ہے"۔

اور ان آیات کا تقاضا یہ ہے کہ جہان اور اشیاء کی پیدائش میں خدا کا فرمان تدریجی نہیں ہے اور زمان و مکان کی تسخیر میں بھی نہیں آسکتا۔ پس روح جو کہ خدا کے فرمان کی حقیقت کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے، مادی نہیں ہو سکتی اور اپنے وجود میں مادیات کی خاصیت بھی نہیں رکھتی کیونکہ مادیات کی خاصیت زمان و مکان کی زد میں بتدریج ارتقا حاصل کرتی ہے۔

دوسرے نظریئے سے روح کی حقیقت کے بارے میں بحث

عقلی تحقیق اور غور و فکر بھی روح کے بارے میں قرآن کریم کے نظریئے کی

تصدیق کرتے ہیں، تمام انسانوں میں سے ہر ایک اپنے بارے میں ایک حقیقت کو سمجھتا ہے اور اس سے ''نفس'' کی تعبیر کرتا ہے۔ انسان میں یہ ادراک ہمیشہ موجود ہے، حتیٰ کہ کبھی کبھی اپنے سر، ہاتھ، پاؤں اور تمام اعضائے بدن کو یا پورے جسم کو بھول جاتا ہے لیکن جب تک خود موجود ہے، خود ''میں'' اس کے ادراک سے باہر نہیں نکلتا، اور یہ مشہود، جیسا کہ واضح ہے قابلِ تقسیم اور قابلِ تجزیہ نہیں ہے اور اگرچہ انسان کا بدن ہمیشہ تغیر وتبدل کرتا ہے اور اسی طرح مختلف مکانات اپنے لیے انتخاب کرتا رہتا ہے اور گوناگوں حالات و زمان اس پر گزرتے رہتے ہیں مگر مذکورہ بالا حقیقت یعنی ''میں'' اپنی جگہ پر ثابت رہتی ہے اور یہ اپنی واقعیت اور حقیقت میں ناقابلِ تغیر وتبدل ہے، لہٰذا واضح ہے کہ اگر یہ حقیقت مادی ہوتی تو جیسا کہ مادیات کی خصوصیت ہے، زمان و مکان کی تبدیلیوں اور تقسیموں کو بھی ضرور قبول کر لیتی۔

بدن ان تمام خواص کو قبول کر لیتا ہے اور روحانی تعلق اور ارتباط کی وجہ سے یہ خواص روح سے بھی منسوب کر دیئے جاتے ہیں لیکن تھوڑی سی توجہ سے انسان پر واضح ہو جاتا ہے کہ اس وقت یا اُس وقت، یہاں یا وہاں، یہ مشکل یا وہ مشکل اور اِس طرف یا اُس طرف، یہ تمام خواص بدن کے لیے ہیں اور روح ان خواص سے پاک اور بَری ہے اور یہ تمام صفات بدن کے ذریعے اس تک بھی پہنچتی ہیں۔

اس قسم کا بیان خاص کر ادراک و شعور (علم) میں جو کہ روح کے خواص میں سے ہے، ہمیشہ جاری ہے اور ظاہر ہے کہ اگر علم کی خاصیت مادی ہوتی تو مادہ کے مطابق تقسیم، تجزیے اور زمان و مکان کو قبول کر لیتا۔

البتہ اس عقلی بحث کا دامن بہت زیادہ وسیع ہے اور بے اندازہ سوالات کا حامل ہے (یعنی اس کے بارے میں بے انتہا سوالات کیے جا سکتے ہیں) جو اس کتاب کی گنجائش سے باہر ہیں اور اس میں سما نہیں سکتے۔ اس بحث میں اسی قدر اشارے کے طور پر

یہاں بیان کیا گیا ہے۔ مکمل بحث کے لیے اسلامی فلسفے کی کتابوں کی طرف رجوع کریں۔

موت، اسلامی نظریئے کے مطابق

اگرچہ عام طور پر لوگ، انسان کی موت کو اس کی نابودی اور بربادی تصور کرتے ہیں اور انسانی زندگی کو اسی چند روزہ زندگی تک محدود اور تصور کرتے ہیں، جو پیدا ہونے اور مرجانے کے درمیان ہے۔ لیکن اسلام، موت کو ایک ایسا مرحلہ جانتا ہے جو زندگی کے ایک مرحلے سے دوسرے میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ اسلام کے مطابق انسان ہمیشہ کی زندگی رکھتا ہے جس کے لیے کوئی خاتمہ موجود نہیں ہے اور موت جو کہ روح اور بدن کی جدائی ہے، اس کو زندگی کے ایک نئے مرحلے میں داخل کردیتی ہے اور اس مرحلے میں کامیابی اور ناکامی بھی نیکیوں اور بدیوں کی بنیاد پر ہوگی جو اس مرحلے سے پہلے مرحلے میں کی گئی ہیں۔

پیغمبر اکرم ﷺ فرماتے ہیں: ''تمہیں یہ گمان ہے کہ تم موت سے مرجاؤ گے؟ نہیں، بلکہ تم ایک مکان یا گھر سے دوسرے مکان یا گھر میں منتقل ہوجاؤ گے؟

(بحارالانوار، جلد۳، ص ۱۶۱، اعتقاداتِ صدوقؒ)

برزخ

جیسا کہ کتاب و سنت سے مستفاد ہوتا ہے۔ انسان، موت اور قیامت کے دوران ایک عام، محدود اور وقتی زندگی گزارتا ہے، جس کو ''برزخ'' کہتے ہیں یعنی دنیاوی زندگی اور اُخروی زندگی کا درمیانی فاصلہ ہے۔ (بحارالانوار، جلد۲، باب البرزخ)

انسان سے موت کے بعد اپنے اعتقادات کی وجہ سے نیک و بداعمال کے بارے میں جو اس نے اس دنیا میں انجام دیئے ہیں خاص طور سے پوچھ گچھ ہوگی اور ایک اجمالی حساب کے بعد جو نتیجہ حاصل ہوگا، ایک شیریں اور اچھی زندگی یا ناگوار اور تلخ زندگی

اس کو عطا ہوگی اور قیامت تک اسی میں رہے گا"۔ (بحار الانوار، جلد ۲، باب البرزخ)

برزخ میں انسان کی زندگی اس انسان کے مشابہ ہوگی جو وقتی طور پر اپنے اعمال کی وجہ سے حوالات بھیج دیا گیا ہو اور اس کا مقدمہ ابھی عدالت کے سپرد نہ ہوا ہو، اور اس سے مزید پوچھ گچھ اور اس کے بارے میں تفتیش ابھی باقی ہو اور اس کا مقدمہ مکمل ہو جانے تک اس کو حوالات میں ہی رکھا گیا ہو تا کہ مقدمے کی کارروائی مکمل ہونے کے بعد عدالت میں اس کے اعمال کی سزا دی جائے یا اس کو بری کر دیا جائے۔

برزخ میں انسان کی روح بالکل اسی طرح ہوگی جیسے وہ دنیا میں زندگی گزارتا رہا ہو، اگر وہ نیک ہے تو اس کو نعمت، سعادت اور پاک لوگوں کی صحبت نصیب ہوگی اور اگر وہ برا انسان ہے تو اس کو عذاب ہوگا اور برے لوگوں کی صحبت نصیب ہوگی جن میں شیطان اور گم راہ لوگ شامل ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے اہلِ سعادت اور خوش نصیب لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے:

وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ ○ فَرِحِیْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ یَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِیْنَ لَمْ یَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ○ یَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ وَّ اَنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ ○

(سورہ آل عمران: ۱۶۹-۱۷۱)

"(اے پیغمبرؐ) البتہ یہ خیال نہ کرو کہ جو لوگ خدا کی راہ میں شہید کیے گئے ہیں وہ مردہ ہیں، بلکہ وہ زندہ ہیں اور خدا کے پاس ان کو اعلیٰ درجے نصیب ہوئے ہیں (مقرب درگاہ ہوئے ہیں) اور ان کو خدا کی طرف سے روزی ملتی ہے اور جو چیز خدا

کے فضل و کرم سے ان کو ملتی ہے وہ اس پر خوش ہیں اور مومنین
میں سے جو لوگ ان کی راہ پر چلتے ہیں اور ان تک ابھی نہیں پہنچ
پائے ہیں ان کو بشارت اور خوشخبری دیتے ہیں (اگر یہ بھی شہید
ہوں تو) ان کو بالکل خوف یا ڈر نہیں ہے، بشارت اور خوشخبری
دیتے ہیں کہ نعمت اور فضلِ خدا (جس کی کوئی تعریف یا حد
موجود نہیں ہے) ان کے شاملِ حال ہوگی اور یقیناً خداوند
تبارک وتعالیٰ مومنوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا"۔

اور اسی طرح دوسرے گروہ کے بارے میں جو اپنی زندگی میں مال و دولت سے جائز فائدہ نہیں اٹھاتا یا اس کو بُرے کاموں پر صرف کرتا ہے، خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۝ لَعَلِّيْٓ
اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ۭ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ۭ وَمِنْ
وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (سورۂ مومنون: ۹۹-۱۰۰)

"جب ان لوگوں میں سے ایک پر موت آتی ہے تو وہ کہتا ہے
کہ اے خدا! مجھے دوبارہ دنیا میں واپس لوٹا دے تاکہ شاید اپنے
مال و دولت کو نیک راہ میں خرچ کرسکوں۔ یہ وہ کلام نہیں ہے جو
وہ کہہ رہا ہے (یعنی اس کی باتوں کو نہیں سنا جائے گا) اور ایسے
لوگوں کے درپیش ایک برزخ ہے جس میں وہ قیامت تک موجود
رہیں گے (یعنی وہ برزخ کی حالت قیامت تک جاری رہے گی)۔

روزِ قیامت۔رستخیز

آسمانی اور الہامی کتابوں میں قرآن مجید ہی واحد کتاب ہے جس نے قیامت کے بارے میں تفصیل سے بیان کیا ہے، اگرچہ تورات میں اس دن کے بارے میں کوئی

ذکر نہیں ہوا۔ انجیل نے بہت ہی مختصر سا بیان قیامت کے متعلق دیا ہے۔ قرآنِ مجید نے سینکڑوں بار روزِ قیامت کے متعلق مختلف طریقوں اور ناموں سے اس دن کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس دن دنیا اور اہلِ دنیا کو کیا پیش آئے گا، بہرحال قیامت کے بارے میں قرآنِ مجید میں کبھی اجمالی طور پر اور کبھی تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

بارہا بیان فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن پر ایمان بھی خدا پر ایمان لانے کے مترادف ہے اور اسلام کے تین اصولوں میں سے ایک ہے، لہٰذا جو شخص قیامت کا منکر ہوگا وہ اسلام سے خارج ہو جائے گا اور اس کا انجام ہلاکت اور تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

حقیقت بھی یہی ہے کیونکہ اگر خدا کی طرف سے حساب و کتاب اور صلہ و انعام نہ ہو تو دین کی تبلیغ اور دعوت جو خداوند تعالیٰ کے احکام کا مجموعہ ہے اور امر و نہی پر مشتمل ہے اس کا بالکل کوئی اثر نہیں ہوگا۔ اس طرح نبوت و تبلیغ کا بھی کوئی اثر نہ ہوگا بلکہ اس کا نہ ہونا، ہونے سے بہتر سمجھا جائے گا، کیونکہ دین کو قبول کر کے شرعی قوانین و اصول کی پیروی، آزادی کو ہاتھ سے دینے کے برابر ہوگی اور اگر دین کی پیروی اور اطاعت کا کوئی اثر نہ ہو تو لوگ ہرگز اس کو قبول نہیں کر سکتے اور اپنی فطری آزادی کو ہاتھ سے نہیں دے سکتے۔

یہاں واضح ہو جاتا ہے کہ روزِ قیامت پر ایمان بہت ہی اہم عنصر ہے کہ انسان کو تقویٰ اور پرہیزگاری کی طرف مائل کر کے ناپسندیدہ اخلاق اور کبیرہ گناہوں سے منع کرے جیسا کہ قیامت کو بھول جانا یا اس پر ایمان نہ رکھنا ہر گناہ اور خطا کی اصل بنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی پاک کتاب (قرآنِ مجید) میں فرماتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يَضِلُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ

بِمَا نَسُوا يَوْمَ الْحِسَابِ ○ (سورۂ ص: ۲۶)

''جو لوگ خدا کے راستے سے ہٹ کر گم راہ ہو جاتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے کیونکہ انھوں نے قیامت کے دن کو بھلا دیا ہے''۔ (جیسا کہ واضح ہے، روز قیامت کو بھول جانا ہر گم راہی اور گناہ کی اصل بنیاد ہے)

انسان اور کائنات کی پیدائش میں غور کرنے اور ایسے ہی آسمانی شریعتوں (احکام و اصول) کی غرض و غایت سے ایک ایسے دن (قیامت) کے موجود ہونے پر روشنی پڑتی ہے۔

جب ہم ان حوادث و واقعات پر غور و خوض کرتے ہیں جو کائنات میں رونما ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی کام بھی (کہ ہر کام ایک قسم کی ضرورت اور حرکت پر مشتمل ہے) بغیر کسی غرض و غایت کے انجام نہیں پاتا اور ہرگز اپنے آپ اور مقصود و مطلوب کے بغیر کوئی حقیقت نہیں رکھتا بلکہ غرض و غایت پر مشتمل ہے اور اسی اصلی مقصد کا مقدمہ ہے اور اسی مقصود کے بغیر کوئی حقیقت نہیں رکھتا بلکہ غرض و غایت پر مشتمل ہے اور اسی اصلی مقصد کا مقدمہ ہے اور اسی مقصود کی خاطر انجام پاتا ہے حتیٰ کہ وہ کام اور امور جو ظاہری طور پر بے مقصد شمار ہوتے ہیں مثلاً قدرتی کام یا بچوں کے کھیل وغیرہ۔ اگر ان میں بھی غور کریں تو ان کاموں کے مناسب غرض و غایت کا مشاہدہ کریں گے جیسا کہ قدرتی اُمور جو عام طور پر حرکت پر مشتمل ہیں، وہ مقصد جس کی خاطر حرکت کرتے ہیں وہی ان کی غرض و غایت ہے اور بچوں کے کھیلوں میں بھی کھیلوں کے مناسب ایک خیالی اور وہمی مقصد موجود ہے جو اس کھیل کی اصلی بنیاد ہے (یعنی اس خیال اور گمان تک پہنچنا)۔

البتہ کائنات اور جہان کی پیدائش خدا کا کام ہے اور خداوند تعالیٰ بیہودہ اور بے مقصد کام انجام دینے سے پاک ہے۔ خدائے تعالیٰ ہمیشہ پیدا کرتا ہے، روزی دیتا

ہے، مارتا ہے اور پھر دوبارہ زندہ کرتا ہے، روزی دیتا ہے، مارتا ہے اور اسی طرح بناتا ہے اور پھر ختم کر دیتا ہے بغیر اس کے کہ اس کائنات سے اس کو کوئی فائدہ پہنچے یا ایک مستقل مقصد کو نظر میں رکھے۔

پس ناچار دنیا اور انسان کی خلقت اور پیدائش کا ایک مستقل مقصد ہے۔ البتہ اس کا فائدہ یا منافع خدا کو نہیں پہنچتا کیونکہ خداوند تعالیٰ ہر چیز سے بے نیاز ہے اور ہر فائدہ صرف مخلوق کو ہی پہنچتا ہے۔ پس یوں کہنا چاہیے کہ یہ دنیا اور انسان ایک مستقل چیز اور مکمل وجود کی طرف چل رہے ہیں جس میں زوال اور فنا موجود نہیں ہے۔

اور جب دینی تعلیم و تربیت کے لحاظ سے بھی ہم انسانوں کے بارے میں غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی رہنمائی اور دینی تعلیم کے اثر سے لوگ دو گروہوں یعنی نیکوکاروں اور بدکاروں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ اس طرح اس زندگی میں کوئی فرق و امتیاز موجود نہیں ہے بلکہ بالکل برخلاف اور اکثر ترقی و کامیابی بدکاروں اور ظالموں کو ہی ملتی ہے اور نیکوکار لوگ ہمیشہ مصائب و مشکلات کا شکار ہوتے ہیں اور اس دنیا میں ان کے لیے ہر قسم کی محرومیت اور مصیبت موجود ہوتی ہے۔

اس صورت میں عدلِ خداوندی کا تقاضا یہ ہے کہ ایک دوسری دنیا پیدا کرے اور وجود میں جس میں دونوں گروہ اپنے عمل کی سزا اور جزا کو پہنچیں اور ہر گروہ اپنے اپنے حال کے مطابق زندگی گزارے۔ خداوند تعالیٰ نے ان دونوں طریقوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ○ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (سورۂ دخان، ۳۸-۳۹)

"اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان موجود

ہے، بیہودہ اور بے فائدہ پیدا نہیں کیا ہے" اور یہ احتمال ان لوگوں کی عقل وخرد اور خیال سے بہت دُور ہے جو خدا کے منکر ہو گئے ہیں۔ ان کافروں کے حال پر افسوس کہ ان کو آگ (دوزخ) کا وعدہ کیا گیا۔ آیا جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انھوں نے نیک کام انجام دیے ہیں ان کے ساتھ ان لوگوں کی طرح سلوک کیا جائے گا جو زمین میں تباہی اور بربادی لاتے ہیں؟ یا پرہیزگاروں کو بھی فاسقوں اور بُرے لوگوں کی طرح رکھا جائے گا؟"

اور دوسری جگہ دونوں طریقوں اور دلیلوں کو ایک جگہ جمع کرتے ہوئے فرماتا ہے:

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ نَجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً مَحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ○ وَخَلَقَ اللَّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزَى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ○

"کیا جو لوگ جرم اور قتل و غارت گری کرتے ہیں وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں کی طرح رکھیں گے جو ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے نیک کام انجام دیے ہیں؟ جن کی موت اور زندگی برابر ہے، تو ان لوگوں کا گمان غلط ہے۔ خدا نے آسمانوں اور زمینوں کو حق پیدا کیا ہے (نہ کہ بے ہودہ) اور ہر شخص کو اس کے اعمال کے مقابلے میں سزا یا جزا ملے گی بغیر اس کے کہ کسی پر ذرا برابر بھی ظلم ہو (یعنی کسی کا ذرا بھر حق ضائع کیا جائے)"۔ (سورۂ جاثیہ: ۲۱-۲۲)

ایک اور بیان

قرآن مجید کے ظاہر و باطن کے متعلق ہم نے اس کتاب کے دوسرے باب میں اشارہ کیا ہے کہ قرآن کریم میں اسلامی علوم و معارف کے بارے میں مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے جو مجموعی طور پر ظاہر و باطن کے دو طریقوں میں منقسم ہوتے ہیں۔

ظاہری طریقے کا بیان وہ بیان ہے جو عام فہم اور سادہ لوگوں کے لیے مناسب ہے اور باطنی طریقے کے بالکل برعکس جو خاص لوگوں سے متعلق ہے اور یا معنوی اور روحانی ذریعے سے سمجھا جاتا ہے۔

وہ معانی جو ظاہری طریقے سے حاصل ہوتے ہیں وہ خدا تعالیٰ کو اس کائنات کا مطلق حکمران اور فرماں روا بیان کرتے ہیں کہ تمام جہان اور کائنات اسی کی ملکیت ہے۔ خدا تعالیٰ نے بے شمار فرشتوں کو پیدا کیا ہے جو اس کے فرماں بردار اور اس کے احکام کو نافذ کرتے ہیں اور اس کائنات کے چپے چپے میں پھیلاتے ہیں۔ کائنات کا ہر حصہ اور نظام فرشتوں کے ایک خاص گروہ سے متعلق ہے جو اس حصے یا نظام کی نگرانی کرتے ہیں۔

انسان بھی خدا کے بندے اور اس کے پیدا کیے ہوئے ہیں اور وہ مجبور ہیں کہ خدا کے حکم کی اطاعت کریں اور پیغمبرؐ خدا کے ان بیانات اور قوانین کو لوگوں تک پہنچانے پر مامور ہیں جو خدا کی طرف سے انسانوں کے لیے بھیجے جاتے ہیں اور خدا تعالیٰ ان کا نفاذ چاہتا ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ایمان اور اطاعت کے لیے سزا اور جزا کا وعدہ فرمایا ہے اور کفر و گناہ کے لیے عذاب و سزا کا وعدہ کیا ہے۔ اور جیسا کہ فرماتا ہے: وہ اپنے وعدے کی ہرگز خلاف ورزی نہیں کرے گا۔ اور چونکہ خداوند تعالیٰ عادل ہے اور عدل کا

تقاضا یہ ہے کہ دوسری دنیا اور پیدائش میں نیکوکاروں اور بدکاروں کے دو گروہ ایک جیسی زندگی سے بہرہ مند نہیں ہوں گے۔ ان دونوں گروہوں کو آپس میں علیحدہ علیحدہ کر دیا گیا ہے یعنی اچھے لوگوں کو اچھی زندگی اور بُرے لوگوں کو بُری زندگی ملے گی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے عدل کے مطابق جو وعدہ فرمایا ہے، اس دنیا میں بسنے والے انسانوں کو کسی استثنا کے بغیر موت کے بعد دوبارہ زندہ کرے گا اور ان کے ایمان و اعتقادات اور اعمال کے بارے میں مکمل تفتیش کرے گا اور ان کے درمیان حقیقت اور حق پر مبنی فیصلے اور عدل کرے گا اور اس کے نتیجے میں ہر حق دار کو اس کا حق مل کر رہے گا اور ہر مظلوم کی فریاد سن کر ظالم سے اس کا حق لے گا اور ہر عمل کی پاداش ہر انسان کو ملے گی۔ انسانوں میں سے ایک جماعت دائمی بہشت میں اور دوسری جماعت دائمی دوزخ میں جائے گی۔

یہ قرآن کریم کا ظاہری بیان ہے اور البتہ بالکل ٹھیک اور درست ہے لیکن ایسی چیز ہے جو انسان کے اجتماعی فکر کی پیداوار ہے۔ یہ اسی لیے تالیف اور مرتب کی گئی ہے تا کہ اس کا فائدہ عمومی تر اور اس کے عمل کا دائرہ وسیع تر ہو جائے۔

جو لوگ حقائق کے دائرے میں قدم رکھتے ہیں اور قرآن مجید کی باطنی اور معنوی زبان سے ایک حد تک آشنا ہیں، ان بیانات سے ایسے مطالب اور حقائق کو سمجھتے ہیں جو عام فہم اور عام سطح فکر سے بہت ہی بالاتر ہیں۔ قرآن کریم بھی اپنے رواں اور سلیس بیانات کے اندر کبھی کبھی ایسے بیانات، مضامین و حقائق اور باطنی مقاصد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

قرآن کریم اپنے گونا گوں اشاروں کے ساتھ اجمالی طور پر بیان کرتا ہے کہ یہ کائنات اپنے تمام اجزا کے ساتھ کہ خود بھی انھی اجزا میں سے ایک ہے، اپنی ارتقائی حرکت میں (جو ہمیشہ کمال کی طرف جاری ہے) خدا کی طرف حرکت کر رہی ہے اور

ایک دن ایسا آئے گا کہ اپنی اس حرکت کو ختم کر کے خداوند تعالیٰ کی عظمت و شوکت کے سامنے اپنے وجود کو بالکل کھو دے گی (یعنی اس کا وجود مٹ جائے گا)۔

انسان بھی اسی کائنات اور جہان کا ایک حصہ ہے اور اس کا خاص ارتقا علم و شعور کے ذریعے سے ہے اور بڑی تیزی سے خدا کی طرف حرکت کر رہا ہے اور جس دن اس کی یہ حرکت آخری حد تک پہنچ جائے گی تو خدا کی وحدانیت کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا کیونکہ ہر کمال کی صفت اور قدرت صرف خدائے واحد کی مقدس ذات کے ہاتھ میں ہے اور اسی حقیقت کے ذریعے سے ہر چیز اپنی اصلی حالت میں اس کے سامنے ظاہر ہو جائے گی۔

یہ ابدی جہان کی پہلی منزل ہے۔ انسان کو چاہیے کہ اس دنیا میں اپنے نیک اعمال اور ایمان کے ذریعے خدا کے ساتھ رابطہ، تعلق، اُلفت، محبت اور ایسے ہی خدا کے برگزیدہ اور پیارے بندوں کے ساتھ تعلق رکھے تو اس کو بھی خداوند تعالیٰ اور اس کے برگزیدہ اور پیارے بندوں کے پاس عالمِ بالا میں ایک خوش نصیب، سعادت مندانہ زندگی نصیب ہوگی جو نا قابلِ تعریف ہے اور اگر اس فانی دنیا کی لذتوں کے ساتھ اپنی زندگی میں محبت کرے گا تو اس عالمِ بالا سے اپنا رشتہ اور تعلق توڑ کر خداوند تعالیٰ اور اس کے برگزیدہ بندوں سے رشتۂ محبت نہیں رکھے گا بلکہ ایک دردناک عذاب اور ایک ابدی بدبختی میں گرفتار ہو جائے گا۔

یہ صحیح ہے کہ اس زندگی میں انسان کے نیک و بد اعمال وقتی اور عارضی ہیں اور جلد ہی ختم ہو جانے والے ہیں لیکن یہ نیک و بد اعمال انسان کے باطن میں قائم رہتے ہیں اور جہاں کہیں وہ جائے اس کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور یہی اعمال انسان کی آئندہ اچھی یا بری، شیریں یا تلخ زندگی کی بنیاد اور اس کا سرمایہ ہیں۔

گزشتہ مطالب کے لیے مندرجہ ذیل آیات سے استفادہ کیا جا سکتا ہے، اللہ

فرماتا ہے:

اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجْعٰی (سورۂ علق: ۸)

"یعنی واپسی تیرے رب کی طرف ہے"۔

اَلَآ اِلَی اللّٰہِ تَصِیْرُ الْاُمُوْرُ (سورۂ شوریٰ: ۵۳)

"خبردار تمام اُمور خدا کی طرف واپس لوٹتے ہیں"۔

وَالْاَمْرُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ (سورۂ انفطار: ۱۹)

"آج کے دن تمام اُمور خدا کے لیے ہیں"۔

یٰاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ○ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً ○ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ (سورۂ فجر: ۲۷-۲۹)

"اے نفس جس نے آرام اور سکون حاصل کیا ہے (خدا کی یاد سے) اپنے خدا کی طرف واپس لوٹ جا، جب کہ تو راضی ہے اور خدا بھی تجھ سے راضی ہوگیا ہے۔ پس ہمارے بندوں کی صف میں داخل ہوجا اور میرے بہشت میں داخل ہوجا"۔

قرآن مجید میں بیان ہوا ہے کہ قیامت کے دن بعض لوگوں سے اللہ تعالیٰ کا خطاب یوں ہوگا، جیسے فرماتا ہے:

لَقَدْ کُنْتَ فِیْ غَفْلَۃٍ مِّنْ ھٰذَا فَکَشَفْنَا عَنْکَ غِطَآءَکَ فَبَصَرُکَ الْیَوْمَ حَدِیْدٌ ○ (سورۂ ق: ۲۲)

"جن چیزوں کو آج تو دیکھ رہا ہے ان سے تو غافل رہا ہے۔ اب تیری آنکھوں سے ہم نے پردے اُٹھا دیے ہیں اور اس کے نتیجے میں آج تیری آنکھیں تیز بین ہوگئی ہیں"۔

قرآن کریم تاویل کے بارے میں جن حقائق سے سرچشمہ حاصل کرتا ہے ان

کے بارے میں خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ○ (سورۂ اعراف:۵۳)

''کیا یہ لوگ قرآن مجید کو نہیں مانتے کہ تاویل کے علاوہ کسی اور چیز کے منتظر ہیں؟ جس دن اس کی تاویل واضح ہو جائے گی اس وقت جو لوگ اس (قرآن) کو بھولے ہوئے ہیں وہ کہیں گے کہ ہمارے خدا کے پیغمبر حق پر تھے۔ پس کیا ہمارے لیے بھی کوئی شفاعت کرنے والا موجود ہے، جو ہماری شفاعت کرے؟ یا یہ کہ ہم دنیا میں واپس لوٹا دیے جائیں اور ان اعمال کے برعکس انجام دیں جو ہم پہلے انجام دیتے رہے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے نفس (ذات) کو نقصان پہنچایا ہے، اور جو تہمت لگاتے تھے اس کو بھول گئے ہیں''۔

اور پھر فرماتا ہے:

يَوْمَئِذٍ يُّوَفِّيْهِمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ ○ (سورۂ نور:۲۵)

''اس دن خداوند تعالیٰ ان کی حقیقی جزا اور پاداش دے گا اور وہ جانتے ہیں کہ یہ ایک آشکارا اور بے پردہ حقیقت ہے اور بس''۔

پھر فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ (سورۃ انشقاق:۶)

"اے انسان جو کہ بڑی مشکل اور مصیبت کے ساتھ اپنے خدا کی طرف جانے کی کوشش کرتا ہے، پس تو اس سے ضرور ملاقات کرے گا"۔

پھر فرماتا ہے:

مَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ اللّٰهِ فَإِنَّ أَجَلَ اللّٰهِ لَآتٍ (سورۃ عنکبوت:۵)

"جو شخص خدا سے ملاقات کا شائق اور اُمیدوار ہو (جان لے) کہ جو وقت خداتعالیٰ نے ملاقات کے لیے مقرر کر رکھا ہے وہ وقت ضرور آئے گا"۔

پھر فرماتا ہے:

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا (سورۃ کہف:۱۱۰)

"پس جو شخص اپنے خدا سے ملاقات کا اُمیدوار ہو اسے چاہیے کہ نیک اعمال انجام دے اور خدا کی عبادت میں کسی کو اس کا شریک نہ بنائے"۔

اور پھر فرماتا ہے:

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ○ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ○ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ○ وَادْخُلِي جَنَّتِي (سورۃ فجر:۲۷ تا ۳۰)

"اے نفس جس نے آرام اور سکون حاصل کیا ہے (خدا کی یاد سے) اپنے خدا کی طرف واپس لوٹ جا، جب کہ تو راضی ہے اور خدا بھی تجھ سے راضی ہوگیا ہے، پس ہمارے بندوں کی صف میں داخل ہوجا اور میری بہشت میں داخل ہوجا"۔

پھر فرماتا ہے:

فَإِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ○ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنسَانُ مَا سَعٰى ○ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِمَن يَرٰى ○ فَأَمَّا مَن طَغٰى ○ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ○ فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوٰى ○ وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ○ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوٰى (سورۂ نازعات: ۳۴ تا ۴۱)

"جس وقت سب سے بڑا حادثہ یا واقعہ (روزِ قیامت) رونما ہوگا، جس دن انسان اپنی تمام کوششوں کو یاد کرے گا اور جس دن وہ آگ جو عذاب کے لیے جلائی گئی ہے، سامنے آئے گی (تو لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہوجائیں گے) لیکن جس شخص نے سرکشی اور نافرمانی کی ہے اور اس نے دنیا کو اپنے لیے انتخاب کیا ہے، مذکورہ آگ اس کا ٹھکانا ہوگی۔ اور جو شخص خدا کی نافرمانی سے ڈرا ہے اور اپنے نفس (اپنے آپ) کو دنیاوی خواہشات (ناپسندیدہ اور بُرے اعمال) سے بچائے رکھا ہے، اس کا ٹھکانہ بہشت میں ہوگا"۔

اور پھر اعمال کی سزا کے بارے میں فرماتا ہے:

يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ إِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا

كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○ (سورۂ تحریم:۷)

''اے لوگو جو کافر ہو گئے ہو، عذر اور بہانے نہ لاؤ، آج (روز قیامت) جو سزا تمھیں دی جائے گی اس کی وجہ وہی تمھارے اعمال ہیں جن کو تم نے انجام دیا ہے''۔

پیدائش کا جاری رہنا

یہ جہان جس کو ہم دیکھ رہے ہیں، بیکراں اور بے اندازہ عمر نہیں رکھتا (غیر فانی نہیں ہے) اور ایک دن ایسا آئے گا کہ یہ جہان اور اہلِ جہان ختم ہو جائیں گے، جیسا کہ قرآن مجید بھی اس مطلب کی تصدیق کرتا ہے، خداوند عالم فرماتا ہے:

مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى (سورۂ احقاف:۳)

''ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سوائے حق اور معین وقت کے لیے پیدا نہیں کیا ہے''۔

اور وہ محدود و معین وقت جس کا نام لیا گیا ہے، کیا اس موجودہ جہان اور انسان کی پیدائش سے پہلے کوئی اور دنیا یا انسان پیدا کیا گیا تھا؟ کیا اس دنیا کا کھیل ختم ہو جائے گا؟ اور اس کے بعد جس کی قرآن بھی خبر دیتا ہے کوئی اور دنیا پیدا ہوگی اور انسان پیدا کیا جائے گا؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا براہِ راست جواب قرآن کریم میں نہیں مل سکتا، صرف اشارے موجود ہیں، لیکن وہ احادیث و روایات جو آئمہ اہلِ بیتؑ سے نقل ہوئی ہیں، ان سوالات کا مثبت جواب دیتی ہیں۔ (بحار الانوار، جلد ۱۴، ص ۷۹)

امام شناسی

- امام کے معنی
- امامت اور اسلامی حکومت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی
- گزشتہ کلام کی تائید وتصدیق میں
- معارف الٰہی کے بیان میں امامت کا مفہوم
- امام اور نبی کے درمیان فرق
- باطنی اعمال میں امامت کا مفہوم
- آئمہ اور اسلامی رہبر
- بارہ اماموںؑ کی زندگی پر اجمالی نظر
- حضرت امام مہدیؑ کے ظہور کے بارے میں بحث (عام عقیدے کے مطابق)
- حضرت امام مہدیؑ کے ظہور کے بارے میں بحث (خاص عقیدے کے مطابق)

امام کے معنی

امام، پیشوا یا رہبر اس شخص کو کہتے ہیں جو ایک جماعت یا گروہ کی رہنمائی اور راہبری کا بیڑا اپنے کندھوں پر اُٹھائے اور عوام کو ایک اجتماعی طریقے، سیاسی نظریے یا علمی و دینی مسلک پر چلانے کے لیے رہنمائی کرے۔ البتہ اپنی آئیڈیالوجی کے ساتھ تعلق رکھنے کی وجہ سے ہر حالت میں اسی نظریے یا آئیڈیالوجی کے تابع ہوگا۔

دین مقدس اسلام (جیسا کہ گزشتہ ابواب سے واضح ہو گیا ہے) ہر لحاظ سے تمام انسانوں کی زندگی کو مدنظر رکھتے ہوئے احکام صادر کرتا ہے۔

لہذا اسلام ہر چیز کا معنوی زندگی کے لحاظ سے مطالعہ کرتے ہوئے راہنمائی کرتا ہے اور اسی طرح ظاہری زندگی میں بھی انفرادی زندگی اور اس کے انتظام کے طور پر مداخلت کرتا ہے جیسا کہ اجتماعی زندگی اور حکومت کے لحاظ سے مداخلت کرتا ہے۔

ان پہلوؤں کی بناء پر جن کو یہاں پر گنا گیا ہے، اسلام میں امامت اور دینی پیشوائی تین طریقوں پر قابل توجہ ہو سکتی ہے:

① اسلامی حکومت کے لحاظ سے

② اسلامی معارف و احکام کو بیان کرنے پر، اور

③ معنوی زندگی کی قیادت اور رہنمائی کے لیے

شیعہ مذہب کا اعتقاد ہے، جیسا کہ اسلامی معاشرہ تین طریقوں کے لیے نیازمند اور محتاج ہے، جو شخص مذکورہ پہلوؤں کو کنٹرول کرنے کا ذمہ دار یا عہدیدار ہے اور ایک گروہ یا جماعت کی امامت اور پیشوائی کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہے، وہ خدا اور رسولؐ کی طرف سے متعین ہونا چاہیے اور البتہ اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے مقرر اور معین کیا گیا ہو تو وہ بھی خدا ہی کے حکم سے ہے۔

امامت اور اسلامی حکومت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی جانشینی

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ انسان اپنی خداداد فطرت اور سرشت کے ذریعے قوت ادراک یا فہم و شعور رکھتا ہے کہ ایک معاشرہ مثلاً ایک ملک، شہر، گاؤں، قبیلہ اور حتیٰ کہ ایک گھرانہ یا گھر جو چند افراد پر ہی مشتمل کیوں نہ ہو، ایک سرپرست یا حکمران کے بغیر اپنی زندگی اور بقا کو قائم اور جاری نہیں رکھ سکتا، جو تمام معاشرے کو چلاتا ہے اور کنٹرول کرتا ہے اور تمام کام اسی کے ارادے یا ذریعے سے انجام پاتے ہیں اور وہی شخص معاشرے کے تمام افراد کو ان کی اجتماعی ذمہ داریوں کے لیے اُبھارتا ہے، اور اگر اس معاشرے میں ایسا شخص موجود نہ ہو تو بہت ہی تھوڑے عرصے میں معاشرے کے اہم اجزا درہم برہم ہو کر رہ جائیں گے اور اس کی عمومی حالت ہرج و مرج سے دوچار ہو جائے گی۔

اسی وجہ سے جو شخص معاشرے کا فرمانروا یا حکمران ہے (خواہ چھوٹا معاشرہ ہو یا بڑا) اور اپنی طرف یا معاشرے کی بقا کی طرف توجہ کرتا ہے۔ اگر چاہے کہ وقتی طور پر یا ہمیشہ کے لیے اپنے کام سے بے توجہ رہے تو اپنا ایک جانشین یا نائب مقرر کرتا ہے اور ہرگز اپنی حکومت یا فرمانروائی کو ویسے ہی بے سرپرست کے نہیں چھوڑ دیتا اور اس معاشرے کے زوال یا بقا سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔

ایک خاندان کا سرپرست جو چند دن یا چند مہینے کے سفر پر جانا چاہتا ہے اور اپنے گھر اور گھر والوں کو الوداع کہتا ہے تو اہل خاندان میں سے ایک شخص (یا کسی دوسرے) کو اپنا جانشین مقرر کرتا ہے اور گھر کے تمام کاروبار اسی کے سپرد کر دیتا ہے۔ ایک دفتر کا سرپرست، انچارج، ڈائرکٹر یا ایک دکان کا مالک جہاں پر چند کاریگر، مزدور یا کارکن کام کرتے ہیں، حتیٰ کہ اپنی چند گھنٹے کی غیر حاضری کے لیے بھی ان میں سے کسی ایک کو اپنی جگہ پر معین کر دیتا ہے تاکہ بوقت ضرورت دوسرے لوگ اس کی طرف

رجوع کریں اور یہی قانون ہر جگہ موجود ہے۔

اسلام ایسا دین ہے جو کتاب وسنت کے مطابق فطرت پر قائم ہے، اور ایک ایسا اجتماعی قانون ہے کہ ہر آشنا اور غیر آشنا اس حقیقت کو اس میں مشاہدہ کرتا ہے اور خدائے تعالیٰ اور پیغمبر اکرمؐ نے اس دین کی طرف جو توجہ مبذول فرمائی ہے اس سے ہرگز انکار نہیں کیا جاسکتا یا اس کا کسی دوسری چیز کے ساتھ قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

وہ اجتماعی مسائل جو اسلام سے متعلق ہوتے تھے اور جن میں اسلام کی مداخلت ضروری ہوتی تھی، پیغمبر اکرمؐ ان کو ویسے ہی نہیں چھوڑ دیتے تھے اور اسی طرح ہر وہ شہر یا گاؤں جو مسلمانوں کے قبضے میں آتا تھا، اکثر اوقات وہاں اپنا والی یا حاکم مقرر کردیتے تھے اور مسلمانوں کے تمام امور کو اس کے ہاتھ میں دے دیتے تھے، حتیٰ کہ وہ فوجیں جو جہاد کے لیے بھیجی جاتی تھیں ان میں کبھی کبھی ایک سے زیادہ جرنیلوں کو یکے بعد دیگرے مقرر کردیا کرتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ جنگ موتہ میں ایک ہی فوج میں چار جرنیلوں کو مقرر کیا گیا، تاکہ اگر پہلا جرنیل شہید ہوجائے تو دوسرا اس کی جگہ لے، اور اگر دوسرا شہید ہوجائے تو تیسرا کمان سنبھال لے اور اگر تیسرا بھی شہادت پاجائے تو چوتھا اس کی جگہ فوجی کمان اور امور کو اپنے ہاتھ میں لے۔ اور سب فوجیں اس کی اطاعت کریں۔

اسی طرح آپ ﷺ جانشینی کے مسئلے پر بھی بہت زیادہ توجہ دیا کرتے تھے اور جہاں کہیں بھی ضرورت محسوس ہوتی تھی اپنا جانشین مقرر کردیا کرتے تھے اور نائب یا حاکم معین کرنے میں کبھی سستی نہیں کیا کرتے تھے۔ لہٰذا جب بھی مدینہ سے کہیں دوسری جگہ سفر پر جاتے تو اپنی جگہ پر ایک والی یا حکمران مقرر کرتے تھے۔ حتیٰ کہ جب آپ مکہ سے مدینہ ہجرت کرنا چاہتے تھے لیکن ابھی کوچ نہیں فرمایا تھا تو اس وقت بھی مکہ میں اپنے ذاتی کاموں کو انجام دینے یا لوگوں کی امانتیں واپس لوٹانے کے لیے علیؑ کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا اور اسی طرح اپنی وفات کے بعد ذاتی کاروبار یا لین دین

کے لیے بھی علیؑ کو اپنا نائب یا جانشین بنایا تھا۔

شیعہ کہتے ہیں کہ اسی دلیل کی بناء پر یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ پیغمبر اکرم ﷺ رحلت فرمائیں اور کسی کو اپنا جانشین قرار نہ دیں اور مسلمانوں کے امور کی سرپرستی اور اسلامی معاشرے کے کاروبار کو چلانے کے لیے کچھ نہ کریں۔

یہ مسئلہ کہ ایک معاشرے کی پیدائش ایک مشترکہ رسوم وقوانین اور اصول پر مشتمل ہوتی ہے جن کو اس معاشرے کے اکثر افراد اور اجزا عملی طور پر قبول کر لیتے ہیں اور اس معاشرے کی بقا اور اس کا دوام ایک عادلانہ حکومت پر مبنی ہے جو ان قوانین و اصول کو عملی طور پر اس معاشرے میں نافذ کرتی ہے۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جس کی اہمیت میں انسانی فطرت کو کوئی شک وشبہ نہیں ہے، یا یہ بھی نہیں ہے کہ کسی عقل مند انسان کے لیے پوشیدہ ہو یا اس کو بھلایا جاسکے۔ اسی طرح اسلامی شریعت کی وسعت اور گہرائی میں بھی کوئی شک نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اس اہمیت اور قدر وقیمت میں جو پیغمبر اکرم ﷺ اس شریعت کے لیے قائل تھے اور اس راہ میں فداکاری اور جدوجہد فرمایا کرتے تھے، کسی شک وتردید کی گنجائش ہے اور نہ ہی پیغمبر اکرم ﷺ کے فکر وکمال، عقل اور حسن تدبیر (وحی ونبوت کی تائید وتصدیق کے علاوہ) کوئی جھگڑا ہوسکتا ہے۔

اخبار متواتر کے مطابق جو عام وخاص سے نقل ہوکر ہم تک پہنچی ہیں اور کتب احادیث میں موجود ہیں۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے ان مشکلات اور فتنوں کے بارے میں جو آپ کی رحلت کے بعد اسلامی معاشرے میں رونما ہوئے اور وہ بدعنوانیاں جو اسلام میں رسوخ کر گئیں مثلاً آل مروان کی حکومت وغیرہ جنھوں نے آئینِ مقدس کو ناپاکیوں، بدعنوانیوں اور آلودگیوں پر فدا کردیا تھا، تفصیل سے بیان کیا ہے۔ پس یہ کیسے ممکن ہے کہ جب آپ سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال بعد رونما ہونے والے حوادث،

واقعات اور مشکلات کے بارے میں غفلت نہیں کرتے تھے اور ان کو واضح طور پر بیان فرماتے تھے تو وہ اہم حالات و واقعات جو آپؐ کی رحلت کے فوراً بعد رونما ہوئے ان سے غفلت یا اغماض کرتے اور ایسے سادہ مگر اہم کام کو ہیچ سمجھیں اور جب کہ آپؐ بہت ہی عام اور قدرتی اُمور یعنی کھانے، پینے، سونے اور ایسے ہی دوسرے سینکڑوں کاموں کے بارے میں احکام تو صادر فرمائیں لیکن ایسے اہم مسئلہ کے بارے میں مکمل سکوت اختیار کرتے ہوئے کسی کو اپنا جانشین مقرر نہ کریں؟

اگر بفرض محال اسلامی شریعت میں اسلامی معاشرے کے لیے کسی حکمران کا تعین خود عوام پر چھوڑ دیا گیا تھا تب بھی ضروری تھا کہ پیغمبر اکرم ﷺ اس خاص مسئلے میں بیانات اور کافی احکام صادر فرماتے تاکہ اس مسئلے کے متعلق جو بنیادی طور پر اسلامی معاشرے کی رُشد و بقا سے وابستہ ہے اور دین کے تمام احکام و شعائر اس پر ہی منحصر ہیں، عوام ہوشیار اور بیدار ہو جاتے۔

حالانکہ پیغمبر اکرم ﷺ کے ایسے بیانات اور دینی احکام کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ہے اور اگر ہوتی تو جن لوگوں نے پیغمبر خدا ﷺ کی رحلت کے بعد حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی تھی وہ کبھی اس کی مخالفت نہ کرتے، جب کہ خلیفۂ اوّل نے خلافت کو اپنی وصیت کے ساتھ خلیفۂ دوم کے سپرد کیا اور اسی طرح خلیفہ چہارم نے خلافت اپنے بیٹے کو دی تھی اور خلیفۂ دوم نے چھے رکنی کمیٹی کے ذریعے کہ خود بھی اس کمیٹی کے ممبر تھے اور اس کمیٹی کا منشور بھی خود انھوں نے ہی مرتب کیا تھا، خلافت کو خلیفہ سوم کے ہاتھ منتقل کر دیا تھا۔ معاویہ نے امام حسن علیہ السلام کو زبردستی صلح پر آمادہ کر لیا اور اس طرح خلافت پر قبضہ کر لیا۔ پھر اس کے بعد خلافت موروثی سلطنت میں تبدیل ہو گئی اور آہستہ آہستہ دینی شعائر و احکام مثلاً جہاد، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، حدود (شرعی سزائیں) وغیرہ یکے بعد دیگرے اسلامی معاشرے سے

مٹنے گئے اور اسلام کے مبلغوں کی تمام کوششیں نقش بر آب ہو گئیں۔[1]

انسان کے قدرتی ادراک، دانش وروں اور عقل مندوں کی ہمیشہ قائم رہنے والی سیرتوں اور دین اسلام کے بنیادی نظریے میں بحث و تحقیق جو خود فطرت کے مقاصد کو دوبارہ زندہ کرتے ہیں، اسی طرح پیغمبر اکرم ﷺ کا معاشرتی طریقہ، ان افسوس ناک حوادث کا مطالعہ جو آنحضرت ﷺ کی رحلت کے بعد رونما ہوئے اور وہ مشکلات جو مسلمانوں کے سامنے آئیں، پہلی صدی ہجری میں اسلامی حکومتوں کی سہل انگاری، کوتاہی اور سستی کی وجہ سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ سے بہت زیادہ احادیث متواتر مثلاً آیۂ ولایت اور حدیث غدیر، حدیث سفینہ، حدیث ثقلین، حدیث حق، حدیث منزلت، حدیث دعوت ذوالعشیرہ و اقربین وغیرہ۔[2]

---

[1] امامت اور پیغمبر اکرم ﷺ کی جانشینی اور اسلامی حکومت کے بارے میں مطالب کی تفصیل کے لیے مندرجہ ذیل اسناد کی طرف رجوع کریں۔ (تاریخ یعقوبی، جلد۲، ص ۲۶ تا ۶۱۔ سیرت ابن ہشام، جلد۴، ص ۲۲۳ تا ۲۷۱۔ تاریخ ابی الفداء، جلد اول، ص ۱۲۶۔ غایت المرام، ص ۶۶۴۔ مسند احمد وغیرہ۔

[2] آیہ ولایت: حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی خلافت کے اثبات میں قرآن مجید کی آیات سے استدلال ہوا ہے اور ان میں سے ایک یہ آیہ کریمہ ہے: اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ رٰكِعُوْنَ ○ (سورۂ مائدہ:۵۵) ''تمہارے ولی امر اور صاحب اختیار صرف خدا، رسولؐ اور وہ مومن لوگ ہیں جو نماز پڑھتے ہیں اور رکوع کی حالت میں صدقہ اور زکوٰۃ دیتے ہیں''۔
شیعہ اور سنی مفسرین کا اتفاق ہے کہ مندرجہ بالا آیت کریمہ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے اور اس ضمن میں خاص و عام ذرائع سے بہت زیادہ احادیث نقل ہوئی ہیں۔ حضرت ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں:
ایک دن ظہر کی نماز، میں نے پیغمبر اکرم ﷺ کے ساتھ ادا کی۔ ایک سائل نے لوگوں سے مدد کی درخواست کی، لیکن کسی نے بھی اسے کوئی چیز نہیں دی۔ سائل نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور کہا: اے خدا! گواہ رہنا کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی مسجد میں سے کسی نے مجھے کوئی ←

یہ سب احادیث اس مطلب کا ثبوت فراہم کرتی ہیں لیکن بعض حدیثوں کی تاویل کر کے ان کے اصلی معانی کو نگاہوں سے پوشیدہ رکھا گیا ہے۔

گزشتہ کلام کی تائید و تصدیق میں

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیماری و علالت کے آخری دنوں میں کچھ اصحاب آپ کے پاس موجود تھے۔

چیز نہیں دی۔ حضرت علیؑ اس وقت رکوع کی حالت میں تھے۔ آپؑ نے انگلی سے سائل کو اشارہ کیا۔ سائل نے آپؑ کے ہاتھ سے انگوٹھی اُتار لی اور وہ چلا گیا۔
پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس واقعے کو دیکھ رہے تھے، انھوں نے اپنے سر مبارک آسمان کی طرف بلند کیا اور عرض کیا: "اے خدا! میرے بھائی موسیٰؑ نے تجھ سے درخواست کی تھی کہ (اے خدا) میرے سینے کو کھول دے اور میرے کاموں کو آسان کر دے اور مجھے ناطق زبان عطا فرما، تاکہ لوگ میری باتوں کو سنیں اور سمجھیں اور میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر اور مددگار بنا دے۔ پس اس وقت وحی نازل ہوئی کہ ہم تیری طاقت اور تیرے ہاتھوں کو تیرے بھائی ہارونؑ کے ذریعے مضبوط کریں گے اور تجھے نفوذ اور تسلط عطا کریں گے۔ اے خدا! میں بھی تیرا پیغمبر ہوں، میرے سینے کو کھول دے، اور میرے کاموں کو آسان کر دے، اور علیؑ کو میرا وزیر اور مددگار بنا دے!
حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ ابھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا ختم نہیں ہوئی تھی کہ یہ آیۂ کریمہ نازل ہوئی۔ (ذخائر العقبیٰ تالیف طبری، طبع قاہرہ، ۱۳۵۶ھ، ص ۱۶)۔ یہی حدیث تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ درالمنثور، جلد۲، ص ۲۹۳ میں بھی نقل ہوئی ہے)
بحرانی نے کتاب غایۃ المرام، ص ۱۰۳ میں ۲۴ حدیثیں عام ذرائع سے اور ۱۹ حدیثیں خاص ذرائع سے اس آیۂ کریمہ کی شانِ نزول میں لکھی ہیں۔
اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ دِیْنِکُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (سورۂ مائدہ: ۳)
"آج کے دن کفار، اسلامی معاشرے اور حکومت کے ختم ہونے سے مایوس اور نااُمید ہو گئے ہیں۔ پس اب ان سے مت ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو، ہم نے آج تمھارے دین کو مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمتیں مکمل کر دی ہیں اور تمھارے لیے دین اسلام کو انتخاب کیا ہے۔ ←

اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"میرے لیے کاغذ، قلم اور دوات لاؤ تا کہ تمھارے لیے ایک چیز لکھتا جاؤں تا کہ میرے بعد اس کی پیروی کرنے سے کبھی گم راہ نہیں ہوگے"۔

اس آیہ کریمہ کے ظاہری معنی یوں ہیں کہ اس آیہ کریمہ کے نزول سے پہلے کافروں کو یہ اُمید تھی کہ ایک دن ایسا آئے گا جب یہ اسلامی حکومت ختم ہو جائے گی لیکن اللہ تعالیٰ نے ایک کام کو انجام دینے کے ذریعے ان کافروں کو ہمیشہ کے لیے اسلام کی تباہی سے مایوس کر دیا ہے اور وہی کام دین کی بنیاد اور تکمیل و استحکام کا باعث ہوا ہے۔ یہ کام یقینی طور پر سطحی اور عام مسائل میں سے نہیں تھا اور نہ ہی اس کو جعلی یا بناوٹی کہا جا سکتا ہے، بلکہ بہت ہی قابلِ توجہ اور اہم موضوع تھا جس سے اسلام کی بقا اور زندگی مربوط ہے۔

ظاہری طور پر یہ آیہ کریمہ اس سورہ کے آخر میں نازل ہونے والی آیہ کریمہ سے بے ربط نہیں ہے (سورۂ مائدہ: ۶۷) "اے نبی! جس بات کا تمھیں حکم دیا گیا ہے اس کو لوگوں کے سامنے پیش کر دے اور ان کو سنا دے۔ اور اگر تم نے نہ سنایا تو تم نے خدا کی رسالت کو انجام ہی نہیں دیا اور خدائے تعالیٰ تجھے ہر خطرے سے اپنی پناہ اور امان میں محفوظ رکھے گا۔

یہ آیہ کریمہ اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بہت ہی قابلِ توجہ اور اہم موضوع کے بارے میں اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ اگر وہ کام انجام پذیر نہ ہو تو گویا اسلام کی بنیاد اور رسالت خطرے میں پڑ جائے گی، لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس موضوع کو بیان کرنے میں لیت و لعل سے کام لیتے تھے اور اس اہم کام کے لیے مناسب موقع کے منتظر تھے کیونکہ عوام کی طرف سے ممانعت، رکاوٹ اور خطرے سے ڈرتے تھے۔ یہاں تک کہ خدائے تعالیٰ کی طرف سے فوری اور تاکید کے ساتھ حکم ملا کہ اس کام کو انجام دینے میں تامل نہ کریں اور فوراً انجام دیں اور نہ ہی کسی سے ڈریں۔ یہ موضوع یقینی طور پر دوسرے احکام کی طرح نہیں تھا کیونکہ ایک یا چند قوانین کی تبلیغ کی یہ اہمیت نہیں ہے کہ ان کی تبلیغ نہ کرنے سے اسلام کی بنیاد اُکھڑ جائے گی اور نہ ہی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قوانین کے بیان کرنے اور تبلیغ سے خوف زدہ تھے۔

یہ قرائن اور شواہد، اخبار و احادیث کی تصدیق کرتے ہیں کہ مندرجہ بالا آیات غدیر خم کے مقام پر حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی جانشینی کے بارے میں نازل ہوئی ہیں اور بہت زیادہ شیعہ اور سنی مفسرین نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔

←

بعض حاضرین نے کہا: پیغمبر اکرم ﷺ بیماری اور بخار کی حالت میں (نعوذ باللہ) ہذیان کہہ رہے ہیں اور ہمارے لیے خدا کی کتاب کافی ہے"۔ اس وقت حاضرین میں کچھ شور سا اُٹھا۔

پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: "اُٹھو اور میری آنکھوں سے دُور ہو جاؤ"

ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں: پیغمبر اکرم ﷺ نے غدیر خم کے مقام پر لوگوں کو حضرت علیؑ کی طرف دعوت دی۔ آپؐ نے حضرت علیؑ کے بازو کو پکڑ کر اس قدر بلند کیا کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی بغل کی سفیدی دکھائی دینے لگی۔ اس کے بعد آیۂ کریمہ نازل ہوئی: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (مائدہ:۳)

اس کے بعد پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: "اللہ اکبر! دین کی تکمیل، نعمتوں کی تکمیل، خدا کی رضامندی اور خوشنودی اور میرے بعد حضرت علیؑ کی ولایت"۔ پھر فرمایا: "جس کا میں مولا اور صاحبِ اختیار ہوں، علیؑ بھی اس کا مولا اور صاحبِ اختیار ہے۔ اے خدا! علیؑ کے دوست کو دوست جان اور اس کے دشمن کو دشمن سمجھ، جو شخص اس کی مدد کرے تو اس کی مدد کر اور جو شخص اس کا ساتھ چھوڑ دے تو بھی اس کا ساتھ چھوڑ دے"۔

بحرانی نے کتاب غایۃ المرام کے صفحہ ۳۳۶ پر چھ احادیث عام ذرائع سے اور ۱۵ احادیث خاص ذرائع سے اس آیۂ کریمہ کی شانِ نزول میں نقل کی ہیں۔

مختصر یہ کہ اسلام کے دشمن، اسلام کی نابودی اور تباہی کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے تھے، اگرچہ وہ ہر لحاظ سے مایوس اور نا اُمید ہو چکے تھے مگر ایک طرف سے اُمیدوار تھے اور خیال کرتے تھے کہ جب اسلام کا محافظ اور نگہبان اس دنیا سے چلا جائے گا اور اسلام کسی قیم اور سرپرست کے بغیر رہ جائے گا تو اس کی نابودی اور تباہی یقینی ہو جائے گی لیکن غدیر خم میں ان کی تمام اُمیدوں پر پانی پھر گیا اور پیغمبر اکرم ﷺ نے حضرت علیؑ کو اسلام کے سرپرست اور محافظ کے طور پر لوگوں کے سامنے پیش کیا اور علیؑ کے بعد بھی یہ بھاری کام اور فرض پیغمبرؐ کے خاندان جو علیؑ کی اولاد سے ہوں گے ان کے ذمے لگایا۔ (زیادہ وضاحت کے لیے تفسیر المیزان، تالیف علامہ محمد حسین طباطبائی، جلد۵، صفحہ ۱۷۷، ۲۱۳ اور جلد ۶، صفحہ ۵۰ اور ۶۳ کی طرف رجوع کریں)

←

کیونکہ پیغمبر اکرم ﷺ کے سامنے شور و غل نہیں کرنا چاہیے۔(البدایہ والنہایہ، جلد۵، ص ۲۲۷۔ شرح ابن ابی الحدید، جلد اوّل، ص ۱۳۳۔ الکامل فی التاریخ، جلد۲، ص ۲۱۷، تاریخ الرسل والملوک، تالیف طبری، جلد۲، ص ۴۳۶)[2]

حدیث غدیر: پیغمبر اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع سے واپسی پر غدیر خم کے مقام پر پڑاؤ کیا اور مسلمانوں کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا۔ پھر حضرت علیؑ کو ولایت، پیشوائی اور امامت پر فائز کیا۔ براء کہتے ہیں کہ وہ حجۃ الوداع میں رسولؐ خدا کی خدمت میں تھے۔ جب غدیر خم کے مقام پر پہنچے، تو آپؐ کے حکم سے ایک جگہ کو صاف کیا گیا۔ پھر آپؐ نے حضرت علیؑ کا ہاتھ پکڑا اور اپنی دائیں طرف کھڑا کیا اور فرمایا: "کیا میں تمہارا صاحب و اختیار یا مولا نہیں ہوں؟" لوگوں نے جواب دیا: "کیوں نہیں، ہمارا اختیار آپ کے ہاتھ میں ہے"۔ آپؐ نے فرمایا: "جس شخص کا میں مولا اور صاحب اختیار ہوں، علیؑ بھی اس کے مولا اور صاحب اختیار ہوں گے۔ خدایا، علیؑ کے دوست کے ساتھ دوستی اور اس کے دشمن کے ساتھ دشمنی کر"۔

اس کے بعد عمر بن خطاب نے حضرت علیؑ سے کہا: "یہ عہدہ آپؐ کے لیے مبارک ہو کہ آپ میرے اور تمام مسلمانوں کے مولا بن گئے ہیں"۔ (البدایہ والنہایہ، جلد۵، ص ۲۰۸ اور جلد۷، ص ۳۴۶۔ ذخائر العقبیٰ، تالیف طبری، طبع قاہرہ، ص ۶۷، ۱۳۵۶ھ۔ فصول المہمہ، تالیف ابن صباغ، جلد۲، ص ۲۳)

خصائص، تالیف نسائی طبع نجف ۱۳۶۹ھ، ص ۳۱۔ بحرانی نے کتاب غایۃ المرام، ص ۷۹ پر اس حدیث کی مانند ۸۹ حدیثیں عام ذرائع سے اور ۴۳ حدیثیں خاص ذرائع سے نقل کی ہیں۔

حدیث سفینہ: ابن عباس کہتے ہیں: پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: "میرے اہل بیتؑ کی مثال کشتی نوحؑ کی طرح ہے کہ جو شخص اس میں سوار ہو گیا وہ غرق ہونے سے بچ گیا اور جس نے خلاف ورزی کی وہ غرق ہو گیا"۔ (ذخائر العقبیٰ، ص ۲۰۔ صواعق محرقہ، تالیف ابن حجر کی طبع قاہرہ، ص ۱۵۰ و ۸۴۔ تاریخ الخلفاء، تالیف جلال الدین سیوطی، ص ۳۰۷۔ نور الابصار، تالیف شبلنجی، طبع مصر، ص ۱۱۴۔ بحرانی نے غایۃ المرام، ص ۲۳۷ پر مذکورہ حدیث کو گیارہ عام طریقوں اور سات خاص ذرائع سے نقل کیا ہے)

حدیث ثقلین: زید بن ارقم نے پیغمبر اکرم ﷺ سے نقل کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "گویا خدا نے مجھے اپنی طرف سے واپس بلا لیا ہے اور میں نے بھی قبول کر لیا ہے لیکن دو بڑی (گرانقدر) چیزیں تمہارے درمیان چھوڑ کر جا رہا ہوں، یعنی خدا کی کتاب (قرآن مجید) اور اپنے ←

گزشتہ باب کے مطالب پر توجہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فیصلے کے عملی ہونے میں رکاوٹ اور ممانعت کی تھی یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے اس واقعے کے بعد دوسرے دن ہی انتخابی خلافت سے فائدہ اٹھایا اور خاص کر خلیفہ کا انتخاب حضرت علیؑ اور ان کے خاندان کی اطلاع کے بغیر ہی انجام دیا تھا اور ان کو کام ختم ہو چکنے کے بعد اطلاع ملی تھی۔ کیا اس میں کوئی شک وشبہ ہو سکتا ہے کہ مندرجہ بالا حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین کے طور پر حضرت علیؑ کو پیش کرنا مقصود تھا؟

اہل بیتؑ۔ تم پر فرض ہے کہ ان کی محافظت کرو۔ تم ان سے کیسا سلوک کرو گے؟ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گی، یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے ساتھ مل جائیں گی"۔ (البدایہ والنہایہ جلد۵، ص۲۰۹۔ ذخائر العقبی ص۱۶۔ فصول المہمہ، ص۲۲۔ خصائص، ص۳۰۔ صواعق محرقہ، ص۱۳۷۔ غایۃ المرام میں ۳۹ عام ذرائع سے اور ۸۲ خاص ذرائع سے یہ حدیث نقل ہوئی ہے)۔

حدیث ثقلین جو مسلّم اور قطعی ہے اور مختلف عبارات میں مکمل طور پر نقل ہوئی ہے اور سنی اور شیعہ دونوں فرقے اس کی صحت پر اتفاق رکھتے ہیں۔ اس حدیث اور دوسری حدیثوں میں چند اہم مطالب نظر آتے ہیں:

① قرآن مجید قیامت تک لوگوں میں باقی رہے گا۔ اسی طرح عترت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی قیامت تک باقی رہے گی، یعنی کوئی زمانہ بھی امامؑ اور رہبر حقیقی سے خالی نہ رہے گا۔

② پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دونوں چیزوں کے ذریعے مسلمانوں کی علمی اور دینی ضروریات کو پورا کر دیا ہے اور اپنے اہل بیتؑ کو علم و دانش کے مرجع کے طور پر مسلمانوں کے سامنے پیش کیا ہے اور ان کے اقوال و اعمال کو معتبر شمار کیا ہے۔

③ قرآن اور اہل بیتؑ کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کرنا چاہیے اور کسی مسلمان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اہل بیتؑ کے علوم سے چشم پوشی کرے اور اپنے آپ کو ان کے حلقۂ ارشاد و ہدایت سے باہر لے جائے۔

④ اگر عوام اہل بیتؑ کی اطاعت کریں اور ان کے اقوال وکلام کی پیروی کریں تو ہرگز گمراہ نہیں ہوں گے اور ہمیشہ حق پر قائم رہیں گے۔

←

اس کلام سے اصل مقصد شور وغل کرنا تھا تا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وجہ سے اپنے فیصلے اور ارادے سے ہٹ جائیں، نہ کہ (اس نادرست کلام کا مطلب بیماری کا غلبہ تھا) اس کے حقیقی معنی مقصود ہوں، کیونکہ:

---

⑤ تمام ضروری علوم اور لوگوں کی دینی ضروریات اہل بیتؑ کے پاس موجود ہیں اور جو شخص بھی ان کی پیروی کرے گا وہ ضلالت وگمراہی میں گرفتار نہیں ہوگا اور حقیقی سعادت تک پہنچ جائے گا۔ یعنی اہل بیتؑ خطا اور گناہوں سے پاک ہیں۔ اس وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عترتؑ اور اہل بیتؑ سے مراد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام اولاد اور خاندان نہیں ہے بلکہ معینہ افراد ہیں جو علوم دین میں مکمل دسترس رکھتے ہیں اور وہی گناہ وخطا کے دائرے سے باہر ہیں اور ان میں رہبری اور رہنمائی کی صلاحیت و استعداد موجود ہے اور وہ ہیں حضرت علی ابن ابی طالبؑ اور آپؑ کے گیارہ فرزند جو یکے بعد دیگرے امامت پر منسوب ہوئے ہیں جیسا کہ احادیث سے بھی یہی مراد ہے۔ مثال اور نمونے کے طور پر ابن عباس کہتے ہیں:

میں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا کہ آپؑ کے خاندان کے افراد جن سے محبت کی جائے، کون لوگ ہیں؟ آپؑ نے فرمایا: علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ۔ (ینابیع المودۃ، ص ۳۱۱)

جابرؓ کہتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "خدائے تعالیٰ کے ہر پیغمبر کی اولاد کو اس کے صلب میں رکھا گیا ہے، لیکن میری اولاد علیؑ کے صلب میں رکھی گئی ہے"۔ (ینابیع المودۃ، ص ۳۱۸)

حدیث حق: ام سلمہؓ فرماتی ہیں: میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا، وہ فرماتے تھے: "علیؑ، قرآن اور حق کے ساتھ ہیں اور قرآن وحق، علیؑ کے ساتھ رہیں گے۔ وہ آپس میں جدا نہیں ہو سکتے، یہاں تک کہ کوثر پر میرے ساتھ مل جائیں"۔ (غایۃ المرام، ص ۵۳۹ میں یہی مضمون ۱۴ عام ذرائع سے اور ۱۰ خاص ذرائع سے نقل ہوا ہے)۔

حدیث منزلہ: سعد بن وقاص کہتے ہیں: رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ سے فرمایا: "(اے علیؑ) کیا تو خوش نہیں ہے کہ تیری اور میری نسبت ایسی ہے جیسی موسیٰؑ اور ہارونؑ کی تھی، سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا"۔ (البدایۃ والنہایۃ، جلد ۷، ص ۳۳۹۔ ذخائر العقبیٰ، ص ۶۳۔ فصول المہمہ، ص ۲۱۔ کفایۃ الطالب، تالیف گنجی شافعی، ص ۱۴۸ تا ۱۵۴۔ خصائص، ص ۱۹ تا ۲۵۔ صواعق محرقہ، ص ۱۷۷۔ غایۃ المرام، ص ۱۰۹۔ ایک سو احادیث عام ذرائع سے اور ۷۰ احادیث خاص ذرائع سے نقل کی گئی ہیں)

←

اوّل: پیغمبر اکرم ﷺ کی تمام مدت بیماری میں ایک لفظ بھی نا بجا آپؐ سے نہیں سنا گیا تھا اور نہ کسی نے بھی اسے لکھا، دینی لحاظ سے ایک مسلمان، پیغمبر اکرم ﷺ سے جو معصوم اور گناہ سے پاک تھے، ہذیان اور بیہودہ گوئی کو منسوب نہیں کرسکتا۔

حدیث دعوت عشیرہ: پیغمبر اکرم ﷺ نے اپنے خاندان والوں کو کھانے کی دعوت دی۔ غذا تناول کرنے کے بعد فرمایا: "مجھے ایسے شخص کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ہے جو مجھ سے بہتر چیز اپنی قوم کے لیے لایا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں اس کی دعوت دوں۔ پس کون ہے جو اس کام میں میری مدد کرے اور تمہارے درمیان میرا بھائی، وصی اور خلیفہ بنے"۔ تمام لوگوں نے خاموشی اختیار کی، لیکن علیؑ نے جو سب سے پہلے (چھوٹے تھے) اپنے آپ کو پیش کرتے ہوئے کہا:
"میں آپ کا وزیر اور مددگار ہوں گا"۔ پس پیغمبر اکرمؐ نے اپنا بازو ان کی گردن میں ڈال دیا اور فرمایا: "یہ میرا بھائی، وصی اور خلیفہ ہے۔ تمہیں چاہیے کہ اس کی اطاعت کرو"۔ اس کے بعد وہ لوگ وہاں سے چلے گئے اور مذاق کے طور پر ابوطالبؑ سے کہتے تھے کہ محمدؐ نے تمہیں حکم دیا ہے کہ اپنے بیٹے کی اطاعت کرو۔ (تاریخ ابی الفداء، جلد اوّل، ص ۱۱۶)
اور اس قسم کی احادیث بہت زیادہ تعداد میں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک میں حذیفہ کہتے ہیں: رسولؐ خدا نے فرمایا: "اگر علیؑ کو میرا جانشین اور خلیفہ بناؤ، اگرچہ میں جانتا ہوں کہ نہیں بناؤ گے تو اس کو بابصیرت اور عقل مند رہنما پاؤ گے جو تمہیں سچے اور حقیقی راستے کی طرف رہنمائی کرے گا"۔ (حلیۃ الاولیاء، تالیف ابونعیم، جلد اوّل، ص ۶۴۔ کفایۃ الطالب، طبع نجف، ۱۳۵۶ھ، ص ۶۷)
ابن مردویہ کہتے ہیں: پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: "جو شخص چاہتا ہے کہ اس کی زندگی اور موت میری طرح ہو اور اس کا ٹھکانہ بہشت میں ہو، وہ میرے بعد علیؑ سے محبت کرے اور میرے اہل بیتؑ کی پیروی کرے کیونکہ وہ میری عترت ہیں اور میری مٹی (وجود) سے پیدا ہوئے ہیں (میری اولاد ہیں) اور میرا علم و دانش اور فہم و شعور ان کو ملا ہے۔ پس جو شخص ان کے علم و فضل کی تردید کرے میں ہرگز اس کی شفاعت نہیں کروں گا"۔ (منتخب کنزالعمال، جو مسند احمد کے حاشیے کے ساتھ چھپی ہے، جلد ۵، ص ۹۴)

دوسرے: اگر اس کلام کے حقیقی معنی مقصود تھے تو دوسرے فقرے کا موقع محل (کہ ہمارے لیے خدا کی کتاب کافی ہے) نہیں تھا بلکہ پیغمبر اکرم ﷺ کے کلام کا نابجا ہونا آپ کی بیماری سے استدلال ہوتا نہ کہ قرآن مجید کے ہوتے ہوئے پیغمبر اکرم ﷺ کے کلام کی ضرورت نہیں، کیونکہ ایک صحابی کے لیے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ اس خدا کی کتاب نے پیغمبر اکرم ﷺ کو واجب الطاعت اور آپؐ کے کلام کو خدا کا کلام کہا ہے اور قرآن کریم کی آیات کے مطابق لوگ، خدا اور رسولؐ خدا کے حکم کے مقابلے میں کسی قسم کی آزادی یا اختیار عمل نہیں رکھتے۔

تیسرے: یہی واقعہ خلیفۂ اوّل کے مرض الموت میں بھی تکرار ہوا اور انھوں نے خلیفۂ دوم کی خلافت کے بارے میں وصیت کی۔ حضرت عثمان جب خلیفہ کے حکم سے وصیت نامہ لکھ رہے تھے تو خلیفہ بے ہوش ہوگئے۔ اس کے باوجود خلیفۂ دوم نے ہرگز وہ بات نہیں کی تھی جو پیغمبر اکرم ﷺ کے بارے میں کہی تھی اور وہ بات خلیفۂ اوّل کے بارے میں تکرار نہیں ہوئی تھی۔ (البدایہ والنہایہ، جلد ۶، ص ۳۱۱)

ان کے علاوہ خلیفہ دوم، ابن عباس کی حدیث میں اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ: ''میں جانتا ہوں کہ پیغمبر اکرم ﷺ علیؑ کی خلافت کا حکم دینا چاہتے ہیں لیکن میں نے مصلحت کی بنا پر اس رائے میں خلل ڈال دیا''۔

پھر کہتے ہیں: ''خلافت علیؑ کا حق تھا لیکن اگر علیؑ خلیفہ بن جاتے تو لوگوں کو حقیقت اور سچائی کے راستے پر چلنے کے لیے مجبور کرتے اور قریش ہرگز اس بات کو نہ مانتے، اس لیے ہم نے علیؑ کو خلافت سے ہٹایا ہے''

دینی احکام کے مطابق خلاف ورزی کرنے والوں کو مجبور کرنا چاہیے کہ وہ حق پر چلیں، نہ کہ خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے حق کو پامال کر دیا جائے۔ جب خلیفۂ اوّل کو خبر ملی کہ مسلمان قبیلوں کی ایک بڑی جماعت نے زکوٰۃ دینے سے منہ موڑ لیا ہے

تو انھوں نے حکم دیا کہ ان کے خلاف جہاد کیا جائے اور کہا کہ اگر عوام ہر وہ چیز یا کوڑی جو زکوۃ کے طور پر رسول اکرم ﷺ کو دیا کرتے تھے، مجھے نہ دیں گے تو میں ان کے ساتھ جنگ کروں گا" (البدایہ والنہایہ، جلد ۶، ص ۳۱۱)۔ البتہ اس کلام سے مراد یہ تھی کہ ہر قیمت پر حق کو زندہ کرنا چاہیے اور حقیقی خلافت کا موضوع ایک کوڑی سے زیادہ اہم اور قابلِ توجہ تھا۔

معارف الٰہی کے بیان میں امامت کا مفہوم

پیغمبر شناسی کے متعلق بحث میں گزر چکا ہے کہ "عمومی ہدایت" کے مستقل اور لازمی قوانین کے مطابق ہر قسم کی مخلوق اور کائنات اپنی فطری پیدائش اور تکوینی آفرینش کے ذریعے کمال و سعادت کی طرف گامزن ہے اور اسی طرف اس کی رہنمائی اور ہدایت ہوتی ہے۔

انسان بھی جو کائنات کی ایک قسم ہے اس عمومی قانون کے دائرے سے باہر مستثنیٰ نہیں ہے، لہٰذا حقیقت بینی اور اجتماعی تفکر کے ذریعے اپنی زندگی میں خاص طریقے پر ہدایت حاصل کرتا ہے جو اس کی دنیوی اور اُخروی سعادت کو پورا کر سکے۔ دوسرے الفاظ میں انسان کو چاہیے کہ خاص عقائد اور عملی فرائض کو سمجھ کر اپنی زندگی کے طریقے کو ان کے ساتھ مطابقت دے تاکہ اپنی سعادت اور انسانی کمال و مرتبے کو حاصل کر سکے اور جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ زندگی کے اس پروگرام اور منصوبے کو سمجھنے کا طریقہ جس کو "دین" کہا جاتا ہے، عقل کے ذریعے ممکن اور میسر نہیں ہے بلکہ ایک اور طریقے سے میسر ہے جس کو وحی اور نبوت کہتے ہیں اور وہ بھی دنیا میں بعض پاک فطرت انسانوں کو ملتی ہے، جن کو پیغمبر یا نبی کہا جاتا ہے۔

یہ پیغمبر ہی ہیں جو انسانی فرائض کو وحی کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے حاصل کر کے ان کو لوگوں تک پہنچاتے ہیں تاکہ ان پر عمل کرنے سے لوگوں کو سعادت اور خوش نصیبی

حاصل ہو۔

واضح ہے کہ یہ دلیل و برہان، جیسا کہ ادراک کی ضرورت کو افراد میں ثابت کرتی ہے، اسی طرح ان افراد کی پیدائش کی ضرورت کو بھی ثابت کرتی ہے جو اس پروگرام کی حفاظت کر سکیں اور حتی الامکان اس کو لوگوں تک پہنچائیں۔

جیسا کہ خدائی توجہ کے لیے ضروری ہے کہ ایسے اشخاص پیدا ہوں جو انسانی فرائض کو وحی کے ذریعے سمجھ اور حاصل کر کے ان کو عوام تک پہنچائیں اور ان فرائض کی تعلیم لوگوں کو دیں۔ اسی طرح ضروری ہے کہ یہ خدائی اور انسانی فرائض ہمیشہ کے لیے اس دنیا میں محفوظ رہیں اور اگر ضرورت پڑے تو لوگوں کو ان کی تعلیم دی جائے یعنی ہمیشہ ایسے اشخاص موجود ہوں جن کے پاس خدا کا دین موجود اور محفوظ رہے اور موقع کے مطابق ان پر عمل کیا جائے۔

جو شخص آسمانی دین کی حفاظت کا ذمہ دار ہے اور خداوند تعالیٰ کی طرف سے اس عہدے اور منصب پر فائز اور منصوب ہوا ہے اسے "امام" کہا جاتا ہے جیسا کہ جو شخص وحی و نبوت کا عہدیدار ہے اور آسمانی دین و احکام کو خدا کی طرف سے حاصل کرتا ہے اسے "نبی" کہتے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ نبوت و امامت ایک ہی شخص میں جمع ہو جائیں اور ممکن ہے ایک دوسرے سے جدا ہوں، جیسا کہ مذکورہ دلیل پیغمبروں کی عصمت و طہارت اور امانت داری کو ثابت کرتی ہے۔ اسی طرح اماموں اور پیشواؤں کی عصمت و طہارت کو بھی ثابت کرتی ہے کیونکہ ہمیشہ کے لیے حقیقی دین کسی کمی بیشی کے بغیر اور قابلِ تبلیغ انسانوں میں موجود رہنا چاہیے اور یہ کام خدائی عصمت و طہارت کے بغیر انجام نہیں پا سکتا۔

نبی اور امام میں فرق

گزشتہ دلیل جو آسمانی شریعتوں اور احکام کو وصول کرنے کے بارے میں آئی

ہے کہ پیغمبران احکام کو خدا کی طرف سے حاصل کرتے ہیں، یہی دلیل اصل وحی یعنی آسمانی احکام وصول کرنے کو ثابت کرتی ہے نہ کہ اس کے ہمیشہ جاری رہنے کو، اور یہ مسئلہ وحی کی حفاظت کے بالکل برعکس ہے جو ہمیشگی اور دائمی امر ہے (یعنی وحی کو خدا کی طرف سے وصول کرنا اور اس کو بندوں تک پہنچانا ایک الگ مسئلہ ہے اور وحی کی ہمیشہ حفاظت دوسرا مسئلہ ہے)۔ لہٰذا یہ ضروری نہیں کہ انسانوں کے درمیان ایک پیغمبر ہمیشہ کے لیے موجود رہے۔ لیکن امام کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے جو آسمانی دین کا محافظ اور نگہبان ہے اور یہ انسانی معاشرہ امام کی ضرورت سے ہرگز خالی نہیں ہو سکتا۔ خواہ یہ معاشرہ اسے (امام کو) پہچانے یا نہ پہچانے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے:

فَإِنْ يَكْفُرْ بِهَا هَٰؤُلَاءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَيْسُوا بِهَا بِكَافِرِينَ ۝ (سورۂ انعام:۸۹)

"اور اگر ہماری ہدایت کے ذریعے بھی کافر ایمان نہیں لاتے جس میں ہرگز خلاف ورزی اور تبدیلی نہیں ہے تو ہم نے ایک گروہ کو ان کا نگران بنا دیا ہے جو ان (کافروں) کے ذریعے ہرگز کافر نہیں ہوگا"۔

اور جیسا کہ پہلے اشارہ ہو چکا ہے کہ کبھی کبھی نبوت اور امامت (دونوں منصب) یکجا جمع ہو جاتے ہیں اور ایک ہی شخص دونوں عہدوں کا حامل ہو جاتا ہے یعنی پیغمبر بھی ہوتا ہے اور امام بھی۔ (آسمانی شریعت اور احکام کو وصول کرتا ہے اور ان کی نگہبانی اور حفاظت کا عہدیدار بھی ہوتا ہے) اور کبھی کبھی یہ دونوں منصب جدا جدا اور الگ الگ ہوتے ہیں، جیسا کہ ممکن ہے ایک زمانے میں پیغمبر نہ ہو لیکن ہر زمانے میں حقیقی امام موجود ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کے پیغمبروں کی تعداد محدود ہے اور ہمیشہ پیغمبر نہیں آسکتا۔

اللہ تعالیٰ اپنی کتاب (قرآن مجید) میں بعض پیغمبروں کا امامت کے ساتھ تعارف کراتا ہے جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں فرماتا ہے:

وَ اِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ○ (سورۂ بقرہ: ۱۲۴)

"جب خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کا مختلف طریقوں سے امتحان لیا تو پھر ان امتحانوں کو ختم کر دیا اور فرمایا: میں نے تجھے عوام اور بنی نوع انسان کے لیے امام اور رہبر بنا دیا ہے۔ ابراہیمؑ نے عرض کیا: کیا میری اولاد سے بھی (کسی کو امام بنایا گیا ہے؟) خداوند تعالیٰ نے فرمایا: میرا وعدہ اور پیمان ظالموں اور ستم گاروں کے ساتھ ہرگز نہیں ہوتا"۔

اور پھر فرماتا ہے:

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا (سورۂ انبیاء: ۷۳)

"اور ہم نے ان کو امام اور رہبر بنا دیا ہے جو ہمارے حکم سے ہدایت اور رہبری کرتے تھے"۔

باطنی اعمال میں امامت کا مفہوم

جس طرح لوگوں کے ظاہری اعمال کے لیے امام، پیشوا یا دینی رہبر کی ضرورت ہے اسی طرح باطن میں بھی امام رہبری اور ہدایت کرتا ہے اور وہی انسانی قافلے کا سالار ہے جو باطن کے ذریعے خدا کی طرف قدم اٹھاتا ہے۔

اس مطلب کو واضح کرنے کے لیے مندرجہ ذیل دو مقدموں کی طرف توجہ کرنی چاہیے:

اوّل: اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ اسلام کی نظر میں اور تمام آسمانی ادیان کی نظر میں بھی انسان کی ہمیشگی سعادت وشقاوت (خوش بختی اور بد بختی) کا واحد وسیلہ اس کے نیک اور بُرے اعمال ہیں جس کی آسمانی دین نے بھی تعلیم دی ہے اور انسان اپنی خداداد فطرت اور سرشت کے ساتھ ان کو سمجھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے وحی اور نبوت کے ذریعے ان اعمال کو ہمارے طرزِ تفکر کے مناسب بڑی سادہ اور معاشرتی زبان میں امر ونہی اور حسن وقبح کی صورت میں بیان فرمایا ہے اور ان کی اطاعت یا نافرمانی کے مقابلے میں نیکوکاروں اور فرماں برداروں کو ہمیشہ خوش حال زندگی کی خوشخبری دی ہے۔ وہ زندگی جس میں ہر قسم کی انسانی لذتیں موجود ہیں اور بدکار وستم گار لوگوں کو ہمیشہ تلخ اور بد بختی سے بھرپور زندگی کا وعدہ دیا ہے جس میں ناکامی اور حسرت کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

اس میں بھی شک نہیں ہے کہ کائنات کا خدا ہر چیز سے بالاتر ہے اور ہمارے تصور اور وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتا۔ وہ ہماری طرح معاشرتی تفکر بھی نہیں رکھتا اور یہ تنظیم ایک خدائی و بندگی، فرماں روائی اور فرماں برداری، امر ونہی، مزد و پاداش کا معاہدہ ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی کے باہر اس کا وجود نہیں ہے اور یہ خدائی تنظیم کائنات کی وہی تنظیم ہے جس میں زندگی اور ہر چیز کی پیدائش خدا کی فطرت سے حقیقی تعلق اور رابطہ رکھتی ہے، اور بس!

جیسا کہ قرآن کریم [1] اور پیغمبر اکرم ﷺ کی احادیث میں اشارہ ہوا ہے،

---

[1] نمونے کے طور پر وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ (سورۂ زخرف: ۲-۴) "قسم ہے اس واضح اور روشن کتاب (قرآن مجید) کی، ہم نے قرآن مجید کو عربی زبان میں اس لیے نازل فرمایا ہے کہ شاید تم اس میں غور وخوض کرو اور یہ قرآن ہمارے پاس لوحِ محفوظ (اُم الکتاب) میں بہت ہی بلند مرتبہ اور عزیز وحکیم ہے"۔

دین ایسے حقائق و معارف پر مشتمل ہے جو عام اور معمولی فہم سے بہت زیادہ بالاتر ہے، مگر خداوند تعالیٰ نے اس کو ایسے الفاظ میں بیان فرمایا ہے جو ہماری سطح فکر کے مناسب ہے اور ہمارے لیے قابل فہم ہے۔

اس بیان سے یہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیے کہ نیک و بداعمال اور ابدی زندگی کی خصوصیات میں ایک حقیقی تعلق اور رابطہ موجود ہے کیونکہ مستقبل کی خوشی اور رنج خدا کی مرضی پر اور ان لوگوں کے اعمال پر مشتمل ہے۔

سادہ الفاظ میں ہر نیک و بدعمل کے ذریعے انسان میں ایک حقیقت پیدا ہوجاتی ہے کہ اس کی آئندہ زندگی اسی حقیقت کی مرہونِ منت ہے۔

انسان سمجھے یا نہ سمجھے بالکل ایک بچے کی طرح جو زیر تربیت ہو اور اپنے معلم سے اسے جو حکم ملتا ہے یعنی "یہ کام کرو اور یہ کام نہ کرو"۔ سنتا ہے اور اسی کے مطابق عمل کرتا ہے لیکن اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں جانتا مگر بڑا ہونے اور زمانہ تربیت گزارنے کے بعد اپنی روحانی صلاحیتوں کے ذریعے جو اس نے اپنے باطن میں پیدا کرلی ہوتی ہیں، معاشرے میں سعادت مندانہ زندگی حاصل کرلیتا ہے اور اگر وہ اپنے خیرخواہ معلم کا حکم ماننے سے انکار کرے تو بدنصیبی اور بدبختی کے سوا اسے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

یا اس شخص کی طرح جو ڈاکٹر کی نصیحت کے مطابق دوا، خوراک اور مخصوص ورزش کو ہمیشہ انجام دیا ہے اور ڈاکٹر کے حکم کی تعمیل کرنے یا اس پر عمل کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتا اور نہ ہی کسی دوسرے کام سے سروکار رکھتا ہے، تو اس نسخے پر عمل کرنے سے اس کا بدنی ڈھانچہ اور اندرونی حالت ایسے ہوجاتے ہیں جو تندرستی، صحت اور ہر قسم کی خوشی کی ضمانت دیتے ہیں۔

مختصر یہ کہ انسان اس ظاہری زندگی کے اندر ایک دوسری باطنی زندگی (معنوی

زندگی) رکھتا ہے جو اس کے اعمال پر مبنی ہے اور رشد و نمو کرتی ہے اور دوسری دنیا میں انسان کی خوش نصیبی یا بد نصیبی انھی اعمال سے متعلق ہے۔

قرآن مجید بھی اس عقلی بیان کی تصدیق کرتا ہے اور بہت زیادہ آیات میں[1] نیکوکاروں اور اہلِ ایمان کے لیے ایک دوسری زندگی اور دوسری روح کو جو موجودہ زندگی اور رُوح سے بہت ہی بالاتر ہے، ثابت کرتا ہے اور باطنی اعمال کے نتیجے کو بھی ہمیشہ انسان کے ساتھ ساتھ جانتا ہے۔ احادیث نبویؐ میں بھی اسی مطلب کی طرف بہت زیادہ اشارے ہوئے ہیں۔[2]

---

① ان آیات کی طرح وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ ۝ لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ۝ (سورۂ ق: ۲۱-۲۲) "یعنی قیامت کے دن تمام لوگ اپنے اپنے گواہوں اور ماموروں کے ساتھ دوبارہ اٹھیں گے (اور ان سے کہا جائے گا کہ) تم اس زندگی سے غافل اور بے اطلاع تھے، پس ہم نے آج تمھاری آنکھوں سے پردۂ غفلت اٹھا دیا ہے اور اب تمھاری آنکھیں تیز بین ہو گئی ہیں"۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً (سورۂ نحل: ۹۷) "جو شخص بھی نیک کام کرتا ہے اور مومن ہے ہم اسے زندہ کر دیتے ہیں اور پاکیزہ اور اچھی زندگی اسے عطا ہوتی ہے اور اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (سورۂ انفال: ۲۴) "جب خدا اور رسولؐ تمھیں اس چیز کی طرف دعوت دیں جس سے تم زندہ ہو جاؤ تو فوراً اس کو قبول کر لو"۔

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَّ مَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ (سورہ آل عمران: ۳۰) "یعنی (قیامت) وہ دن ہے جس دن ہر شخص اپنے اچھے یا بُرے کام کو اپنے سامنے دیکھ لے گا جو اس نے دنیا میں انجام دیا ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى وَ نَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَ اٰثَارَهُمْ وَ كُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ۝ (سورۂ یٰسین: ۱۲) "ہم مُردوں کو زندہ کرتے ہیں اور ان کے اعمال و آثار کو لکھتے ہیں اور ہم نے تمام چیزوں کو امامِ مبین کے اختیار میں دے رکھا ہے"۔

② نمونے کے طور پر اللہ تعالیٰ پیغمبر ﷺ کے واقعۂ معراج کے سلسلے میں فرماتا ہے: ←

دوم: یہ کہ عام طور پر یہ مسئلہ پیش آتا ہے کہ ممکن ہے ہم میں سے ایک شخص کسی دوسرے کو اچھے یا بُرے کام کی طرف رہنمائی کرے حالانکہ خود اپنے قول پر پابند نہ ہو،

فمن عمل برضائی الزمه ثلاث اعرفه شکراً لا یخالطه الجهل وذکراً لا یخالطه النسیان ومحبّة لا یوثر علٰی محبتی محبّة المخلوقین فاذا احبّنی احببته وافتح عین قلبه الٰی جلالی ولا اخفی علیه خاصة خلقی واناجیه فی ظلم اللّیل ونور النهار حتّٰی ینقطع حدیثه مع المخلوقین ومجالسته معهم واسمعه کلامی وکلام ملائکتی واعرّفه السرّ الذی سترته عن خلقی والبسه الحیا حتّٰی یستحی منه الخلق ویمشی علی الارض مغفوراً له واجعل قلبه واعیًا وبصیراً ولا اخفی علیه شیئًا من جنّة ولا نار واعرّفه ما یمرّ علی الناس فی القیامة من الهول الشدّة (بحارالانوار، طبع کمپانی، جلد ۱۷، ص ۹) "پس جو شخص میری مرضی کے لیے کام کرے وہ تین خصلتیں رکھتا ہے کہ میری طرف سے اس کو دی گئی ہیں:

① وہ شکر جس میں جہالت نہیں ہوتی۔ ② وہ محبت جس میں کسی چیز کو خدا پر ترجیح نہ دی جائے۔ ③ وہ ذکر جس میں فراموشی نہ ہو۔ ایسا شخص جب مجھ سے پیار کرتا ہے تو میں بھی اس سے پیار کرتا ہوں اور اس کے دل اور آنکھوں کے اپنے نور سے روشن کر دیتا ہوں اور اپنے خاص بندوں کو ان کی آنکھوں سے پنہاں نہیں کرتا۔ پھر رات کی تاریکی اور دن کے نور میں اس سے باتیں کرتا ہوں یہاں تک کہ لوگوں کے ساتھ اس کا تعلق ختم ہو جائے اور میں اپنی اور فرشتوں کی باتوں کو اسے سناتا ہوں اور اس کو اس راز سے واقف کرتا ہوں جو دوسروں پر آشکار نہیں کیا گیا اور اسے شرم وحیا کا لباس پہناتا ہوں، وہ زمین پر چلتا ہے لیکن وہ پاک ہوتا ہے۔ اس کے دل کو ہوشیار اور آگاہ کر دیتا ہوں۔ بہشت اور دوزخ کی کسی چیز کو اس سے پوشیدہ نہیں رکھتا اور قیامت کی مصیبت کو جو لوگوں پر ہوگی، اس سے واقف کر دیتا ہوں۔

عن ابی عبداللّٰه علیه السلام قال استقبل رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وآله حارثة بن مالک بن النعمان الانصاری– فقال له: کیف انت یاحارثة بن مالک؟ فقال: یارسول اللّٰه مومنٌ حقًا – فقال له رسول اللّٰه – لکلّ شیءٍ حقیقةٌ قولک؟ فقال یارسول اللّٰه عزّفت نفسی عن الدنیا فاسهرت لیلی واظمات هو اجیری فکانّی انظر إلٰی عرش ربّی وقد وضع للحساب وکانّی

مگر پیغمبروں اور اماموں میں ہرگز یہ چیز موجود نہیں ہوتی کیونکہ ان کی قیادت، رہنمائی اور ہدایت خدا کے حکم سے ہوتی ہے۔ یہ لوگ انسانوں کو جس دین کی طرف ہدایت اور رہنمائی کرتے ہیں اور جس ہدایت کے ذمہ دار ہوتے ہیں خود بھی اس پر عمل کرتے ہیں اور معنوی زندگی کی طرف لوگوں کی ہدایت کرتے ہیں، کیونکہ اگر خدا خود کسی شخص کو ہدایت نہ کرے تو دوسروں کی ہدایت اور رہنمائی اس کے ہاتھ میں نہیں دے سکتا اور خدا کی خاص ہدایت میں ہرگز کبھی کوئی خطا یا غلطی نہیں ہوتی۔

اس بیان سے مندرجہ ذیل نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں:

① ہر اُمت کے امام اور پیغمبر مکمل معنوی اور دینی زندگی میں سب سے پہلے درجے پر ہوتے ہیں جس کی طرف وہ دوسروں کو ہدایت اور دعوت دیتے ہیں کیونکہ وہ مکمل طور پر اپنے دعوے اور دعوت پر عمل پیرا ہوتے ہیں اور اسی طرح معنوی زندگی کی شرائط پر بھی پورا اُترتے ہیں۔

② کیونکہ وہ (امام اور پیغمبر) سب سے پہلے مذاہب کے رہبر اور پیشوا ہوتے ہیں اس لیے سب سے افضل ہوتے ہیں۔

انظر الی اهل الجنة یتزاورون فی الجنة وکانی اسمع عواء اهل النار فی النار – فقال رسول الله: عبدٌ نوّر الله قلبه (وافی تالیف فیض، جزء سوم، ص ۳۳)

"حضرت ابوعبداللہؑ نے فرمایا: رسول اکرم ﷺ نے حارثہ بن مالک بن نعمان انصاری کی طرف چہرۂ مبارک کیا اور فرمایا: اے حارث بن مالک! تمھارا کیا حال ہے؟ اس نے عرض کیا: اے خدا کے رسولؐ! میں حقیقی مومن ہوں۔ رسولؐ خدا نے فرمایا: ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے، تیری بات کی کیا حقیقت ہے؟ حارث نے کہا: اے پیغمبر خدا! میں نے دنیا سے قطع تعلق کرلیا ہے اور راتوں کو بیدار رہتا ہوں۔ میں نے اپنی خواہشات کو ختم کر دیا ہے اور اب ایسا محسوس کرتا ہوں کہ خدا کے عرش کو دیکھ رہا ہوں اور جنتی لوگوں کو دیکھ رہا ہوں کہ ایک دوسرے سے مل رہے ہیں اور گویا دوزخیوں کی آہ وزاری سن رہا ہوں۔ پیغمبرِ خدا نے فرمایا: حارث خدا کا ایسا بندہ ہے کہ خدا نے اس کے دل کو روشن اور منور کر دیا ہے۔

۳۔ جو شخص خدا کے حکم سے ایک اُمت یا قوم کی رہبری اور رہنمائی کا عہدیدار ہوتا ہے، جیسا کہ وہ تمام ظاہری اعمال کی رہبری اور ہدایت کا ذمہ دار ہوتا ہے، اسی طرح معنوی زندگی کے مراحل میں بھی ہدایت اور حقیقی اعمال اسی کی ہدایت سے انجام پاتے ہیں۔[1]

ائمہ اطہارؑ اور اسلام کے دینی پیشوا

گزشتہ ابواب سے حاصل شدہ نتائج کے مطابق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد اُمت اسلامی کے درمیان ہمیشہ ایک امام (مذہبی اور دینی راہنما جو خدا کی طرف سے منصوب ہو) یا دینی رہنما خدا کی طرف سے موجود رہا ہے، اور ہمیشہ رہے گا۔

ان اماموں کی تعداد کے بارے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت زیادہ احادیث[2]

---

① وَ جَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْهِمْ فِعْلَ الْخَیْرٰتِ (سورۂ انبیاء: ۷۳)
''ہم نے ان کو امام بنایا ہے تا کہ وہ ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت کریں اور نیک کام کرنے کے لیے ان پر وحی نازل کی ہے''۔
(سورۂ سجدہ: ۲۴) ''ہم نے ان میں سے بعض کو امام بنایا ہے تا کہ ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت کریں، کیونکہ انھوں نے صبر کیا ہے''۔
اس قسم کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام، ظاہری ہدایت و رہنمائی کے علاوہ ایک قسم کی معنوی اور باطنی ہدایت کا ذمہ دار بھی ہوتا ہے جو عالمِ امر اور وحدانیت کی قسم میں سے ہے اور حقیقت و نور باطنی کے ذریعے اچھے اور نیک انسانوں کے دلوں میں پیدا ہوتی ہے اور ان کو کمال کے درجے کی طرف لے جاتی ہے۔

② نمونے کے طور پر: عن جابر بن سمرة، قال سمعت رسول اللّٰه یقول: لا یزال هذا الدین عزیزاً الی اثنی عشر خلیفة – قال فکبّر الناس وضجّوا ثم قال کلمةً خفیّةً – قلت لابی: یا ابة، ما قال، قال: کلهم من قریش (صحیح ابوداؤد، جلد۲، ص ۲۰۷، مسند احمد، جلد۵، ص ۹۲) اور اسی مضمون کے قریب قریب کی دوسری احادیث بھی ملتی ہیں) ←

نقل ہوئی ہیں کہ یہ سب کے سب قریش خاندان اور پیغمبر اکرم ﷺ کے اہل بیتؑ میں سے ہوں گے اور حضرت مہدی موعود بھی انھی میں سے ایک اور آخری امام ہوں گے۔

اسی طرح پیغمبر اکرم ﷺ سے بہت سی احادیث① حضرت علی علیہ السلام کی جانشینی اور امامت کے بارے میں نقل ہوئی ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام ان اماموں میں سے پہلے امام ہیں اور اس طرح آنحضرت ﷺ اور حضرت علی علیہ السلام سے احادیث ثقہ

"جابر بن سمرۃ کہتے ہیں کہ میں نے رسول خدا ﷺ سے سنا کہ فرماتے تھے: یہ دین میرے بعد بارہ جانشینوں کے آنے تک ہمیشہ باقی رہے گا۔ جابرؓ نے کہا کہ اس وقت لوگوں نے تکبیر کہی اور پھر رسول اللہ ﷺ نے پوشیدہ طور پر کچھ بیان فرمایا۔ میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ رسولؐ اللہ نے کیا فرمایا ہے؟ میرے والد نے کہا: آپؐ نے فرمایا کہ وہ بارہ امام سب قریش میں سے ہوں گے۔

عن سلمان الفارسی قال: دخلتُ علی النبی صلی اللّٰہ علیہ والہ وسلم فاذا الحسین علی فخذیہ وھو یقبل عینیہ ویقبل فاہ ویقول: انت سیّد ابن سیّد وانت امام ابن امام وانت حجّۃ ابن حجۃ وانت ابو حجج تسعۃ، تاسعھم قائمھم (ینابیع المودۃ تالیف سلیمان ابن ابراہیم قندوزی، طبع نجف، ص ۳۰۸)

"سلمان فارسی کہتے ہیں: میں رسول اللہ ﷺ کے پاس گیا تو دیکھا کہ آپؐ نے حسین علیہ السلام کو اپنی گود میں بٹھایا ہوا تھا اور ان کی آنکھوں اور چہرے کو چوم رہے تھے اور فرماتے تھے: تم سردار ہو اور سردار کے بیٹے ہو، تم امام ہو اور امام کے بیٹے ہو۔ تم حجت ہو اور حجت کے فرزند ہو اور تم نو اماموں کے باپ ہو کہ ان میں سے نواں قائم ہے"۔

① کتاب الغدیر تالیف امینی، کتاب غایۃ المرام تالیف سید ہاشم بحرانی، کتاب اثبات الہداۃ تالیف محمد بن حسن حُر عاملی، ذخائر العقبیٰ تالیف محب الدین احمد بن عبداللہ طبری، مناقب تالیف خوارزمی، تذکرۃ الخواص تالیف ابن جوزی، ینابیع المودت تالیف سلیمان ابراہیم قندوزی حنفی، فصول المہمہ تالیف ابن صباغ، دلائل الامامت تالیف محمد بن جریر طبری، النص والاجتہاد تالیف شرف الدین موسوی، اصول کافی، جلد اول، تالیف محمد بن یعقوب کلینی، کتاب الارشاد، تالیف مفیدؒ کی طرف رجوع کریں۔

دوسرے اور تیسرے امام کے بارے میں بھی نقل ہوئی ہیں اور پھر گزرے ہوئے اور آئندہ آنے والے اماموں کے بارے میں بھی قطعی اور ثقہ احادیث موجود ہیں۔

ان احادیث کے مطابق شیعہ اماموں کی تعداد بارہ (۱۲) ہے اور ان کے نام

یہ ہیں:

① علی ابن ابی طالبؑ

② حسنؑ بن علیؑ

③ حسینؑ بن علیؑ

④ علیؑ بن حسینؑ (زین العابدینؑ)

⑤ محمدؑ بن علیؑ (باقرؑ)

⑥ جعفرؑ بن محمدؑ (جعفر صادقؑ)

⑦ موسیٰؑ بن جعفرؑ (موسیٰ کاظمؑ)

⑧ علیؑ بن موسیٰؑ (موسیٰ رضا)

⑨ محمدؑ بن علیؑ (محمد تقیؑ)

⑩ علیؑ بن محمدؑ (علی نقیؑ)

⑪ حسنؑ بن علیؑ (حسن عسکریؑ)

⑫ محمدؑ بن حسنؑ (قائم المہدیؑ)

بارہ اماموں کی زندگی پر اجمالی نظر

امام اوّل علیہ السلام

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام پہلے امام ہیں ۔ آپ حضرت ابوطالبؑ کے بیٹے تھے جو بنی ہاشم خاندان کے معتبر فرد تھے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقیقی چچا بھی تھے جنھوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی زیر سرپرستی لے کر اپنے گھر میں جگہ دی اور ان کی دیکھ بھال اور پرورش کی تھی ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے بعد وہ جب تک زندہ رہے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت کرتے ہوئے عربی کفار اور خاص کر قریش کے حملوں اور شرارتوں سے آپؐ کو محفوظ رکھا۔

حضرت علی علیہ السلام (مشہور قول کے مطابق) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے دس سال پہلے پیدا ہوئے اور ابھی چھے سال ہی کے تھے کہ شہر مکہ اور گردونواح میں سخت قحط پڑا، اس لیے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خواہش کے مطابق آپ اپنے آبائی گھر سے اپنے چچا زاد بھائی رسولؐ خدا کے گھر تشریف لے گئے اور آپؐ کی براہ راست سرپرستی میں پرورش پائی ۔ (فصول المہمہ ، طبع دوم، ص ۱۴ ۔ مناقبؒ خوارزمی، ص ۱۷)

چند سال بعد جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خدائے تعالیٰ کی طرف سے نبوت عطا ہوئی اور پہلی بار غار حرا میں آپؐ پر آسمانی وحی نازل ہوئی تو آپؐ غار حرا سے شہر اور گھر کی طرف تشریف لے جا رہے تھے اور حضرت علی علیہ السلام سے تمام واقعہ بیان کیا تو حضرت علی علیہ السلام فوراً آپؐ پر ایمان لے آئے ۔ (ذخائر العقبیٰ، طبع قاہرہ، ۱۳۵۶ھ، ص ۵۸ ۔ مناقب خوارزمی، طبع نجف، ۱۳۸۵ھ، ص ۱۶-۲۲ ۔ ینابیع المودۃ، طبع ہفتم،

صفحہ ۶۸-۷۲)

اس کے بعد پھر جب پیغمبر اکرم ﷺ نے اپنے نزدیکی رشتہ داروں کو جمع کر کے دین مبین کی دعوت دی تو اس وقت پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: "جو شخص سب سے پہلے میری دعوت دین قبول کرے گا، وہی میرا خلیفہ، وصی اور وزیر ہوگا"۔ جو شخص سب سے پہلے اپنی جگہ سے اٹھا اور بآواز بلند ایمان لایا وہ حضرت علی علیہ السلام ہی تھے۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے بھی ان کے ایمان کو قبول کرلیا اور ان کے بارے میں اپنے وعدے پورے کیے۔ (ارشاد مفید، طبع تہران، ۱۳۷۷ھ، ص ۴۔ ینابیع المودة، ص ۱۳۲)

اس لحاظ سے حضرت علی علیہ السلام پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسلام قبول کیا اور پیغمبر اکرم ﷺ پر ایمان لائے اور سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے ہرگز خدائے وحدہٗ لاشریک کے علاوہ کسی اور کی پرستش اور عبادت نہیں کی۔

حضرت علی علیہ السلام ہمیشہ پیغمبر اکرم ﷺ کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ یہاں تک کہ جب آنحضرت ﷺ نے مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی۔ اس رات بھی جب کہ کفار مکہ نے آنحضرت ﷺ کے مکان کو گھیرے میں لے رکھا تھا اور پختہ ارادہ کیے ہوئے تھے کہ رات کے آخری حصے میں آنحضرت ﷺ کے بستر مبارک پر سوگئے، اور آپ گھر سے نکل کر مدینہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ (فصول المہمہ، ص ۲۸-۳۰، تذکرة الخواص، طبع نجف ۱۳۸۳ھ، ص ۳۴۔ ینابیع المودة، ص ۱۰۵۔ مناقب خوارزمی، ص ۷۳-۷۷) اور پھر آنحضرت ﷺ کے بعد آپؑ کی وصیت کے مطابق لوگوں کی امانتیں ان کے مالکوں کو واپس لوٹا کر اپنی والدہ ماجدہ، پیغمبر اکرمؐ کی بیٹی (حضرت فاطمہؑ) اور گھر کی دوسری عورتوں کو ساتھ لے کر مدینہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ (فصول المہمہ، ص ۳۴)

مدینہ منورہ میں بھی آپؑ ہمیشہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی بھی، کیا تنہائی میں اور کیا مجلس میں، علیؑ کو اپنے سے جدا نہیں کرتے تھے اور اپنی پیاری بیٹی حضرت فاطمہؑ کی شادی ان کے ساتھ کر دی اور ایسے ہی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب کے درمیان دوستی اور برادری کا معاہدہ کرتے تو حضرت علیؑ کو اپنا بھائی کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ (فصول المہمہ، ص ۲۰۔ تذکرۃ الخواص، ص ۲۰-۲۳۔ ینابیع المودۃ، ص ۶۳-۶۵)

حضرت علی علیہ السلام نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام جنگوں میں شرکت کی اور ہر جنگ میں حاضر رہے، سوائے جنگ تبوک کے، کیونکہ اس وقت آنحضرتؐ نے ان کو مدینہ میں اپنی جگہ پر قائم مقام کے طور پر مقرر فرمایا تھا (تذکرۃ الخواص، ص ۱۸۔ فصول المہمہ، ص ۲۱۔ مناقب خوارزمی، ص ۷۴)۔ لہٰذا حضرت علی علیہ السلام نہ تو کبھی کسی جنگ میں پیچھے رہے اور نہ ہی کبھی کسی دشمن سے شکست کھائی اور نہ ہی کسی کام میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کی۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ علیؑ ہرگز حق سے جدا نہیں، اور حق علیؑ سے جدا نہیں ہے۔ (مناقب آل ابی طالب، تالیف محمد بن علی بن شہر آشوب، طبع قم، جلد ۳، ص ۶۲-۲۱۸۔ غایۃ المرام، ص ۵۳۹۔ ینابیع المودۃ، ص ۱۰۴)

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے وقت آپؑ کی عمر تینتیس سال کی تھی اور اگرچہ تمام فضائل دینی میں سب سے بڑھ کر تھے اور تمام اصحاب کے درمیان ممتاز تھے۔ پھر بھی اس بہانے سے کہ آپ جوان ہیں اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں چونکہ جنگوں میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے تھے اور سب سے آگے ہوتے تھے، ان جنگوں میں خونریزی کی وجہ سے لوگ آپ کے مخالف اور دشمن ہیں، ان کو خلافت سے الگ کر دیا گیا اور اس طرح آپ عمومی کاموں میں حصّہ نہ لے سکے اور گھر

میں گوشہ نشین ہو کر اشخاص کی تربیت کرنے لگے۔ آپ پچیس سال تک یعنی پیغمبر اکرمؐ کی رحلت کے بعد تین خلفاء کی خلافت کے زمانے میں حکومت اور خلافت سے بالکل الگ تھلگ رہے اور خلیفہ سوم کے قتل کے بعد عوام نے آپ کو خلیفہ منتخب کر کے آپؑ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔

حضرت علی علیہ السلام اپنے زمانۂ خلافت میں جو تقریباً چار سال نو مہینے جاری رہا، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت اور روش پر عمل پیرا رہے اور آپ نے اپنی خلافت کو ایک تحریک یا انقلاب میں تبدیل کر دیا اور اس کے ساتھ اصلاحات بھی شروع کیں۔ لیکن چونکہ یہ اصلاحات بعض مفاد پرست لوگوں کے نقصان میں تھیں اس لیے بعض اصحاب پیغمبرؐ نے جن میں آگے آگے حضرت عائشہ، طلحہ، زبیر اور معاویہ تھے۔ خلیفۂ سوم کے خون کو بہانہ بنا کر آپ کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے اور اس طرح انھوں نے شورش، بغاوت اور نافرمانی شروع کر دی۔

حضرت علی علیہ السلام نے اس فتنے کو فرو کرنے کے لیے اُم المومنین عائشہ، طلحہ اور زبیر کے ساتھ بصرہ کے نزدیک جنگ کی جو "جنگِ جمل" کے نام سے مشہور ہے۔ ایک دوسری جنگ معاویہ کے ساتھ عراق اور شام کی سرحد پر لڑی جس کو "جنگِ صفین" کہا جاتا ہے۔ یہ جنگ ڈیڑھ سال تک جاری رہی، اس طرح ایک اور جنگ نہروان کے علاقے میں خوارج کے ساتھ کی جس کو "جنگِ نہروان" کہتے ہیں۔ آپؑ کے زمانۂ خلافت میں زیادہ وقت داخلی شورشوں اور فتنوں کو فرو کرنے میں گزرا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد ماہِ رمضان کی انیس تاریخ کی صبح ۴۰ھ کو مسجد کوفہ میں نماز پڑھتے ہوئے بعض شکست خوردہ خوارج کے ہاتھوں آپ کو سر پر کاری زخم لگا اور آپؑ ۲۱ ماہِ رمضان کی رات کو شہادت پا گئے۔ (مناقب آل ابی طالب، جلد۳، ص ۳۱۲۔ فصول المہمہ، ص ۱۱۳-۱۲۳۔ تذکرۃ الخواص، ص ۱۷۲-۱۸۳)

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام، تاریخی شہادت اور دوست و دشمن کے اعتراف و قول کے مطابق انسانی کمالات میں بالکل بے عیب تھے اور اسی طرح فضائلِ اسلامی میں بھی آپ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تربیت کا بہترین نمونہ تھے۔

آپ کی شخصیت کے بارے میں جو بحثیں ہوئی ہیں اور ان کے متعلق سنّی اور شیعہ حضرات اور دنیا کے محققین نے جس قدر کتابیں لکھی ہیں، کسی اور شخصیت کے بارے میں نہیں لکھی گئی ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام علم و دانش میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب اور تمام مسلمانوں میں سب سے دانا اور عقل مند تھے۔ آپ پہلے مسلمان ہیں جنھوں نے اپنے علمی بیانات میں آزاد عقلی استدلال اور دلیل و برہان کا راستہ کھولا اور معارفِ اسلامی میں فلسفیانہ بحث کو جاری کیا اور قرآن کریم کے باطن کے متعلق موضوعات کو بیان فرمایا۔ ان سب کے علاوہ قرآنی الفاظ کی حفاظت کے لیے آپ نے عربی زبان میں ایک گرامر بھی لکھی۔ آپ فنِ تقریر میں بھی اعلیٰ پایہ کی شخصیت رکھتے تھے (جیسا کہ اس کتاب کے پہلے حصے میں بھی اشارہ کیا گیا ہے)۔

حضرت علی علیہ السلام شجاعت اور بہادری میں ضرب المثل تھے۔ ان تمام جنگوں میں جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں یا آپؐ کے بعد لڑی گئیں آپ نے سب میں شرکت کی اور کبھی خوف و وحشت اور اضطراب آپ کے نزدیک بھی پھٹکنے نہ پائے۔ اگرچہ بارہا ان واقعات و حوادث سے جو جنگِ اُحد، جنگِ حنین، جنگِ خیبر اور جنگِ خندق میں پیش آئے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب پر خوف و ہراس طاری ہو گیا تھا یا ان میں سے بعض منتشر اور فرار ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود آپ نے کبھی دشمن کو پیٹھ نہیں دکھائی اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کفار اور جنگی ناموروں میں سے کوئی آپ کے ساتھ مقابلہ کرے اور زندہ بچ جائے۔ اسی طرح بہادری اور شجاعت

کے باوجود آپ کسی کمزور کو قتل نہیں کرتے تھے اور میدانِ جنگ سے بھاگ جانے والوں کا پیچھا نہیں کرتے تھے اور نہ ہی شب خون مارتے اور نہ ہی دشمن کے لیے پانی بند کرتے تھے۔

یہ امر تاریخی حقائق میں سے ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے جنگِ خیبر میں ایک زبردست حملہ کیا اور قلعے کے دروازے کے حلقے میں ہاتھ ڈال کر ایک جھٹکے کے ساتھ قلعے کا دروازہ اکھاڑ کر دور پھینک دیا تھا۔ (تذکرۃ الخواص، ص ۲۷)

اسی طرح فتح مکہ کے دن جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتوں کو توڑ دینے کا حکم صادر فرمایا تھا تو بت ہبل جو مکہ کے سب سے بڑے بتوں میں شمار ہوتا تھا، بہت بھاری اور بڑے پتھر سے بنا ہوا تھا اور کعبے کے عین اُوپر نصب کیا گیا تھا۔ حضرت علی علیہ السلام، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے آپؐ کے کندھوں پر پاؤں رکھ کر کعبہ کی چھت پر چڑھ گئے اور اب بت ہبل کو وہاں سے اکھاڑ کر نیچے پھینک دیا تھا۔ (تذکرۃ الخواص، ص ۲۷۔ مناقب خوارزمی، ص ۷۱)

حضرت علی علیہ السلام دینی تقویٰ اور خدا تعالیٰ کی عبادت میں بھی یگانۂ روزگار تھے۔ جو لوگ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آ کر حضرت علی علیہ السلام کی تندی اور سختی کی شکایت کیا کرتے تھے۔ آپؐ ان سے فرماتے کہ علیؑ کا گلہ نہ کرو، اور نہ ہی ان کو ملامت اور سرزنش کرو کیونکہ وہ خدا کا عاشق ہے۔ (مناقب آل ابی طالب، جلد۳، ص ۲۲۱۔ مناقب خوارزمی، ص ۹۲)

ابودرداء صحابی نے ایک دفعہ حضرت علی علیہ السلام کی لاش کو مدینہ کے ایک نخلستان میں دیکھا کہ لکڑی کی طرح خشک پڑی ہوئی ہے۔ وہ آپ کے گھر اطلاع دینے آئے اور آپ کی بیوی (حضرت فاطمۃ الزہراءؑ جو پیغمبر اکرمؐ کی پیاری بیٹی تھیں) کے ساتھ افسوس اور تعزیت کا اظہار کیا اور ان کے شوہر کی وفات کی خبر دی۔ پیغمبر اکرمؐ کی بیٹی

نے فرمایا: میرے چچا کا بیٹا مرا نہیں ہے بلکہ عبادت کے دوران خوفِ خدا سے ان پر غشی کی حالت طاری ہوگئی ہے اور اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام کی اپنے ماتحتوں کے ساتھ مہربانی، غریب اور بے چارے لوگوں کے ساتھ ہمدردی، غریبوں اور فقیروں کے ساتھ کرم وسخاوت کی داستانیں زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ آپ کے ہاتھ جو کچھ بھی آتا تھا اس کو خدا کی راہ میں غریبوں اور بے کس لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیتے تھے اور خود بڑی تنگی میں بہت ہی سادہ زندگی گزارتے تھے۔ آپؑ کھیتی باڑی کو بہت ہی پسند کرتے تھے لیکن جس زمین کو آباد کرتے یا جو کاریز بناتے تو اس کو غریبوں اور فقیروں کے لیے وقف کر دیتے تھے۔ آپ کی وقف شدہ ملکیت کو "وقفِ علیؑ" کہا جاتا ہے۔ اور آپ کے آخری زمانے میں اس وقف شدہ ملکیت سے اچھی خاصی آمدنی ہوتی تھی جو تقریباً ۲۴ ہزار دینار (سونے کا سکہ) سالانہ تھی۔ (نہج البلاغہ، حصہ ۳، خطبہ ۲۴)

امام دوم علیہ السلام

امام حسن علیہ السلام اور آپؑ کے چھوٹے بھائی امام حسین علیہ السلام، امیر المومنین علی علیہ السلام کے بیٹے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی حضرت فاطمہ زہراؑ کے بطنِ مبارک سے تھے۔ پیغمبر اکرمؐ نے بارہا فرمایا: "حسنؑ و حسینؑ میرے بیٹے ہیں اور اسی وجہ سے حضرت علیؑ اپنے تمام بیٹوں سے فرمایا کرتے تھے: "تم میرے بیٹے ہو اور حسنؑ و حسینؑ رسولؐ خدا کے بیٹے ہیں"۔ (مناقب ابن شہر آشوب، جلد ۱، ص ۲۱-۲۵۔ ذخائر العقبیٰ، ص ۶۷ اور ۱۲۱)

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی ۳ ہجری قمری کو مدینہ میں ولادت ہوئی۔ انھوں نے سات سال اور کچھ مہینے تک اپنے نانا (رسولؐ خدا) کا زمانہ دیکھا اور آنحضرتؐ کی آغوشِ محبت میں پرورش پائی۔ پیغمبر اکرم کی رحلت کے بعد جو حضرت فاطمہ زہراؑ کی وفات سے تین یا چھ مہینے پہلے ہوئی، آپؑ اپنے والد ماجد کے زیر تربیت آگئے تھے۔

(مناقب ابن شہرآشوب، جلد۴، ص ۲۹۔ دلائل الامامت، تالیف محمد بن جریر طبری، طبع نجف، ۱۳۶۹ھ، ص ۶۰۔ فصول المہمہ، ص ۱۴۴۔ تذکرۃ الخواص، ص ۱۹۳۔ تاریخ یعقوبی، طبع نجف، ۱۳۸۴ھ، جلد۲، ص ۲۰۳۔ اصول کافی، جلد اول، ص ۲۹۱)

حضرت امام حسن مجتبی علیہ السلام اپنے والد گرامی کی شہادت کے بعد خدا کے حکم اور حضرت علی علیہ السلام کی وصیت کے مطابق امامت کے درجے پر فائز ہوئے اور ساتھ ساتھ ظاہری خلافت کے عہدیدار بھی بنے۔ تقریباً چھ ماہ تک آپ مسلمانوں کے خلیفہ رہے اور امور مملکت کا نظم و نسق سنبھالے رہے۔ اسی مدت میں معاویہ جو حضرت علیؑ اور آپؑ کے خاندان کا سخت ترین دشمن تھا اور کئی سال سے خلافت کی حرص و خواہش میں (سب سے پہلے خلیفۂ سوم کے خون کے بدلے کے بہانے اور آخرکار خلافت کا دعویدار ہونے کی وجہ سے) اس نے کئی جنگیں بھی کی تھیں اور کئی بار عراق پر چڑھائی کی تھی جو اس زمانے میں امام حسن علیہ السلام کا دارالخلافہ تھا۔ اس طرح آپؑ سے جنگ شروع کر رکھی تھی۔ دوسری طرف اس نے امام حسن علیہ السلام کے فوجی جرنیلوں اور سپاہیوں کو بہت زیادہ پیسہ اور مستقبل کے جھوٹے وعدے دے کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ اس طرح اس نے ان کو امام حسن علیہ السلام کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر لیا تھا۔ (ارشاد مفید، ص ۱۷۲۔ مناقب ابن شہرآشوب، جلد۴، ص ۳۳۔ فصول المہمہ، ص ۱۴۴)

آخرکار امام حسن علیہ السلام صلح پر مجبور ہو کر اس شرط پر ظاہری خلافت سے دستبردار ہو گئے کہ معاویہ کے مرنے کے بعد خلافت دوبارہ امام حسن علیہ السلام کو واپس مل جائے گی اور اس کے ساتھ ہی ان کے خاندان اور طرف داروں کے لیے کسی قسم کی مشکلات پیش نہ آئیں گی۔ (ارشاد مفید، ص ۱۷۲۔ مناقب ابن شہرآشوب، جلد۴، ص ۳۳۔ الامامت والسیاست، تالیف عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ، جلد اول، ص ۱۶۳۔ فصول المہمہ، ص ۱۴۵۔ تذکرۃ الخواص، ص ۱۹۷)

اس طرح معاویہ نے اسلامی خلافت پر قبضہ کرلیا اور عراق میں داخل ہو کر ایک عام سرکاری تقریر میں صلح کی شرائط کو منسوخ کر دیا۔ اس نے ہر ممکن ذریعے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اہلِ بیتؑ اور ان کے طرفداروں پر سختیاں شروع کر دیں۔ (ارشاد مفید، ص ۱۷۳۔ مناقب ابن شہر آشوب، جلد ۴، ص ۳۵۔ الامامت والسیاست، جلد ۱، ص ۱۶۴)

امام حسن علیہ السلام نے اپنی امامت کے تمام عرصے میں جو کہ دس سال کا تھا، بہت ہی سیاسی گھٹن اور سختی میں زندگی گزاری اور ان کے لیے یا ان کے خاندان، حتیٰ کہ ان کے گھر کے اندر بھی ان کے لیے جائے امن نہ تھی۔ آخر کار ۵۰ھ میں معاویہ کے اُکسانے پر آپ کی بیوی (جعدہ) نے آپ کو زہر دے کر شہید کر دیا۔ (ارشاد مفید، ص ۱۷۴۔ مناقب ابن شہر آشوب، جلد ۴، ص ۴۲۔ فصول المہمہ، ص ۱۴۶۔ تذکرۃ الخواص، ص ۲۱۱)

امام حسن علیہ السلام انسانی کمالات میں اپنے والد گرامی کا کامل نمونہ اور اپنے نانا بزرگوار کی نشانی تھے۔ جب تک پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زندہ رہے، آپؑ اور آپؑ کے بھائی (امام حسینؑ) ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس رہتے تھے اور آنحضرتؐ کبھی کبھی ان کو اپنے کندھوں پر سوار کرلیا کرتے تھے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عام و خاص نے بہت زیادہ احادیث بیان کی ہیں کہ آپؐ نے امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: ”یہ دونوں میرے بیٹے امام ہیں، خواہ وہ اُٹھیں یا بیٹھیں“۔ (ارشاد مفید، ص ۱۸۱۔ اثبات الہداۃ، جلد ۵، ص ۱۲۹ و ۱۳۴)

(کنایہ ہے ظاہری خلافت کے عہدیدار ہونے یا نہ ہونے کا) اور حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی آپ کے والد بزرگوار کی خلافت کے بعد آپ کی جانشینی کے بارے میں بھی بہت زیادہ احادیث موجود ہیں۔

امام سوم علیہ السلام

سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام، حضرت علی علیہ السلام اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی حضرت فاطمہ زہرا کے دوسرے فرزند تھے۔ آپ کی ولادت ۴ ہجری میں ہوئی۔ اپنے بڑے بھائی امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی شہادت کے بعد خدا کے حکم اور دوسرے امامؑ کی وصیت کے مطابق منصب امامت پر فائز ہوئے۔ (ارشاد مفید، ص ۱۷۹۔ اثبات الہداۃ، جلد ۵، ص ۱۶۸،۲۱۴۔ اثبات الوصیہ، تالیف مسعودی، طبع تہران، ۱۳۲۰ھ قمری، ص ۱۲۵)

امام حسین علیہ السلام نے دس سال امامت کی اور اس تمام عرصے میں صرف تقریباً چھ مہینے کی مدت کے علاوہ جو معاویہ کی خلافت کے آخری دنوں میں تھی، بہت ہی سخت حالات اور سیاسی گھٹن کی حالت میں زندگی گزاری، کیونکہ اس زمانے میں دینی اصول وقوانین کی حیثیت ختم ہو چکی تھی اور حکومتی قوانین واحکام، خدا ورسولؐ کے احکام کے جانشین ہو چکے تھے۔ ادھر معاویہ اور اس کے ساتھی اہل بیتؑ اور ان کے پیروکاروں کو ختم ونابود کرنے اور اسی طرح علیؑ اور اہل بیتؑ کا نام مٹانے کے لیے ہر کوشش اور امکان سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ ان سب کے علاوہ معاویہ اپنے بیٹے یزید کی خلافت کو مضبوط بنانے کی کوششوں میں مصروف تھا اور لوگوں کی ایک بڑی جماعت یزید کی بے راہ روی اور بے روئیہ آزادی کی وجہ سے اس سے خوش نہیں تھی۔ ادھر معاویہ اس مخالفت کو روکنے کے لیے ہر قسم کی سختی کر رہا تھا۔

امام حسین علیہ السلام مجبوراً اس تاریک دور میں زندگی گزار رہے تھے اور ہر قسم کی سختیوں، روحانی شکنجوں اور اذیتوں کو جو معاویہ اور اس کے پیروکاروں کی طرف سے آپ پر وارد ہوتی تھیں، برداشت کر رہے تھے یہاں تک کہ ۶۰ ہجری میں معاویہ فوت ہو گیا اور اس کا بیٹا یزید اس کی جگہ بادشاہ بن گیا۔ (ارشاد مفید، ص ۱۸۲۔ تاریخ یعقوبی،

جلد۲،ص ۲۲۶-۲۲۷۔فصول المہمہ، ص ۱۶۳)

بیعت کرنا ایک عربی رسم تھی جو اہم کاموں مثلاً سلطنت اور امارات میں جاری تھی اور ماتحت یا خاص کر مشہور لوگ اپنے سلطان، بادشاہ یا امیر کے ہاتھ پر بیعت کیا کرتے تھے اور اس طرح اپنی وفاداری، اطاعت اور موافقت کا اظہار کرتے تھے۔اور پھر بیعت کے بعد مخالفت کرنا قومی غداری اور شرمساری شمار کی جاتی تھی اور یہ مخالفت ایک قطعی اور مضبوط معاہدے کی خلاف ورزی اور جرم کے مترادف تھی اور پیغمبر اکرم ﷺ کی سیرت میں بھی مجموعی طور پر وہی بیعت قابل قبول ہوتی تھی جو پورے اختیار اور کسی دباؤ کے بغیر ہو، نہ کہ دباؤ کے ذریعے۔

معاویہ نے بھی قوم کے بڑے بڑے اور مشہور لوگوں سے یزید کے لیے بیعت حاصل کر لی تھی لیکن امام حسین علیہ السلام پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈالا گیا تھا یا ان سے بیعت کے لیے نہیں کہا گیا تھا اور نہ ہی یزید کی بیعت امام حسین علیہ السلام کے لیے فرض کی گئی تھی۔ اس نے یزید کو خصوصاً نصیحت اور وصیت کی تھی کہ اگر حسینؑ ابن علی تمھاری بیعت سے انکار کرے تو زیادہ اصرار نہ کرنا اور خاموشی اور چشم پوشی سے کام لینا، کیونکہ وہ اس مسئلے میں کافی تحقیق کر چکا تھا اور کام کے سخت نتائج کو اچھی طرح سے سمجھتا تھا۔(مناقب ابن شہر آشوب، جلد۴،ص ۸۸)

لیکن یزید اپنے غرور و تکبر اور دیدہ دلیری میں اپنے باپ کی نصیحت کو بھول چکا تھا اور اس نے اپنے باپ کی وفات کے فوراً بعد مدینے کے حاکم یا والی کو حکم دیا کہ امام حسین علیہ السلام سے اس کی بیعت لے ورنہ ان کا سر کاٹ کر شام بھیجا جائے۔(مناقب ابن شہر آشوب، جلد۴،ص ۸۸۔ ارشاد مفید، ص ۱۸۲۔ الامامت والسیاست، جلد۱، ص ۲۰۳۔ تاریخ یعقوبی، جلد۲، ص ۲۲۹۔ فصول المہمہ، ص ۱۶۳۔ تذکرۃ الخواص، ص ۲۳۵)

جب مدینے کے حاکم نے مدینہ کی خواہش کو امام حسین علیہ السلام کے سامنے بیان کیا تو امام حسین علیہ السلام نے اس پر غور کرنے کے لیے کچھ مہلت چاہی۔ اس کے بعد راتوں رات اپنے خاندان کے ساتھ مدینہ سے مکہ چلے آئے اور حرم کعبہ اور خانۂ خدا میں جو روایتی پناہ گاہ تھی، پناہ گزین ہو گئے۔

یہ واقعہ ۶۰ ہجری قمری کو ماہ رجب کے آخر یا شعبان کے شروع میں پیش آیا تھا اور امام حسین علیہ السلام چار مہینے تک شہر مکہ پناہ گزین کے طور پر زندگی گزارتے رہے۔ آہستہ آہستہ یہ خبر تمام اسلامی ممالک میں پھیل گئی۔ ایک طرف تو وہ لوگ جو معاویہ کے زمانۂ خلافت میں اس کے ظلم وستم کی وجہ سے ناراض تھے اور پھر یزید کی خلافت نے ان کی ناراضگی میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا، امام حسین علیہ السلام سے ہمدردی کا اظہار کرتے تھے اور دوسری طرف عراق خصوصاً شہر کوفہ سے یکے بعد دیگرے خطوط آ رہے تھے جن میں امام حسین علیہ السلام کو عراق آنے اور ان لوگوں کی قیادت سنبھالنے کی دعوت دی گئی تھی، تاکہ ظلم وستم کو ختم کرنے کے لیے انقلاب برپا کریں، لیکن یہ واقعات یزید اور اس کی حکومت کے لیے سخت خطرہ تھے۔

مکہ معظمہ میں امام حسین علیہ السلام کا قیام جاری تھا، یہاں تک کہ حج کا زمانہ آ گیا اور دنیا کے مسلمان گروہ در گروہ اور جوق در جوق مکہ میں آنا شروع ہو گئے اور حج کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس وقت حضرت امام حسین علیہ السلام کو اطلاع ملی کہ یزیدی لوگوں کی ایک جماعت حاجیوں کی شکل میں مکہ میں داخل ہو گئی ہے، جن کو مامور کیا گیا تھا کہ اپنے احرام کے نیچے ہتھیاروں کے ذریعے فریضۂ حج کے دوران امام حسین علیہ السلام کو شہید کر دیں۔ (ارشاد مفید، ص ۲۰۱)

امام حسین علیہ السلام نے فریضۂ حج کو مختصر طور پر ادا کرتے ہوئے وہاں سے نکل جانے کا فیصلہ کیا۔ آپ نے لوگوں کی ایک جماعت کے سامنے مختصر سی تقریر کرتے ہوئے

عراق کی جانب جانے کی اطلاع دی۔ آپ نے اپنی شہادت کی خبر بھی دی اور اس کے ساتھ ہی مسلمانوں سے مدد کی درخواست بھی کی کہ اس اہم کام میں ان کی مدد کریں اور خدا کی راہ میں اپنا خون بہا دیں (جہاد کریں)۔ اس سے اگلے دن آپ اپنے خاندان اور چند ساتھیوں کے ساتھ عراق کی طرف چل پڑے۔ (مناقب ابن شہر آشوب، جلد۴، ص۸۹)

امام حسین علیہ السلام نے پختہ ارادہ کرلیا تھا کہ ہرگز یزید کی بیعت نہیں کریں گے اور یہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ بیعت سے انکار کرنے کے بعد قتل ہو جائیں گے اور بنی اُمیہ کی دہشت ناک جنگی فوج جو عمومی بدعنوانیوں اور فکری تنزل میں رچی بسی ہوئی ہے حتماً آپ کو شہید کردے گی کیونکہ اس کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے بلکہ وہ ہر یزیدی حکم کی ماننے والی ہے اور پھر اہل عراق بھی اس کے حامی اور مددگار ہیں۔

بعض مشہور و معروف افراد نے خیر خواہی اور ہمدردی کے طور پر آپ کا راستہ روک لیا اور آپ کو اس سفر اور تحریک کے خطرناک نتائج سے آگاہ کیا لیکن آپ نے جواب میں فرمایا: ''میں ہرگز بیعت نہیں کروں گا اور ظالم و ستم گر حکومت کی تائید و تصدیق نہیں کروں گا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جہاں کہیں جاؤں گا یا رہوں گا، مجھے قتل کردیں گے اور چونکہ میں مکہ معظمہ کو خیر باد کہہ رہا ہوں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں ڈر یا خوف سے یہاں سے بھاگ رہا ہوں، بلکہ میرے سامنے خانہ خدا کی حُرمت کا خیال ہے تاکہ میرا خون گرنے سے اس پاک گھر کی توہین اور بے حُرمتی نہ ہو۔ (ارشاد مفید، ص۲۰۱)

امام حسین علیہ السلام کوفہ کی طرف چل پڑے۔ ابھی کوفہ پہنچنے میں چند دنوں کا فاصلہ تھا کہ آپ کو اطلاع ملی کہ کوفہ میں یزید کے حاکم نے آپ کے نمائندے (مسلم بن عقیل) اور ایک دوسرے مشہور آدمی (ہانی بن عروہ) کو جو آپ کا طرفدار تھا، قتل

کر کے ان کے پاؤں میں رسی باندھ کر شہر کے بازاروں اور گلیوں میں پھرایا ہے۔ (ارشاد مفید، ص ۲۰۴۔ فصول المہمہ، ص ۱۷۰۔ مقاتل الطالبین، طبع دوم، ص ۷۳)

شہر اور گردونواح میں پہرے بٹھا دیئے ہیں اور دشمن کی ان گنت فوج آپ کے انتظار میں ہے۔ اس حالت میں شہید ہوجانے کے سوا اور کوئی چارہ یا راستہ ہی نہیں تھا۔ اسی جگہ امام علیہ السلام نے پختہ عزم سے فیصلہ کرلیا اور بلاشک وشبہ اپنے قتل اور شہید ہوجانے کی اطلاع بھی سب کو دے دی تھی، لیکن اس کے باوجود آپ نے اپنا تاریخی سفر جاری رکھا۔ (ارشاد مفید، ۲۰۵۔ فصول المہمہ، ص ۱۷۱۔ مقاتل الطالبین، ص ۷۳)

کوفہ شہر سے تقریباً ۷۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک بیابان تھا جس کو کربلا کہتے تھے۔ یہاں حضرت امام حسین علیہ السلام اور آپ کے ساتھی یزیدی فوج کے محاصرے میں آگئے اور ان کو مجبوراً یہاں آٹھ دن تک ٹھہرنا پڑا۔ محاصرہ ہر روز تنگ ہوتا جا رہا تھا اور ساتھ ہی دشمن کی تعداد بھی بڑھتی جارہی تھی۔ آخرکار حضرت امام حسین علیہ السلام اور آپ کے گنتی کے چند ساتھی یزید کی تیس ہزار فوج کے محاصرے میں آگئے۔ (مناقب ابن شہر آشوب، جلد ۴، ص ۹۸)

ان چند دنوں میں امام حسین علیہ السلام اپنے موقف پر سختی سے ڈٹے رہے اور ساتھ ہی اپنے ساتھیوں اور اصحاب کے بارے میں بھی فیصلہ کیا۔ آپ نے رات کے وقت اپنے ساتھیوں اور ہمراہیوں کو اپنے پاس بلا کر فرمایا:

> "ہمارے سامنے موت اور شہادت کے سوا اور کوئی راستہ نہیں رہا۔ ان لوگوں کو میرے سوا کسی اور کے ساتھ کوئی غرض اور واسطہ نہیں ہے۔ میں تم سے اپنی بیعت واپس لیتا ہوں۔ تم میں سے جو شخص بھی چاہے رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر اس خطرناک بھنور سے اپنی جان بچا سکتا ہے"۔

اس کے بعد آپؑ کے حکم سے بتیاں بجھا دی گئیں۔ بہت سے لوگ جو دنیاوی مقاصد کے پیش نظر آپؑ کے ساتھ تھے، منتشر ہو کر واپس چلے گئے اور حق کے عاشقوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کے علاوہ (جن کی تعداد چالیس کے لگ بھگ تھی اور امام حسین علیہ السلام کے خاص اصحاب پر مشتمل تھی) اور بنی ہاشم خاندان ۔ کے چند افراد کے سوا اور کوئی نہ رہا۔

امام علیہ السلام نے دوسری بار اپنے خاندان کے افراد کو بلایا اور ان کا امتحان لیتے ہوئے فرمایا:

> ''دشمن صرف میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔تم میں سے جو بھی چاہے رات کی تاریکی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس مہلک خطرے سے اپنی جان بچالے''۔

لیکن اس دفعہ امام علیہ السلام کے وفادار اصحاب نے مختلف بیانات میں جواب دیئے:

> ''ہم ہرگز حق کے اس راستے سے منہ نہیں پھیریں گے جس کے آپؑ امام اور رہبر ہیں۔ہم ہرگز آپؑ کے دامنِ پاک کو نہیں چھوڑیں گے اور جب تک ہمارے بدنوں میں خون کی آخری رمق باقی ہے اور ہمارے ہاتھوں میں تلوار موجود ہے، ہم آپ کی حفاظت کریں گے''۔ (مناقب ابن شہرآشوب، جلد۴، ص۹۹۔ ارشاد مفید، ص۲۱۴)

دشمن کی طرف سے نویں محرم کو امام حسین علیہ السلام کو ''بیعت یا جنگ'' کا آخری انتباہ دیا گیا۔امام حسین علیہ السلام نے عبادت کے لیے ایک رات کی مہلت مانگی اور آنے والے کل کی جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ (مناقب ابن شہرآشوب، جلد۴، ص۹۸۔ ارشاد مفید، ص۲۱۴)

دسویں محرم الحرام ۶۱ھ کو امام حسین علیہ السلام اپنی بہت ہی قلیل تعداد کے ساتھ (جو تقریباً ۹۰ سے کم افراد پر مشتمل تھی اور ان میں سے چالیس افراد آپ کے سابقہ اصحاب اور ساتھی تھے اور تقریباً ۳۰ افراد دن رات کی جنگ میں دشمن کی فوج سے امام حسین علیہ السلام کے ساتھ مل گئے تھے اور باقی سب آپ کے ہاشمی رشتے دار، بیٹے بیٹیاں، بھائی بہنیں، بھتیجے بھتیجیاں، بھانجے بھانجیاں اور چچازاد بھائی بہن شامل تھے، دشمن کے بے انتہا لشکر کے سامنے صف آرا ہو گئے اور اس طرح جنگ شروع ہو گئی۔

اس دن صبح سے لے کر شام تک جنگ جاری رہی۔ امامؑ، تمام ہاشمی جوان اور ان کے باوفا اور جاں نثار اصحاب یکے بعد دیگرے سب شہید ہو گئے (شہید ہونے والوں میں امام حسن علیہ السلام کے دو چھوٹے کمسن بچے، امام حسین علیہ السلام کا ایک چھوٹا اور ایک شیر خوار بچہ بھی شامل تھے)۔ (بحار الانوار، طبع کمپانی، جلد ۱۰، ص ۲۰۰، ۲۰۲-۲۰۳)

دشمن کی فوج نے جنگ کے بعد امام حسین علیہ السلام کے حرم کو لوٹ لیا اور خیموں کو آگ لگا دی۔ اس کے بعد شہیدوں کے سروں کو ان کے جسموں سے الگ کر کے لاشوں کو بے گور و کفن اِدھر اُدھر پھینک دیا۔ پھر اہل حرم نے جو کہ سبھی بے آسرا و بے وارث مستورات اور بچیاں تھیں، شہیدوں کے ساتھ کوفہ کی طرف کوچ کیا۔ (قیدیوں میں مرد بہت کم تھے۔ ان میں امام حسین علیہ السلام کے بائیس سالہ فرزند امام زین العابدینؑ جو سخت بیمار تھے یعنی شیعوں کے چوتھے امامؑ اور ان کے چار سالہ فرزند محمدؐ بن علیؑ (امام باقر علیہ السلام) جو بعد میں پانچویں امام ہوئے۔ امام حسن علیہ السلام کے بیٹے حسن مثنیٰ (جو کہ امام حسین علیہ السلام کے داماد بھی تھے، ان کو جنگ میں کاری زخم آئے تھے اور شہیدوں کے درمیان پڑے ہوئے تھے، ان کو وہاں سے اُٹھا کر قیدی بنا لیا تھا۔ ایک سپہ سالار کی سفارش سے ان کی جان بخشی کی گئی تھی) قیدیوں کے ساتھ کوفہ کی طرف لے گئے۔ پھر کوفہ سے دمشق لے جا کر یزید کے دربار میں ان کو حاضر کیا گیا۔

واقعۂ کربلا، اہلِ بیتؑ کی عورتوں اور لڑکیوں کو شہر بہ شہر پھرانے اور امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی بیٹی حضرت زینب سلام اللہ علیہا اور امام زین العابدین علیہ السلام کی تقاریر نے (جو انھوں نے کوفہ اور شام میں کی تھیں، بنواُمیہ کی حکومت کو ہلا کر رکھ دیا اور ذلیل وخوار کر دیا اور معاویہ کے پروپیگنڈوں کا اثر زائل کر دیا۔ بلکہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ یزید نے بھی سب کے سامنے اپنے جرنیلوں اور ماموروں کے عمل سے بیزاری اور نفرت کا اظہار شروع کر دیا۔ کربلا کا واقعہ ایک اہم عنصر تھا جس کے فوری اثر نے بنی اُمیہ کی حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا اور مذہب شیعہ کی بنیاد بہت مضبوط ہوگئی۔ اس واقعہ کا فوری اثر یہ ہوا کہ انقلاب اور شورشیں شروع ہوگئیں اور ساتھ ہی خونریز جنگوں کا ایک طویل سلسلہ بھی شروع ہوگیا جو بارہ سال تک جاری رہا۔ جن لوگوں نے امام حسین علیہ السلام کے قتل میں شرکت کی تھی ان میں سے ایک شخص بھی انتقام سے نہ بچ سکا۔

جو شخص امام حسین علیہ السلام کی زندگی، یزید کی حکومت کی تاریخ اور اس زمانے کے حالات و واقعات پر غور کرے اور تاریخ کے اس حصے میں تحقیق کرے اس کے لیے کوئی شک و شبہ نہیں رہے گا کہ اس وقت امام حسین علیہ السلام کے سامنے صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ تھا شہادت کا راستہ۔ یزید کی بیعت کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اعلانیہ طور پر اسلام کے اصولوں کو پامال اور قربان کر دیا جائے اور یہ چیز امام حسین علیہ السلام کے لیے ہرگز قابلِ قبول نہ تھی کیونکہ یزید نہ صرف دین مقدس اسلام اور اس کے اصولوں کا کوئی احترام نہ کرتا تھا اور نہ ہی اسلامی اصولوں کا پابند تھا بلکہ اسلام کے قوانین اور اصولوں کو پامال کرنے میں بھی بے باکانہ اور بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔

اس کے برخلاف اس سے پہلے حکمران اگرچہ اصولوں کی مخالفت کیا کرتے تھے مگر جو کچھ بھی کرتے دین کے پردے میں انجام دیتے تھے۔ دینی اُمور کو ظاہری طور پر محترم شمار کیا کرتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب ہونے کے

لحاظ سے تمام دینی بزرگوں پر فخر کیا کرتے تھے جن کو عوام مانتے تھے۔

جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ دونوں امام (امام حسن و امام حسین علیہم السلام) مختلف نظریات رکھتے تھے یعنی امام حسن علیہ السلام صلح پسند تھے اور امام حسین علیہ السلام جنگ اور جہاد کو ترجیح دیتے تھے۔ جیسا کہ ایک بھائی چالیس ہزار جنگی سپاہی رکھتے ہوئے بھی معاویہ کے ساتھ صلح کر لیتا ہے اور دوسرے بھائی صرف چالیس افراد کے ساتھ یزید کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیتا ہے، یہ بات بالکل بے جا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ یہی امام حسین علیہ السلام جو ایک دن یزید کی بیعت پر آمادہ نہ ہوئے تھے، اپنے بھائی امام حسن علیہ السلام کی طرح دس سال تک معاویہ کی حکومت میں زندگی گزارتے رہے (کہ وہ بھی دس سال تک معاویہ کی حکومت میں زندگی گزارتے رہے تھے) اور انھوں نے ہرگز مخالفت نہ کی تھی، کیونکہ اگر اس وقت امام حسنؑ اور امام حسینؑ معاویہ کے خلاف جنگ کرتے تو اس میں شک نہیں کہ شہید ہو جاتے مگر اسلام کو کوئی فائدہ نہ پہنچتا۔ اس لیے کہ معاویہ کی بظاہر حق بجانب سیاست کے مقابلے میں جو اپنے آپ کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صحابی، کاتب وحی اور خال المومنین کے طور پر تعارف کراتا تھا لیکن دوسری طرف کسی قسم کے فریب سے بھی نہیں چوکتا تھا، اور بالکل کوئی اثر نہ ہوتا۔

اس کے علاوہ معاویہ اپنے کارندوں کے ذریعے ان دونوں اماموں کو قتل کروا سکتا تھا، اور پھر ان کی سوگواری اور تعزیت کرتے ہوئے ان کا ظاہری انتقام لینے پر بھی آمادہ ہو جاتا، جیسا کہ اس نے خلیفۂ سوم کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا تھا۔

امام چہارم علیہ السلام

امام سجاد علیہ السلام (علیؑ بن حسینؑ، جن کے القاب زین العابدینؑ اور سجادؑ تھے) چوتھے امام ہیں۔ آپؑ تیسرے امام (امام حسینؑ) کے فرزند تھے اور ایرانی شہنشاہ

یزدجرد کی بیٹی شہربانو کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ آپؑ امام سوم کے اکیلے فرزند تھے جو واقعہ کربلا میں زندہ بچ گئے تھے کیونکہ آپؑ کے تین بھائی اس جانگداز واقعہ میں شہید ہو گئے تھے۔ (مقاتل الطالبین، ص ۵۲ و ۵۹)

آپؑ بھی اپنے والد کے ساتھ کربلا میں تشریف لائے تھے لیکن چونکہ سخت بیمار تھے اور ہتھیار اُٹھانے اور جنگ میں شرکت کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے اسی لیے جہاد اور شہادت میں پیچھے رہ گئے تھے اور حرم کے قیدیوں کے ساتھ شام بھیج دیے گئے۔

قید کا زمانہ گزارنے کے بعد یزید کے حکم سے عوامی مخالفت کو نرم کرنے کے لیے آپؑ کو احترام کے ساتھ مدینے بھیج دیا گیا تھا مگر دوبارہ آپؑ کو اُموی خلیفہ عبدالملک کے حکم سے پابہ زنجیر مدینہ سے شام لایا گیا لیکن کچھ عرصہ بعد پھر واپس مدینہ تشریف لے آئے۔ (تذکرۃ الخواص، ص ۳۲۴۔ اثبات الہداۃ، جلد ۵، ص ۲۴۳)

امام چہارم علیہ السلام مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد اپنے گھر میں گوشہ نشین ہو گئے اور اپنے گھر کے دروازے تمام لوگوں پر بند کر کے خدا کی عبادت میں مشغول ہو گئے اور اپنے خاص شیعوں مثلاً ابوحمزہ ثمالی، ابوخالد کابلی اور ایسے ہی چند دوسرے افراد کے سوا کسی اور سے نہیں ملتے تھے۔ البتہ یہ خاص لوگ اپنے امام سے جو تعلیمات حاصل کرتے، آپؑ کے پیروکاروں تک پہنچا دیتے تھے اور اس طرح مذہب شیعہ روز بروز ترقی کرتا گیا جس کے بیشتر اثرات پانچویں امام علیہ السلام کے زمانے میں رونما ہوئے۔

چوتھے امام علیہ السلام کی دعاؤں کی ایک کتاب "صحیفہ کاملہ سجادیہ" کے نام سے مشہور ہے اور یہ ستاون (۵۷) دعاؤں پر مشتمل ہے جن میں بہت ہی گہرے اسرار و معارف الٰہی پوشیدہ ہیں اور اسی مجموعے کو "زبور آل محمدؐ" بھی کہا جاتا ہے۔

امام چہارم علیہ السلام کو پینتیس سال کی امامت کے بعد شیعوں کی بعض احادیث

کے مطابق اُموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے ایما پر ولید بن عبدالملک نے زہر دے دیا تھا اور آپ ۹۵ ہجری میں وفات پا گئے۔

امام پنجم علیہ السلام

حضرت امام محمد بن علی (باقر) علیہ السلام پانچویں امام ہیں۔ باقر کے معنی ہیں چیر نے پھاڑنے والا، یعنی علم کو چیر کر تحقیق کرنے والا، اور یہ لقب آپؑ کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے عطا ہوا تھا۔[1]

آپؑ چوتھے امامؑ کے بیٹے ہیں اور ۵۷ھ میں پیدا ہوئے۔ واقعہ کربلا میں آپ کی عمر چار سال تھی۔ اس جنگ میں آپؑ موجود تھے۔ آپؑ اپنے والد ماجد کے بعد خدا کے حکم اور اپنے آباء واجداد کے تعارف سے منصب امامت پر فائز ہوئے اور ۱۱۴ھ یا ۱۱۷ھ میں (شیعہ اقوال و روایات کے مطابق) ابراہیم بن ولید بن عبدالملک اُموی خلیفے کے بھتیجے نے آپ کو زہر دے کر شہید کر دیا۔ (اصول کافی، جلد۱، ص ۴۶۹۔ ارشاد مفید، ص ۲۴۵۔ فصول المہمہ، ص ۲۰۲-۲۰۳۔ تاریخ یعقوبی، جلد ۳، ص ۶۳۔ تذکرۃ الخواص، ص ۳۴۰۔ دلائل امامت، ص ۹۴۔ مناقب ابن شہر آشوب، جلد ۴، ص ۲۱۰)

پانچویں امام علیہ السلام کے زمانۂ امامت میں ایک طرف تو بنی اُمیہ کے مظالم کی وجہ سے اسلامی ممالک میں ہر روز انقلاب اور جنگیں رُونما ہوتی رہتی تھیں اور دوسری طرف خود اُموی خاندان میں اختلاف پیدا ہو رہے تھے اور ان مشکلات نے خلافت اور

---

[1] شیعہ مذہب کی احادیث، روایات اور اعتقادات کے مطابق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زندگی میں ہی بارہ اماموں کے نام معین کر دیئے تھے اور ہر امامؑ کا لقب بھی دے دیا تھا۔ آپؐ نے فرمایا تھا کہ میری پشت کے پانچویں امام کا نام میرے نام پر محمد ہوگا اور اس کا لقب باقر ہوگا (مترجم)۔ (ارشاد مفید، ص ۲۴۶۔ فصول المہمہ، ص ۱۹۳۔ مناقب شہر آشوب، جلد ۴، ص ۱۹۷)

حکومت کو اپنی طرف مشغول کر رکھا تھا۔ اس طرح ایک حد تک وہ اہل بیتؑ پر ظلم کرنے سے باز رہے۔

دوسری طرف واقعۂ کربلا اور اہل بیتؑ کی مظلومیت جس کی مثال امام چہارم تھے، ایسے اُمور تھے جو مسلمانوں کو اہل بیتؑ کا گرویدہ بنا رہے تھے۔ ان حالات و عوامل کی وجہ سے عوام اور خصوصاً شیعہ ایک سیلاب کی مانند پانچویں امامؑ کے پاس مدینہ منورہ میں پہنچ کر اسلامی حقائق اور تعلیمات اہل بیتؑ حاصل کرنے میں پیش پیش تھے اور آپؑ کے پاس لوگوں کا اس قدر مجمع لگا رہتا تھا کہ آپ سے پہلے آئمہ اہل بیتؑ کو ایسا موقع میسر نہ آسکا تھا۔ اس دعوے کا ثبوت وہ بے شمار احادیث و روایات ہیں جو پانچویں امامؑ سے نقل اور روایت ہوئی ہیں۔ آپ کے بہت زیادہ اصحاب شیعہ دانشمند اور رجال علم تھے جو آپؑ سے مختلف علوم میں فیضیاب ہوئے اور آپ کے معارف اسلامی کے کتب میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور ان کے نام آج بھی فہرستوں اور علمِ رجال کی کتابوں میں درج ہیں۔ (ارشاد مفید، ص ۲۴۵-۲۵۳۔ دیکھئے کتاب رجال کشی، تالیف محمد بن عمر بن عبدالعزیز اور کتاب رجال الطوسی، تالیف محمد بن حسن طوسی، کتاب فہرست طوسی اور دوسری کتب رجال)

امام ششم علیہ السلام

امام جعفر بن محمد (صادق) علیہ السلام پانچویں امامؑ کے فرزند ہیں جو ۸۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۴۸ھ میں (شیعہ روایات واقوال کے مطابق) عباسی خلیفہ منصور کے ایماء پر ان کو زہر دے کر شہید کر دیا گیا۔ (اصول کافی، جلد۱، ص ۴۷۲۔ دلائل الامامۃ، ص ۱۱۱۔ ارشاد مفید، ص ۲۵۴۔ تاریخ یعقوبی، جلد۳، ص ۱۱۹۔ فصول المہمہ، ص ۲۱۲۔ تذکرۃ الخواص، ص ۳۴۶۔ مناقب ابن شہر آشوب، جلد۴، ص ۲۸۰)

چھٹے امام علیہ السلام کے عہد خلافت میں اسلامی ممالک میں انقلابات کی وجہ سے اور

خاص کردہ تحریک جو مسودہ (1) (سیاہ پوشوں) نے بنواُمیہ کی خلافت کو ختم کرنے کے لیے چلائی تھی اور وہ خونریز جنگیں جو بنواُمیہ کی خلافت کو ختم کرنے کا باعث ہوئیں اور جن کی وجہ سے پانچویں امام علیہ السلام کو اپنے بیس سالہ عہد امامت میں اسلامی حقائق بیان کرنے اور اہلِ بیتؑ کی تعلیمات کو عام کرنے کا بہترین موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ امام ششم کے لیے بہت ہی مناسب ماحول پیدا ہو گیا تھا تاکہ دینی تعلیمات کی بہترین طریقے سے تبلیغ کر سکیں۔

آپؑ نے اپنی امامت کے آخری زمانے تک جو بنواُمیہ کی خلافت کے خاتمے اور بنوعباس کی خلافت کے آغاز کا زمانہ تھا، اس فرصت سے خوب فائدہ اُٹھایا اور دینی تعلیم و تبلیغ میں مشغول رہے۔ آپؑ نے مختلف عقلی و نقلی علوم وفنون میں بہت زیادہ دینی اور علمی شخصیتیں پیدا کیں مثلاً زرارہ، محمد بن مسلم، مومن طاق، ہشام بن حکم، ابان بن تغلب، ہشام بن سالم، حریز، ہشام کلبی نسابہ، جابر بن حیان صوفی، شیمیائی وغیرہ، جن کو آپؑ نے فیضیاب کیا اور حتیٰ کہ عام علمی دانشوروں مثلاً سفیان ثوری، امام ابوحنیفہ (حنفی مذہب کے بانی)، قاضی سکونی، قاضی ابوالبختری وغیرہ کو بھی آپ کی شاگردی کا فخر حاصل رہا ہے (مشہور ہے کہ امام ششم علیہ السلام کے مکتبِ علم اور محفلِ درس سے چار ہزار دانشور، محدث پیدا ہوئے)۔

وہ احادیث جو "صادقین" یعنی امام پنجم اور امام ششم سے نقل ہوئی ہیں وہ ان تمام احادیث کے برابر ہیں جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دوسرے دس آئمہ علیہم السلام سے نقل ہوئی ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ ہیں۔ لیکن اپنے آخری دور میں عباسی خلیفہ

---

(1) بنواُمیہ کی خلافت کے خلاف ایران کے صوبہ خراسان سے ایک تحریک اُٹھی جس کی قیادت ابومسلم خراسانی نے کی۔ ابومسلم خراسانی کے پیروکار سیاہ لباس پہنتے تھے اور مسودہ یا اسود کے معنی "کالے" کے ہیں، لہٰذا ان کو سیاہ پوش فوج کے نام سے پکارا گیا۔ تاریخ ایران میں (سیاہ جامگان) کہا جاتا ہے اور یہ تحریک بنواُمیہ کے خاتم اور بنوعباسی خلافت کی طرفدار تھی۔ (مترجم)

منصور کے مظالم سے دوچار ہو گئے تھے۔ آپؑ پر پابندی اور نظر بندی عائد کردی گئی، آپؑ کو آزار و شکنجے بھی دیئے گئے اور اس کے ساتھ ہی علوی سادات کا اس قدر قتلِ عام کیا گیا کہ بنی اُمیہ اپنی سفاکی اور ظلم و ستم کے باوجود اس حد تک نہ پہنچے تھے۔ خلیفہ عباسی منصور کے حکم سے ان کے پیروکاروں کو گروہ در گروہ پکڑ کر جیلوں اور کال کوٹھڑیوں میں بند کر دیا جاتا تھا اور ان کو بے دریغ شکنجوں اور اذیت کے ساتھ قتل کر دیا جاتا تھا۔ بعض لوگوں کی گردن اُڑا دی جاتی تھی، بعض کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا اور بعض کو زندہ عمارتوں کی دیواروں میں چنوا دیا جاتا تھا۔

عباسی خلیفہ منصور نے چھٹے امام علیہ السلام کو گرفتار کرنے کے لیے حکم جاری کیا (امام ششم اس سے پہلے بھی ایک بار عباسی خلیفہ سفاح کے حکم سے گرفتار کر کے عراق بھیجے گئے تھے اور اس سے پہلے پانچویں امام کی زندگی میں اُموی خلیفہ ہشام کے حکم سے آپ کو دمشق میں گرفتار کیا گیا تھا)۔

امام علیہ السلام مدت تک نظر بند رہے اور کئی بار آپؑ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا اور آپؑ کی توہین کی گئی لیکن آخرکار آپؑ کو مدینہ جانے کی اجازت دے دی گئی۔ امام علیہ السلام واپس مدینہ تشریف لے گئے اور باقی تمام عمر خاموشی سے گوشہ نشینی اور عزلت میں گزار دی، یہاں تک کہ منصور کی چال بازی سے آپ کو زہر دے کر شہید کر دیا گیا۔ (فصول المہمہ، ص ۲۱۲۔ دلائل امامت، ص ۱۱۱۔ اثبات الوصایہ، ص ۱۴۲)

چھٹے امام علیہ السلام کی شہادت کی خبر سنتے ہی عباسی خلیفہ منصور نے مدینہ کے والی کو حکم دیا کہ آپؑ کے وارثوں پر مہربانی کے بہانے امام علیہ السلام کے گھر جائے اور آپؑ کے وصیت نامے کو لے کر پڑھے اور جس کسی کو آپ کا وصی یا جانشین بنایا گیا ہو اس کی فوراً گردن اُتار دی جائے۔ البتہ اس حکم سے منصور کا مطلب یہ تھا کہ امامت کے سلسلے کو ختم کر دیا جائے اور شیعہ مذہب کی آواز کو مکمل طور پر خاموش کر دیا جائے۔ لیکن اس کی

سازش کے برعکس جب مدینہ کے حاکم نے وصیت نامہ پڑھا تو دیکھا کہ امام علیہ السلام نے پانچ افراد کو اپنا جانشین مقرر کیا ہے: یعنی ① خود خلیفہ (منصور عباسی) ② مدینے کا والی ③ عبداللہ افطح، امام کے بڑے فرزند، ④ موسیٰ، امام کے چھوٹے فرزند، ⑤ حمیدہ۔[1] اس طرح منصور کا سارا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ (اصول کافی، جلد اول، ص ۳۱۰)

امام ہفتم علیہ السلام

امام موسیٰ بن جعفر (کاظم) علیہ السلام، چھٹے امام کے بیٹے ہیں جن کی ۱۲۸ ہجری میں ولادت ہوئی اور ۱۸۳ ہجری میں آپؑ کو قید خانے میں زہر دے کر شہید کر دیا گیا۔ (اصول کافی، جلد ۱، ص ۴۷۶۔ ارشاد مفید، ص ۲۷۰۔ فصول المہمہ، ص ۲۱۳-۲۲۳۔ دلائل امامت، ص ۱۴۶-۱۴۸۔ تذکرۃ الخواص، ص ۳۴۸-۳۵۰۔ مناقب ابن شہر آشوب، جلد ۴، ص ۳۲۳۔ تاریخ یعقوبی، جلد ۳، ص ۱۵۰)

آپؑ اپنے والد بزرگوار کی شہادت کے بعد خدا کے حکم اور آباء و اجداد کے تعارف سے امامت کے منصب پر فائز ہوئے۔ ساتویں امامؑ، عباسی خلفاء منصور، ہادی، مہدی اور ہارون کے ہم عصر تھے۔ آپؑ بہت ہی تاریک اور مشکل دور میں خاموشی کے ساتھ (سخت تقیہ کی حالت میں) بہت کٹھن زندگی گزارتے رہے۔ آخرکار جب ہارون الرشید حج کے لیے مدینہ گیا تو اس کے حکم سے امام ہفتم علیہ السلام کو اس وقت گرفتار کر لیا گیا جب آپؑ مسجد نبویؐ کے اندر نماز میں مشغول تھے۔ آپؑ کو زنجیروں میں جکڑ کر قید میں ڈال دیا گیا اور پھر مدینہ سے بصرہ اور بصرہ سے بغداد لے جایا گیا۔ اس طرح آپؑ کو کئی سال تک قید میں رکھا گیا۔ اس کے ساتھ ہی آپؑ کو ایک

---

[1] (حمیدہ بربریہ: حضرت امام رضاؑ کی والدہ ماجدہ اور حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کی بیوی کا نام ہے (لغت نامہ دہخدا)۔

قید خانے سے دوسرے قید خانے میں منتقل کرتے رہتے تھے۔ آخرکار بغداد کے قید خانے میں سندی بن شاہک ملعون نے آپ کو زہر دے کر شہید کردیا۔ آپ "مقابر قریش" میں جو اس وقت کاظمیہ (عراق) میں واقع ہے دفن کیے گئے۔ (ارشاد مفید، ص ۲۷۹-۲۸۳۔ دلائل الامامت، ص ۱۴۸-۱۵۴۔ فصول المہمہ، ص ۲۲۲۔ مناقب ابن شہر آشوب، جلد ۴، ص ۳۲۳-۳۲۷۔ تاریخ یعقوبی، جلد ۳، ص ۱۵۰)

امام ہشتم علیہ السلام

حضرت امام علی بن موسیٰ (رضا) علیہ السلام، ساتویں امامؑ کے بیٹے ہیں (مشہور تواریخ کے حوالے سے) ۱۴۸ ہجری میں آپ کی ولادت ہوئی اور ۲۰۳ ہجری میں شہادت ہوئی۔ (اصول کافی، جلد ۱، ص ۴۸۶۔ ارشاد مفید، ص ۲۸۴-۲۹۶۔ دلائل الامامت، ص ۱۷۵-۱۷۷۔ فصول المہمہ، ص ۲۲۵-۲۲۶۔ تاریخ یعقوبی، جلد ۳، ص ۱۵۰)

- امام ہشتم علیہ السلام اپنے والد ماجد کی شہادت کے بعد خدا کے حکم اور اپنے بزرگوں کے تعارف سے عہدۂ امامت پر فائز ہوئے۔ اپنی امامت کا کچھ حصہ ہارون الرشید عباسی خلیفہ کے زمانے میں گزارا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے امین عباسی اور پھر مامون عباسی کے ہم عصر بھی رہے۔

ہارون الرشید کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں مامون اور امین میں اختلافات پیدا ہوگئے جس کے نتیجے میں خونریز جنگیں شروع ہوگئیں اور آخرکار امین مارا گیا اور مامون نے خلافت پر قبضہ کرلیا۔ (اصول کافی، جلد ۱، ص ۴۸۸۔ فصول المہمہ، ص ۲۳۷)

اس وقت تک علوی سادات کے لیے بنوعباس کی سیاست بڑی سخت اور خونی تھی جو کہ روز بروز سخت تر ہوتی جارہی تھی اور جب بھی علویوں میں سے کوئی شخص اپنی تحریک شروع کرتا تو خونریز جنگوں کا ایک سلسلہ شروع ہوجاتا تھا اور یہ امر خلافت کے لیے سخت مشکلات پیدا کردیتا تھا۔

اگرچہ اہلِ بیتؑ کے شیعہ رہنما اور امامؑ اس زمانے تک تحریک اور انقلاب شروع کرنے والوں کے ساتھ تعاون اور مداخلت نہیں کیا کرتے تھے لیکن شیعہ جن کی تعداد اس زمانے میں بھی قابلِ توجہ تھی ہمیشہ اہلِ بیتؑ کے آئمہ کو اپنا دینی رہنما اور واجب الاطاعت جانتے تھے اور ان کو ہی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقیقی خلفاء مانتے تھے کیونکہ خلافت اور دارالخلافہ قیصر و کسریٰ کے درباروں کا نمونہ بن چکے تھے اور ایک لاابالی عیاش گروہ کے ذریعے ملکی امور انجام پاتے تھے۔ شیعہ ان حکومتوں کو ناپاک اور اپنے آئمہؑ کی شان کے خلاف جانتے تھے۔ لہٰذا اس حالت کا جاری رہنا اور ترقی کرنا بھی حکومت اور خلافت کے لیے سخت خطرناک تھا اور یہ خطرہ ہمیشہ درپیش تھا۔

مامون نے سوچا کہ ان مشکلات کو اس کے آباء و اجداد کی ستر سالہ پرانی سیاست حل نہ کر سکی تھی، لہٰذا وہ چاہتا تھا کہ ایک نئی سیاسی چال کے ذریعے ان مشکلات کو ختم کر دے اور وہ یہ تھی کہ امام ہشتمؑ کو اپنا ولی عہد (جانشین) بنا لے اور اس طرح آئندہ کے لیے ہر ایسی مشکل کا حل تلاش کر لے، کیونکہ جب علوی سادات اپنے آپ کو خلافت کا حصہ دار سمجھ لیں گے، اس کے علاوہ شیعہ بھی اپنے امامؑ کو خلافت کا جانشین دیکھ لیں گے جس کو وہ ہمیشہ ناپاک اور پلید کہتے آئے ہیں تو اس وقت وہ معنوی اخلاص و ارادات جو وہ آئمہ اہلِ بیتؑ کے بارے میں رکھتے ہیں، آہستہ آہستہ زائل ہو جائے گی اور اس طرح ان کے مذہبی عقائد بھی مٹ جائیں گے اور اس کے ساتھ ہی وہ خطرہ بھی خود بخود مٹ جائے گا جو ان کو خلافت اور سیاست سے رہتا ہے۔ (دلائل الامامت، ص ۱۹۷۔ مناقب ابن شہر آشوب، جلد ۴، ص ۳۶۳)

ظاہر ہے کہ اصل مقصد حاصل ہو جانے کے بعد مامون کے لیے امام علیہ السلام کو ختم کر دینا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ مامون نے اپنے اس فیصلے اور عزم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے امام علیہ السلام کو مدینہ سے مرو میں بلایا۔ سب سے پہلے آپؑ کو خلافت کی اور

اس کے بعد جانشینی کی پیشکش کی لیکن آپ نے مختلف طریقوں سے معذرت کر کے اس پیشکش کو قبول نہ کیا۔ لیکن آخرکار مامون نے بڑے اصرار سے جانشینی پر آپ کو راضی کرلیا اور امامؑ نے بھی مجبوراً اس شرط پر یہ عہدہ قبول کرلیا کہ حکومت کے کاروبار یا کسی کو منصب دینے یا معزول کرنے میں کوئی مداخلت نہیں کریں گے۔ (اصول کافی، جلد۱، ص ۴۸۹۔ ارشاد مفید، ص ۲۹۰۔ فصول المہمہ، ص ۲۳۷۔ تذکرۃ الخواص، ص ۳۵۲۔ مناقب ابن شہر آشوب، جلد۴، ص ۳۶۳)

یہ واقعہ ۲۰۰ ہجری میں پیش آیا مگر تھوڑے ہی عرصے بعد مامون کو شیعوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور ترقی اور اپنے امامؑ سے بہت زیادہ محبت اور عوام کے استقبال، حتیٰ کہ خود اس کے سپاہیوں اور اعلیٰ عہدیداروں کی توجہ امامؑ کی طرف زیادہ ہو جانے سے اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور وہ اس کا سدِ باب کرنے پر آمادہ ہوا۔ اسی وجہ سے اس نے آپؑ کو زہر دلوا کر شہید کروا دیا۔ شہادت کے بعد امام ہشتمؑ کو ایران کے شہر طوس میں جس کو اب مشہد کہتے ہیں دفن کیا گیا۔

مامون الرشید عقلی علوم کی طرف بہت زیادہ مائل تھا اور اس سلسلے میں علومِ عقلی کے عربی میں ترجمے کرائے۔ وہ علمی مجالس بھی منعقد کیا کرتا تھا جن میں مختلف مذاہب کے علما اور دانشور جمع ہوتے تھے۔ اس طرح وہاں علمی مناظرے ہوا کرتے تھے۔ امام ہشتمؑ بھی ان مجالس میں شرکت کیا کرتے تھے اور دوسرے مذاہب کے علما کے ساتھ بحث و مباحثہ کیا کرتے تھے۔ ان مجالس اور مناظروں کو بہت زیادہ شیعہ احادیث میں نقل کیا گیا ہے۔ (مناقب ابن شہر آشوب، جلد۴، ص ۳۵۱۔ کتاب احتجاج، تالیف احمد بن علی بن ابی طالبؑ الطبرسی، طبع نجف ۱۳۸۵ھ، جلد۲، ص ۱۷۰-۲۳۷)

امام نہم علیہ السلام

حضرت امام محمد بن علی علیہ السلام (جن کا لقب تقی یا امام جواد اور کہیں ابن الرضا بھی

ملتا ہے) آٹھویں امامؑ کے فرزند ہیں جن کی ۱۹۵ھ میں مدینہ میں ولادت ہوئی۔ شیعہ روایات کے مطابق ۲۲۰ھ میں عباسی خلیفہ معتصم کے ایماء پر آپؑ کی بیوی نے جو عباسی خلیفہ مامون کی بیٹی تھی، آپ کو زہر دے کر شہید کیا۔ آپؑ اپنے جدامجد امام ہفتم کے پہلو میں کاظمیہ (عراق) میں مدفون ہیں۔

آپؑ اپنے والد ماجد کے بعد خدا کے حکم اور بزرگوں کے تعارف سے امامت کے منصب پر فائز ہوئے۔ امام نہمؑ اپنے والد کی وفات کے وقت مدینہ میں تھے۔ اس کے بعد مامون نے آپؑ کو بغداد میں بلایا جو اس زمانے میں خلافت کا مرکز یا دارالخلافہ تھا۔ ظاہری طور پر آپؑ کے ساتھ بہت زیادہ شفقت اور محبت روا رکھی گئی، یہاں تک کہ خلیفہ نے اپنی بیٹی کا نکاح بھی آپؑ سے کر دیا اور بغداد میں ٹھہرا لیا۔ درحقیقت مامون یہ چاہتا تھا کہ اس ذریعے سے امامؑ کو گھر کے اندر اور گھر کے باہر نظر بند رکھے تاکہ آپؑ پر پورا کنٹرول کر سکے۔

ایک عرصہ تک امامؑ بغداد میں تشریف فرما رہے، پھر مامون کی اجازت سے مدینہ چلے گئے اور مامون کے آخری عہد تک مدینہ میں ہی قیام پذیر رہے۔ مامون کی وفات پر معتصم باللہ نے عنانِ حکومت سنبھالی تو امام نہمؑ کو دوبارہ مدینہ سے بغداد بلایا گیا۔ اس کے بعد ان پر پابندی عائد کر دی گئی اور آخرکار جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے معتصم باللہ کے حکم یا اشارے سے امام علیہ السلام کی بیوی کے ذریعے آپؑ کو زہر دلوا کر شہید کر دیا گیا۔ (ارشاد مفید، ص ۲۹۷۔ اصول کافی، جلد ا، ص ۴۹۲ - ۴۹۷۔ دلائل الامامت، ص ۲۰۱-۲۰۹۔ مناقب ابن شہر آشوب، جلد ۴، ص ۳۷۹-۳۹۹۔ فصول المہمہ، ص ۲۴۷-۲۵۸۔ تذکرۃ الخواص، ص ۳۵۸)

امام دہم علیہ السلام

حضرت امام علی بن محمد علیہ السلام (جن کا لقب نقی اور کہیں امام ہادی بھی ملتا ہے)

دسویں امامؑ ہیں۔ آپؑ امام نہم کے فرزند ہیں۔ ۲۱۲ھ کو مدینہ منورہ میں آپ کی ولادت ہوئی اور ۲۵۴ھ میں (شیعہ روایات کے مطابق عباسی خلیفہ معتز باللہ نے آپؑ کو زہر دلوا کر شہید کر دیا)۔ (اصول کافی، جلد۱، ص ۴۹۷-۵۰۲۔ ارشاد مفید، ص ۳۰۷۔ دلائل الامامت، ص ۲۱۶-۲۲۲۔ فصول المہمہ، ص ۲۵۹-۲۶۵۔ تذکرۃ الخواص، ص ۳۶۲۔ مناقب ابن شہر آشوب، جلد۴، ص ۴۰۱-۴۲۰)

دسویں امامؑ سات عباسی خلیفوں یعنی مامون، معتصم، واثق، متوکل، منتصر، مستعین اور معتز کے ہم عصر رہے۔ معتصم باللہ کے عہد خلافت ۲۲۰ھ میں جب ان کے والد ماجد امام نہمؑ کو بغداد میں زہر دے کر شہید کر دیا گیا تھا اس وقت آپؑ مدینہ منورہ میں تھے اور خدا کے حکم اور اپنے آباء و اجداد یعنی گزشتہ آئمہ علیہم السلام کے تعارف سے آپؑ امامت کے منصب پر فائز ہوئے اور اسلامی تعلیمات دینی شروع کیں، یہاں تک کہ عباسی خلیفہ متوکل کا زمانہ آیا۔

خلیفہ متوکل نے ۲۴۳ھ میں دشمنوں کی شکایت سن سن کر حکومت کے ایک اعلیٰ عہدیدار کو حکم دیا کہ دسویں امامؑ کو مدینہ سے سامرا منتقل کر دیا جائے۔ جو اس زمانے میں خلافت کا مرکز تھا۔ اس نے امامؑ کو ایک محبت بھرا خط لکھا جس میں آپؑ کی بہت زیادہ تعظیم و تکریم کی گئی تھی اور آپؑ سے تشریف لانے اور ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا گیا تھا۔ (ارشاد مفید، ص ۳۰۷-۳۱۳۔ اصول کافی، جلد۱، ص ۵۰۱۔ فصول المہمہ، ص ۲۶۱۔ تذکرۃ الخواص، ص ۳۵۹۔ مناقب ابن شہر آشوب، جلد۴، ص ۴۱۷۔ اثبات الوصیہ، ص ۱۷۶۔ تاریخ یعقوبی، جلد۳، ص ۲۱۷)

(جب آپؑ تشریف لے آئے تو) آپؑ کے سامرا میں داخل ہونے کے بعد ظاہری طور پر تو کوئی اقدام نہ کیا گیا لیکن آپؑ کی توہین اور ہتک کے اسباب فراہم کر دیئے گئے اور آپؑ کی توہین میں کوئی دقیقہ فروگزشت نہ کیا گیا۔ کئی بار آپ کو قتل

کی دھمکیاں دی گئیں اور خلیفہ کے حکم سے آپؑ کے گھر کی تلاشی بھی لی گئی۔

خلیفہ متوکل عباسی، خاندانِ رسالت کی دشمنی میں دوسرے خلفاء کے مقابلے میں بے مثال تھا۔ خصوصاً حضرت علیؑ کا سخت دشمن تھا اور آپ کی شان میں کھلم کھلا توہین آمیز الفاظ کہا کرتا تھا یا آپؑ کو گالیاں دیا کرتا تھا۔ اس نے ایک شخص کو مامور کیا ہوا تھا جو بھری محفل میں آپؑ کی نقلیں اُتارا کرتا تھا اور خلیفہ قہقہے لگا کر ہنسا کرتا تھا۔ ۲۳۷ھ میں اس کے حکم سے کربلا میں حضرت امام حسین علیہ السلام کا مقبرہ، گنبد اور آس پاس کے کئی مکانات کو مسمار کر کے زمین کے ساتھ یکساں کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس کے حکم سے امامؑ کے مقبرے پر پانی چھوڑا گیا۔ پھر اس نے حکم دیا کہ امامؑ کے مقبرہ کی جگہ پر ہل چلا کر کھیتی باڑی کی جائے تاکہ امامؑ کے مزار کی جگہ اور آپؑ کا نام بالکل مٹ جائیں۔ (مقاتل الطالبین، ص ۳۹۵-۳۹۶)

متوکل کے زمانے میں علوی سادات کے حالات رقت بار اور ناگفتہ بہ ہو چکے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی عورتوں کے پاس تن ڈھانپنے کے لیے کپڑے تک موجود نہ تھے اور بعض کے پاس صرف ایک بوسیدہ سی چادر ہوا کرتی جس کو اوڑھ کر وہ باری باری نماز ادا کیا کرتی تھیں۔ اس قسم کے دباؤ ان علوی خاندانوں پر بھی وارد ہوئے جو مصر میں قیام پذیر تھے۔ (مقاتل الطالبین، ص ۳۹۵-۳۹۶)

امام یازدہم علیہ السلام (گیارھویں امام)

امام حسن بن علی (عسکری) علیہ السلام دسویں امامؑ کے بیٹے ہیں۔ آپؑ کی ولادت ۲۳۲ھ میں ہوئی (بعض شیعہ روایات کے مطابق) عباسی خلیفہ معتمد باللہ نے زہر دے کر آپ کو شہید کروا دیا۔ (ارشاد مفید، ص ۳۱۵۔ دلائل الامامت، ص ۲۲۳۔ فصول المہمہ، ص ۲۶۶-۲۷۲۔ مناقب ابن شہر آشوب، جلد ۴، ص ۴۲۲۔ اصول کافی، جلد ۱، ص ۵۰۳)

گیارھویں امامؑ اپنے والد کی شہادت کے بعد خدا کے حکم اور گزشتہ ائمہ

طاہرینؑ کے تقرر سے امامت کے بلند منصب پر فائز ہوئے۔ آپؑ اپنی سات سالہ امامت کے دوران خلیفہ کی سختیوں اور ظلم وستم کے باعث تقیہ (یعنی جب بس نہ چلے تو جان کے خوف سے خاموشی اختیار کر لینا) کی حالت میں بڑی احتیاط سے قدم اُٹھاتے تھے۔ لہٰذا آپ عام لوگوں کو حتیٰ کہ شیعوں کو بھی اپنے پاس آنے کی اجازت نہیں دیتے تھے، سوائے ان خاص افراد کے جن کو آپؑ ذاتی طور سے جانتے تھے۔ اس طرح آپؑ زیادہ تر نظر بندی کی زندگی گزارتے رہے۔ (ارشاد مفید، ص ۳۲۴۔ اصولِ کافی، جلد۱، ص ۵۱۲۔ مناقب ابن شہر آشوب، جلد۴، ص ۴۲۹ - ۴۳۰)

ان تمام سختیوں اور دباؤ کا مقصد یہ تھا کہ سب سے پہلے تو اس زمانے میں شیعوں کی تعداد اور طاقت قابلِ توجہ حد تک پہنچ چکی تھی اور چونکہ شیعہ امامت کے قائل ہیں، یہ بات سب پر واضح اور روشن ہو چکی تھی اور شیعوں کے آئمہ بھی جانے پہچانے تھے، اسی لیے ہر خلیفہ، امامِ وقت کو زیادہ سے زیادہ زیرِ نظر اور زیرِ کنٹرول رکھتا تھا۔ اور جس طرح بھی ممکن ہوتا اپنے خفیہ منصوبوں کے ذریعے آئمہؑ کو ختم کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

دوسرے یہ کہ، خلیفہ کو معلوم ہو چکا تھا کہ شیعہ گیارھویں امامؑ کے بیٹے پر ایمان رکھتے ہیں اور گیارھویں امامؑ اور اسی طرح گزشتہ آئمہؑ کی احادیث سے پتا چلتا تھا کہ یہی فرزند امام مہدی موعودؑ ہوں گے جن کے بارے میں حدیثِ متواترہ کے ذریعہ خاص و عام نے اطلاع دی ہے اور ان کو بارھواں اور آخری امام مانتے ہیں۔[1]

اسی وجہ سے گیارھویں امام دوسرے تمام آئمہ علیہم السلام سے زیادہ خلیفہ کے زیرِ نظر تھے اور خلیفۂ وقت بھی پختہ ارادہ کر چکا تھا کہ جس طرح بھی ہو، شیعہ امامت کی

---

(1) دیکھئے کتاب صحیح ترمذی، جلد۹، باب ماجاء فی المھدی۔ صحیح ابی داؤد، جلد۲، کتاب المھدی۔ صحیح ابن ماجہ، جلد۲، باب الخروج المھدی۔ کتاب ینابیع المودت۔ کتاب البیان فی اخبار صحب الزمان تالیف محمد بن یوسف شافعی۔ کتاب نور الابصار۔ تالیف شبلنجی۔ کتاب مشکوٰۃ المصابیح، تالیف محمد بن عبداللہ خلیب۔ صواعق محرقہ، تالیف ابن حجر۔ اسعاف الراغبین، تالیف محمد الصبان۔ اثبات الھداۃ، تالیف محمد بن حسن حر عاملی۔ بحار الانوار، تالیف علامہ مجلسی، جلد۵۱-۵۲)

کہانی کو ختم کر دے اور اس دروازے کو ہمیشہ کے لیے بند کر دے۔

اس طرح جونہی گیارہویں امامؑ کی علالت کی خبر خلیفہ کو پہنچی تو اس نے فوراً آپؑ کے پاس طبیب اور حکیم بھیجے اور ساتھ ہی اپنے چند قابل اعتماد افراد کو آپؑ کے گھر میں متعین کر دیا جو قاضی تھے۔ وہ ہمیشہ آپؑ کے ساتھ ساتھ رہتے تھے، گھر کے اندر اور باہر کے حالات پر نظر رکھتے تھے۔ امام کی شہادت کے بعد بھی آپؑ کے خانہ مبارک کی تلاشی لی گئی اور دائیوں کے ذریعے آپؑ کی کنیزوں کا معائنہ کرایا گیا۔ دو سال تک خلیفہ کے گماشتے آپؑ کے بیٹے کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے رہے، یہاں تک کہ بالکل ناامید اور مایوس ہو گئے۔ (اصول کافی، جلد ۱، ص ۵۰۵۔ ارشاد مفید، ص ۳۱۹)

گیارہویں امام کو ان کی شہادت کے بعد ان کے گھر کے اندر شہر سامرا میں ان کے والد ماجد کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

یہ جان لینا چاہیے کہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام نے اپنی زندگی میں علماء، محدثین اور دانشوروں کے بہت زیادہ گروہوں کو زیور علم سے آراستہ کیا ہے کہ جن کی تعداد سینکڑوں اور ہزاروں تک پہنچتی ہے اور اس کتاب کے اختصار کے پیش نظر ہم نے ان کے ناموں، حالات اور کتابوں کی فہرستیں لکھنے کو نظر انداز کر دیا ہے تاکہ یہ کتاب مختصر رہے۔ (دیکھیے کتاب رجال کشی، رجال طوسی اور رجال کی دوسری مشہور کتابیں)

امام دوازدہم علیہ السلام (بارہویں امامؑ)

حضرت مہدی موعود علیہ السلام (جو عام طور پر امام زمان اور صاحب الزمان کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں) گیارہویں امامؑ کے فرزند ہیں اور ان کا نام بھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام پر یعنی "محمد" ہے۔ آپ کی ولادت ۲۵۵ھ میں سامرا میں ہوئی۔ ۲۶۰ھ یعنی اپنے والد ماجد کی شہادت تک ان کے زیر تربیت زندگی گزارتے رہے، لیکن لوگوں سے بالکل الگ اور ان کی نظروں سے پنہاں رہے۔ سوائے خاص

شیعوں کے کسی کو آپ کے بارے میں کوئی اطلاع نہ تھی اور نہ ہی کوئی ان سے ملاقات کر سکتا تھا۔

گیارہویں امام علیہ السلام کی شہادت کے بعد جب آپؑ امامت کے منصب پر فائز ہوئے تو آپ خدا کے حکم سے غائب ہو گئے اور اپنے نائبین کے سوا کسی کو نظر نہیں آتے تھے اور وہ بھی خاص حالات میں۔ (بحار الانوار، جلد ۵۱، ص ۳۴۲-۳۴۳، ۳۶۶۔ کتاب الغیبہ، تالیف محمد بن حسن طوسی، طبع دوم، ص ۲۱۴-۲۴۳۔ کتاب اثبات الہداۃ، جلد ۲، ص ۷۷۶)

خاص نائبین

حضرت امام مہدی علیہ السلام نے ایک مدت تک عثمان بن سعید عمری کو جو آپ کے دادا اور پھر آپ کے والد کے اصحاب میں سے تھے، ثقہ اور امین بھی تھے، اپنا نائب مقرر کیا۔ ان کے ذریعے شیعوں کے سوالات اور درخواستوں کے جواب دیا کرتے تھے۔

عثمان بن سعید کے بعد ان کے بیٹے محمد بن عثمان امام مہدی علیہ السلام کے نائب ہوئے اور ان کی وفات کے بعد ابوالقاسم حسین ابن روح نوبختی آپؑ کے نائب خاص کی حیثیت سے منصوب ہوئے۔ حسین بن روح کی وفات کے بعد علی بن محمد سمری کو امام مہدی علیہ السلام کی نیابت حاصل ہوئی۔

ابھی علی بن محمد سمری کی وفات میں چند دن رہتے تھے (جو ۳۲۹ھ میں فوت ہوئے) کہ امام مہدی علیہ السلام کی طرف سے ایک حکم نامہ جاری ہوا جس میں علی بن محمد سمری کو کہا گیا تھا کہ وہ چھے دن بعد فوت ہو جائیں گے اور اس کے بعد خاص نیابت کا عہدہ ختم ہو جائے گا اور غیبت کبریٰ شروع ہو جائے گی اور یہ غیبت کبریٰ اس دن تک جاری رہے گی جب اللہ تعالیٰ امام مہدی علیہ السلام کے دوبارہ ظہور کا اذن فرمائے

گا۔(بحارالانوار، جلد۵۱، ص۳۶۰-۳۶۱۔الغیبۃ، تالیف شیخ طوسی، ص۲۴۲)
اس حکم کے مطابق حضرت امام مہدی علیہ السلام کی غیبت دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہے:

① غیبتِ صغریٰ: غیبتِ صغریٰ ۲۶۰ھ سے شروع ہوئی اور ۳۲۹ھ تک جاری رہی۔اس غیبت کا عرصہ ۷۰ سال ہے۔

② غیبتِ کبریٰ: غیبتِ کبریٰ کا زمانہ ۳۲۹ھ سے شروع ہوا، اور جب تک خدا تعالیٰ چاہے گا یہ غیبت جاری رہے گی۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک حدیث میں فرماتے ہیں (جس پر تمام اسلامی فرقوں کو اتفاق ہے): "اگر دنیا کی زندگی ایک دن بھی باقی رہتی ہوگی تو بھی خداوند تعالیٰ اس دن کو اس قدر طویل کردے گا کہ امام مہدی علیہ السلام جو میرے بیٹے ہیں تشریف لائیں گے اور اس دنیا کو عدل و انصاف سے مالا مال کردیں گے، اگرچہ یہ دنیا ظلم وستم سے بھری ہوئی کیوں نہ ہو"۔[1]

امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کے بارے میں بحث (عام عقیدے کے مطابق)

ہم نے نبوت اور امامت کی بحث میں اشارہ کیا ہے کہ عام ہدایت کے قانون کے مطابق جو ہر قسم کی آفرینش اور کائنات میں جاری وساری ہے، بنی نوع انسان ضرورت کے لحاظ سے ایک ایسی طاقت رکھتے ہیں (وحی ونبوت کی طاقت) جو ان کو کمالِ انسانیت اور سعادت کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور ظاہر ہے کہ اگر یہ کمال وترقی اور سعادت جو انسان کے لیے امکان پذیر اور قابلِ وقوع نہ ہو تو اس کی طاقت اور

---

① مثال کے طور پر عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں: قال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: لو لم یبق من الدنیا الا یومٌ واحدٌ لطول اللہ ذٰلک الیوم حتی یبعث فیہ رجلًا من اُمّتی ومن اھل بیتی یواطی اسمہ اسمی یملأ الارض قسطا وعدلًا کما ملئت جورًا وظلمًا (فصول المہمہ، ص۲۷۱)۔

قوت منسوخ اور باطل ہو جائے گی، لیکن آفرینش اور فطرت میں منسوخی یا ابطال موجود ہی نہیں ہے۔

ایک اور بیان کے مطابق جب سے انسان اس دنیا میں سکونت اور قیام پذیر ہے، اسی دن سے اس کو ہمیشہ ایک ایسی اجتماعی زندگی کی آرزو اور خواہش رہی ہے جو حقیقی سعادت اور خوشحالی پر مبنی ہو اور اس سعادت تک پہنچنے کے لیے لگاتار کوشش میں مصروف ہے۔ اگر یہ آرزو اور خواہش یا اُمید پوری ہو، فی الحال ہوتی یا اس کا کوئی بیرونی وجود نہ ہوتا تو ہرگز انسان کے دل میں ایسی خواہش یا اُمید پیدا ہی نہ ہوتی۔ اور اگر آلاتِ تناسل نہ ہوتے تو جنسی یا نفسانی خواہش بھی پیدا نہ ہوتی۔

اس لحاظ سے ضرورت (جبر) کے مطابق اس دنیا کے مستقبل میں بھی وہ دن ضرور آئے گا، جس دن اس کی یہ آرزو پوری ہو جائے گی اور انسانی معاشرہ عدل و انصاف سے بھر جائے گا اور تمام بنی نوع انسان آپس میں پیار، محبت اور صلح و صفا سے زندگی بسر کریں گے اور اس دن ہر شخص فضیلت کے انتہائی درجے پر پہنچ جائے گا۔

البتہ ایسی حالت کا پیدا ہونا بھی خود انسان کے ہاتھ میں ہوگا۔ پھر ایسے معاشرے کا رہنما اور رہبر، انسانی دنیا کا نجات دہندہ اور دوسرے الفاظ میں ''امام مہدیؑ'' ہوگا۔

دنیا کے مختلف مذاہب، مثلاً ھنویت، یہودیت، عیسائیت، مجوسیت اور اسلام وغیرہ سب میں ایسے شخص کے بارے میں اشارے ملتے ہیں جو دنیا کو نجات دلائے گا اور ان تمام مذاہب میں اس شخص کی خوشخبری دی گئی ہے۔ اگرچہ ایسے شخص کے بارے میں اختلافِ نظر موجود ہے کہ وہ کون ہوگا، لیکن اسلام میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متفق علیہ احادیث وہ شخص: المهدی من ولدی یعنی مہدی موعودؑ میری اولاد (میری نسل) میں سے ہوگا، اس معنی کی طرف اشارہ ہے۔

امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کے بارے میں بحث (خاص عقیدے کے مطابق)

ان بے شمار احادیث کے علاوہ جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے خاص و عام ذرائع سے امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کے بارے میں ہم تک پہنچی ہیں کہ آپؑ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسل اور اولاد سے ہوں گے اور انسانی معاشرے کو حقیقی کمال و خوش بختی تک پہنچائیں گے اور اس معاشرے کو ایک معنوی زندگی عطا فرمائیں گے۔[1] بہت زیادہ دوسری احادیث و روایات بھی موجود ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ حضرت امام مہدی علیہ السلام، حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کے حقیقی فرزند ہیں[2]، جو پیدا ہوئے ہیں لیکن غیبت کبریٰ کے بعد ظاہر ہوں گے اور اس دنیا کو عدل و انصاف سے مالا مال کر دیں گے کیونکہ اس وقت یہ دنیا ظلم و جور سے بھری ہوئی ہوگی۔

---

① مثال کے طور پر: قال ابوجعفر علیه السلام: اذا قام قائمنا وضع الله یده علیٰ رؤس العباد فجمع به عقولهم و کملت به احلامهم (بحارالانوار، جلد۵۲، ص۳۶۸ و ۳۳۶)۔

قال ابوعبدالله علیه السلام: العلم سبعة وعشرون حرفاً فجمیع ما جاء ت به الرسل حرفان فلم یعرف الناس حتیٰ الیوم غیرالحرفین. فاذا قامقائمنا اخرج الخمسة والعشرین حرفاً فبثها فی الناس وضم الیهما الهرفین حتیٰ یبثها سبعة وعشرین حرفاً (بحارالانوار، جلد۵۲، ص۳۳۶)

② نمونے کے طور پر: قال علی بن موسیٰ الرضا علیه السلام فی حدیث (الی ان قال) الامام بعدی محمد ابنی وبعد محمد ابنه علی وبعد علی ابنه الحسن وبعد الحسن ابنه الحجة القائم المنتظر فی غیبته المطاع فی ظهوره لولم یبق من الدنیا الا یوم واحد لطول الله ذٰلك الیوم حتیٰ یخرج فیملاء الارض، عدلاً کما ملئت جوراً وامامتی فاخبار عن الوقت ولقد حدثنی ابی عن ابیه عن آبائه عن علی ان النبی قیل له یا رسول الله متیٰ یخرج القائم من ذریتك فقال: مثله مثل الساعة لا یجلیها لوقتها الا هو ثقلت فی السموات والارض لا یاتیکم الا بغتة (بحارالانوار، جلد۵۱، ص۱۵۴)

چند مسائل اور ان کے جوابات

شیعوں کے مخالفین یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس فرقے کے اعتقاد کے مطابق امام غائبؑ کی عمر اب تک بارہ سو سال (۱۲۰۰) ہونی چاہیے حالانکہ انسان کی عمر ہرگز اتنی طویل نہیں ہوتی؟

جواب: اس اعتراض کی بنیاد بعید از قیاس ہے کیونکہ اتنی طویل عمر بلکہ اس سے بھی طویل عمر بعید نہیں ہے، لیکن اگر کوئی شخص خصوصاً امام غائبؑ کے بارے میں پیغمبر اکرم ﷺ اور دوسرے ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے جو احادیث نقل ہوئی ہیں، ان کا مطالعہ کرے تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ یہ احادیث امام غائبؑ کی زندگی کو ایک معجزے کے طور پر بیان کرتی ہیں۔

البتہ معجزہ اور کرامت محال نہیں ہے، لیکن سائنس کے ذریعے بھی خارق العادۃ یعنی معجزے کی نفی نہیں کی جا سکتی۔ اس امر کو بھی نہیں ثابت کیا جا سکتا کہ وہ وجوہات اور اسباب وعلل جو دنیا میں کام کر رہے ہیں کیا صرف وہی ہیں جن کو ہم اپنی آنکھوں سے

صقر بن ابی دلف قال سمعت ابا جعفر محمد بن الرضاؑ یقول: الامام بعدی ابنی علی، امره امری وقوله قولی وطاعته طاعتی، والامام بعده ابنه الحسن، امره امر ابیه وقوله قول ابیه وطاعته طاعة ابیه، ثم سکت، فقلت له یابن رسول الله فمن الامام بعد الحسن، فبکی بکاء شدیداً ثم قال: ان من بعد الحسن ابنه القائم بالحق المنتظر (بحارالانوار، جلد ۵۱، ص ۱۵۸)

موسٰی بن جعفر البغدادی قال سمعت ابا محمد الحسن بن علی یقول: کأنی بکم وقد اختلفتم بعدی فی الخلف منی اما ان المقر بالائمة بعد رسول الله المنکر لولدی کمن اقر بجمیع انبیاء الله ورسله ثم انکر نبوة محمد رسول الله والمنکر لرسول الله کمن انکر جمیع الانبیاء لان طاعة آخرنا کطاعة اولنا والمنکر لاخرنا کالمنکر لاولنا اما ان لولدی غیبة یرتاب فیها الناس الا من عصمه الله (بحارالانوار، جلد ۵۱، ص ۱۶۰)

دیکھتے ہیں اور ان کو پہچانتے ہیں اور ایسے ہی دوسرے عناصر اور اسباب وعلل جن کے بارے میں ہمیں اطلاع نہیں ہے یا ان کے اثرات اور کاموں کو ہم دیکھ نہیں سکتے یا ان کو نہیں پہچانتے ہیں، وہ بالکل موجود ہی نہیں؟ اس لحاظ سے ممکن ہے کہ انسانوں میں سے ایک شخص یا چند اشخاص میں وہ عوامل، عناصر یا اسباب پیدا ہو جائیں کہ خدا کے حکم سے ان کی عمر ہزار سال یا چند ہزار سال تک پہنچ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس، ڈاکٹری یا علم حکمت ابھی تک وہ طریقہ ایجاد کرنے سے ناامید اور مایوس نہیں ہوئے جس کے ذریعے بہت طولانی عمریں انسانوں کو مل جائیں۔

یہ اعتراض خصوصاً مختلف مذاہب یہودیت، عیسائیت یا اسلام رکھنے والوں سے بہت تعجب کی بات ہے کیونکہ یہ سب لوگ خارق العادۃ یا خدا کے انبیاءؑ کے معجزوں پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کو مانتے ہیں۔

شیعوں کے مخالفین کو اعتراض ہے کہ شیعہ، امام کو دینی احکام وحقائق بیان کرنے اور عوام کی رہنمائی کے لیے ضروری خیال کرتے اور امام کی غیبت اس امر کے خلاف اور متضاد ہے کیونکہ وہ امام جو غائب ہو چکا ہے اور لوگوں کو اس تک رسائی نہیں ہو سکتی، اس کے ہونے کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہے۔ اور اگر خداوند کریم چاہے کہ دنیا کی اصلاح کے لیے کوئی امام پیدا کرے تو اس بات پر قادر ہے کہ جب اور جس وقت چاہے اور جب امام کی ضرورت ہو، اس کو پیدا کر دے، اس لیے چند ہزار سال وقت سے پہلے اس کے پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

جواب: ایسے لوگوں کو امامت کے معنی اور اس کی حقیقت معلوم ہی نہیں ہے کیونکہ امامت کے بارے میں بحث کے دوران واضح ہو گیا ہے کہ امام کا فرض صرف یہی نہیں کہ صوری اور ظاہری رہنمائی کرے بلکہ جیسا کہ امام کے ذمے لوگوں کی ظاہری رہنمائی ہے، اسی طرح باطنی ولایت اور راہبری کا بھی ذمہ دار ہوتا ہے اور وہی لوگوں

کی معنوی زندگی کو منظم اور مرتب کرتا ہے اور اعمال کے حقائق کو خدا کی طرف سے لوگوں کے لیے لاتا ہے اور پھر واپس خدا کی طرف پہنچاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ امام کی جسمانی غیبت یا حاضری کا کوئی اثر نہیں ہوگا اور امام، باطن کے ذریعے لوگوں کے دلوں اور روحوں میں اثر کرتا ہے۔ اگرچہ امام ظاہری طور پر جسمانی حیثیت سے پوشیدہ ہیں لیکن ان کا ہونا ہمیشہ ضروری ہے۔ اگرچہ ان کے ظاہر ہونے اور ان کے ذریعے دنیا کی اصلاح کی ابھی تک نوبت نہیں آئی۔

خاتمہ۔شیعوں کا معنوی پیغام

اہل دنیا کو شیعوں کا معنوی پیغام ایک فقرے سے زیادہ نہیں ہے اور وہ یہ ہے: "خدا کو پہچاننے اور خدا شناسی کا ایسا طریقہ اختیار کریں تا کہ سعادت مند ہو کر نجات پا جائیں"۔

اور یہی وہ فقرہ ہے کہ رسول خداﷺ نے اپنی عالمی دعوت کو پہلی بار اسی فقرے سے شروع کیا تھا:

"اے لوگو! خدا کو ایک جانو اور اس کا اقرار کرلو (سچے دل سے اس پر ایمان لے آؤ) تا کہ نجات پا جاؤ"۔

اس بیان کی وضاحت میں ہم اجمالی طور پر کہتے ہیں کہ ہم اپنی فطرت کے مطابق اس دنیا میں بہت زیادہ دنیاوی لذتوں اور مادی مقاصد کے دلدادہ ہیں یعنی بہترین اشیائے خوردنی اور نوشیدنی، اچھے اچھے لباس، رہنے کے لیے محلات، دیکھنے کے لیے خوبصورت مناظر، خوبصورت اور دل نواز بیوی، اچھے اور مہربان دوست، بہت زیادہ دولت، طاقت اور سیاست کے ذریعے بلند مرتبے اور جاہ و مقام اور حکومت وغیرہ حاصل کرنا اور اپنے عقائد و نظریات کے خلاف ہر چیز کو ختم کر دینا وغیرہ۔ دنیا میں ہم ایسے کام چاہتے ہیں۔

لیکن ہم اپنی خداداد سرشت کے ساتھ سمجھ جاتے ہیں کہ یہ تمام لذتیں انسان کے لیے پیدا کی گئی ہیں نہ کہ انسان ان کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور یہ کہ یہ سب چیزیں انسان کے پیچھے ہونی چاہییں نہ کہ انسان ان کے پیچھے بھاگتا پھرے۔

پیٹ یا پیٹ کا نچلا حصہ زندگی کا انتہائی مقصد ہونا، گائے بھیڑ جیسے جانوروں کی منطق ہے اور اسی طرح چیرنا پھاڑنا اور دوسروں کو تکلیف دینا، شیر، بھیڑیے، لومڑی اور اسی قسم کے درندوں کی منطق ہے۔ انسان کی منطق فطری عقل کی منطق ہے اور بس!

عقل کی منطق اپنی حقیقت بینی کے ساتھ ہمیں حق وحقیقت کا پیروکار ہونے کی طرف ہدایت کرتی ہے نہ کہ اپنی دل پسند ہر قسم کی شہوت رانی، تکبر اور خودغرضی وغیرہ کی طرف۔ عقل کی منطق انسان کو خدائی فطرت کا حصہ جانتی ہے جس میں مکمل آزادی اور مرضی موجود نہیں ہے۔ برخلاف اس کے کہ انسان اپنے آپ کو اس دنیا و کائنات کا فرماں روا اور حاکم سمجھ بیٹھا ہے اور چاہتا ہے کہ اس سرکش فطرت کو اپنی مرضی کے مطابق مطیع کر لے اور اس پر فتح حاصل کر لے۔ وہ خود بھی اس فطرت کے ہاتھ میں کھلونا بن کر اس کا فرماں بردار ہو گیا ہے۔

عقل کی منطق انسان کو دعوت دیتی ہے کہ اس جہانِ فانی کی زندگی سے جو کچھ سمجھ سکا ہے اس پر غور کرے، یہ کہ کائنات کا نظامِ ہستی اور جو کچھ اس کے اندر موجود ہے وہ خود بخود پیدا نہیں ہوا ہے بلکہ اس کی بنیاد ایک لامتناہی منبع ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ کائنات میں ہر قسم کی خوبصورت یا بدصورت موجودات خواہ زمین پر ہو یا آسمان پر ہو، یا انسان کی آنکھوں کے سامنے ایک مستقل حقیقت کی صورت میں جلوہ گر ہو۔ ایک دوسری حقیقت کی پناہ میں قائم ہے (یعنی ایک دوسری حقیقت کے ساتھ جو مستقل اور ہمیشگی ہے، اس کی موجودیت وابستہ ہے) اور اسی کے زیرِ اثر پیدا اور آشکار

ہوئی ہے، نہ کہ خود بخود اور نہ ہی یہ وجود اس کا اپنا وجود ہے۔ اور جیسا کہ گزشتہ تمام حقیقتیں، طاقتیں اور عظمتیں جو کہ آج ایک افسانہ معلوم ہوتی ہیں، موجودہ حقیقتیں بھی مستقبل میں افسانہ معلوم ہوں گی اور آخرکار ہر چیز ایک افسانے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔

صرف خدا کی ذات ہی ہے جس کو زوال نہیں ہے اور کائنات کی سب چیزیں اسی کی ذات کے زیرسایہ زندگی اور حیات رکھتی ہیں اور اسی کی ذات کی روشنی میں روشن اور پیدا ہوتی ہیں۔

جب انسان کے اندر یہ ادراک پختہ ہو جائے تو اس وقت اس کی آنکھوں کے سامنے زندگی کا خیمہ پانی کے ایک بلبلے کی طرح بیٹھ جاتا ہے اور وہ اپنے سامنے مشاہدہ کرتا ہے کہ جہان اور اہل جہان ایک لامتناہی اور لازوال ہستی اور ایسے ہی لازوال زندگی، طاقت، علم اور کمال پر تکیہ کرتے ہیں اور جہان یا کائنات کا ہر مظہر اس کے لیے ایسا دریچہ ہے کہ جس میں سے ہر مظہر اپنے اپنے اندازے کے مطابق اپنی حقیقت کو نمایاں کرتا ہے جو ابدی دنیا ہے۔

اس وقت انسان اپنی حقیقت اور اپنی آزادی یا ہر چیز کی حقیقت کو اس کے اصلی مالک سے منسوب کرتا ہے اور دنیا کی تمام چیزوں سے دل ہٹا کر صرف خدائے یکتا کے ساتھ مل کر جاتا ہے اور اس (خدا) کی عظمت وشوکت کے مقابلے میں کسی اور چیز کے سامنے اپنا سر خم نہیں کرتا۔

اس وقت اپنے پاک پروردگار کی سرپرستی اور ولایت کے دائرے میں آجاتا ہے، اس وقت جس چیز کو بھی پہچانتا ہے، خدا کی ذات کے ذریعے سے پہچانتا ہے اور خدا کی رہبری وہدایت کے ساتھ پاک اخلاق اور نیک اعمال (کیونکہ دین اسلام کے معنی ہیں حق کے ساتھ سر تسلیم خم کرنا جو آئین فطرت ہے) سے مزین ہو جاتا ہے۔

یہ ہے کمال انسانیت اور انسان کامل کا آخری مقام اور درجہ، یعنی امام جو کہ خدا کی عنایت اور مہربانی سے اس مقام پر پہنچا ہوا ہوتا ہے اور جو لوگ علم و اخلاق سیکھ کر اس مقام پر پہنچتے ہیں، اپنے اختلاف درجات کے باوجود امام کے حقیقی پیرو ہوتے ہیں۔

یہاں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خدا شناسی اور امام شناسی ہرگز ایک دوسرے سے الگ اور جدا نہیں ہیں جیسا کہ خدا شناسی کو خودشناسی (خودی، یعنی اپنے آپ کو پہچاننے) سے جدا نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جو شخص اپنی زندگی، اپنی حقیقت اور اپنی ذات کو پہچان لے وہ خدائے وحدہٗ لاشریک کی حقیقی ذات کو پہچان لیتا ہے، یعنی:

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ۔



ناشر: موسسہ مطالعات و تحقیقات فرہنگی
خیابان سید جمال الدین اسد آبادی تہران
جمہوری اسلامی ایران